جلد نمبر ۱۵۵   جولائی ۱۹۹۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپے سالانہ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

جلد ۱۲۸ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۱ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

گذشتہ شذرات میں چودہ سو سال ہجری میں مسلمانوں کی جو بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں ان کے بعض جلیل القدر حکمرانوں کا ذکر کیا گیا تھا، ذرا دولت عثمانیہ کے قابل فخر فرماں رواؤں کے بھی تھوڑے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

دولت عثمانیہ چھ سو برس سے زیادہ یورپ، ایشیا اور افریقہ پر اپنا پرچم لہراتی رہی، اس کا انتہائی عروج اس وقت ہوا جب اس میں جزائر سائپرس اور کریٹ کے علاوہ بحر کیسپین سے بحر روم پھر یہاں سے بصرہ، مصر و شام اور عدن کی پہاڑی سے عرب کے جنوبی ساحل تک کے علاقے اس کے زیر نگیں رہے، بحر ہند اور بحر احمر پر بھی اس کا قبضہ رہا۔ تاریخ میں تین امپائر یاد کیے جاتے ہیں، رومن امپائر، ٹرکش امپائر اور برٹش امپائر۔ ٹرکش امپائر کا فرماں روا سلیمان اعظم فخر کرتا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا، تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے، یورپ کی سلطنتیں اس کے نام سے لرزتی تھیں، وہ قوی ہیکل دیو سمجھا جاتا۔ فرانس کا حکمراں فرانسس اس سے معاہدہ کرکے جرمنی کے خلاف فوجی امداد کے علاوہ دس لاکھ اشرفیوں کی مالی اعانت کا بھی طلبگار ہوا، اس معاہدہ کو ایک فرانسیسی مورخ ایلن نے "رعایت سلطانی" سے تعبیر کیا، سلیم ثالث کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں شامل رہیں، فرانسیسی مورخ ولاڈون کیمز کے بقول ترک تین چوتھائی دنیا کے مالک تھے، اور سترہویں صدی عیسوی تک ترکی یورپ کی سب سے زبردست طاقت تھی ترکی کی فوج کی بہادری کی دھوم رہی، اسٹینلی لین پول نے اعتراف کیا ہے کہ بہادری تو ترکوں کی

وراثت تھی، وہ شیروں کی طرح لڑتے، مذکورہ فرانسیسی مورخ کا بیان ہے کہ ترک سپاہی میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اعلیٰ درجہ کے سپاہی میں ہونی چاہئیں، یہ بہادر، سلیم الطبع اور قناعت پسند ہوتے، ان میں تکان سے بھری ہوئی تکلیفوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہوتی، احکام کی تعمیل بلاچون وچرا کرتے، ان کو تعلیم یافتہ اور خوددار افسر مل جاتے تو اپنے کارناموں سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیتے، ان کے سامنے عیسائیوں کی تمام بغاوتیں اس وقت تک ہیچ رہتیں جب تک ان کو خارجی امداد نہ مل جاتی۔ ان فوجوں کی کارکردگی کی وجہ سے ترک بڑی سے بڑی قوتوں سے ٹکر لیتے رہے، ۱۴۵۳ء میں انھوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے صدیوں کے دیرینہ رومن امپائر کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا، فرانسیسی مورخ ولاڈرن کیٹری کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت وہاں کی آبادی یہ نعرے لگارہی تھی کہ لاطینیوں سے ترک بہتر ہیں، ترکوں نے اپنی ظفریاب فوجوں کی بدولت بلغاریہ، مقدونیہ، سرویہ، سلیشیا، یونان، سالونیکا، موریا، بلغراد، بوسینا، کریمیا، ولاچیا، البانیہ، ہرزہ گووینیا، اڈریا ٹک، ہنگری، جزائر ایجین، ویانا، اسٹریا، شام اور مصر وغیرہ کو فتح کرکے ٹرکش امپائر کی سرحدوں کو وسعت دی، سلیمان اعظم کے زمانہ میں ہنگری سے لڑائی ہوئی تو یورپین مورخین کے بیان کے مطابق اہل ہنگری کے دو لاکھ آدمی ہلاک ہوئے تو ترکوں کے کل ڈیڑھ سو ۱۵۰ فوجی کام آئے، سلیم ثالث نے اسی فوج کے سہارے مصر کے معاملہ میں نپولین سے ٹکر لی، اور اس سے مصر پر اپنی فرماں روائی تسلیم کرائی، سلطان عبدالحمید خان ثانی کے زمانہ میں عثمان پاشا نے پلونا کی جنگ میں روسیوں کی ایک لاکھ تیس ہزار ۱۳۰۰۰۰ فوج کا مقابلہ اپنے تینتیس ہزار ۳۳۰۰۰ سپاہیوں کے ساتھ کیا تو اپنی جان بازی کا جوہر دکھا کر روسیوں کے پچاس ہزار ۵۰۰۰۰ لشکریوں کو موت کے منہ میں ڈھکیل دیا، وہ فتح تو حاصل نہ کرسکا مگر دوست اور دشمن دونوں کی طرف سے شیر پلونا کا خطاب پایا۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے درۂ دانیال اور گیلی پولی میں انگلستان اور فرانس کی مشترکہ

فوجوں کا مقابلہ جس طرح کیا وہ رزمیہ تاریخ کا ایک افسانہ بن گیا ہے، فروری ۱۹۱۵ء میں فرانس اور برطانیہ درۂ دانیال میں داخل ہوکر قسطنطنیہ پہونچنا چاہتے تھے کہ اس پر قبضہ کرکے ترکی کا خاتمہ کردیں، ترک اس بہادری سے لڑے کہ اتحادیوں کے تقریباً پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) سپاہی ہلاک ہوئے، ان کے جنگی جہازوں کی ایک بڑی تعداد غرقاب ہوگئی، اتحادیوں نے اس بحری حملہ میں شکست کھاکر گیلی پولی پر یورش کردی جس میں اسٹریلیا اور اٹلی کی فوجیں بھی شریک ہوگئیں، وہ آبنائے گیلی پولی کے یوروپی اور ایشیائی ساحلوں پر اُتر تو ضرور گئیں، لیکن ترکوں کی بہادری سے ان کے چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) آدمی مارے گئے، اور جب وہ آخری بار گیلی پولی پر حملہ آور ہوئے تو اس کی مدافعت میں مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی سپہگری کا پورا جوہر دکھایا، دشمن کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار (۱۱۲۰۰۰) تھی، اسی معرکہ سے مصطفیٰ کمال کی دھوم تمام دنیا میں ہوئی، یہ جنگ اُس وقت لڑی گئی جب یورپ کے عیسائی ترکی کو مرد بیمار کہتے تھے، مگر اسی مرد بیمار کی جب صحیح رہنمائی ہوئی تو اس نے اپنے فوجی کارنامے سے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

دولت عثمانیہ کے زیادہ تر فرماں روا اپنی بشری کمزوریوں کے باوجود اچھے اور لائق ثابت ہوئے، اس سلطنت کے بانی عثمان خان اول کے متعلق اسٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ وہ اپنی سادگی میں خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرتا تھا، وہ اپنے گوناگوں اوصاف کے لیے ایسا مشہور رہا کہ اس کی تلوار محفوظ رکھی گئی جو اس حکومت کے ہر نئے حکمراں کی کمر میں یہ دعا مانگ کر باندھی جاتی کہ خدا اس میں عثمان ہی جیسی خوبیاں پیدا کرے، وہ جب مرا تو اس کے مکان میں صرف ایک قلعہ، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمکدان، چند گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑی بیل، بھیڑوں کے کچھ گلے، علم اور اسلحہ کے علاوہ کوئی اور قیمتی چیز نہ تھی۔

مراد اول نے تیس (۳۰) سال تک حکومت کی، اس کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں گذرا، اس کی ناقابل تسخیر فوجوں کی وجہ سے یورپ کی نہایت طاقتور سلافی قومیں اس کے زیرنگیں ہوگئیں، ہر جگہ فتح

لکھتا ہے کہ تیس[۳۰] سال تک اس نے عیسائیوں کی سیادت ایسے سیاسی تدبر کے ساتھ کی کہ اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت حاصل نہ کر سکا، اس کی فتوحات پانچ صدیوں تک قائم رہیں، اس کے عہد میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی بدسلوکی کی کوئی شکایت یونانی کلیسا کے بطریق کے دفتر میں درج نہیں۔

محمد اول اپنے تدبر اور نظم و نسق کی صلاحیت کے علاوہ اپنی سپہگری میں بھی اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں تھا، بے حد کشادہ دل تھا، اپنی عیسائی رعایا کے لیے کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھتا، وہ شریف محمد کے نام سے مشہور رہا، اس کے بعد کے سلطان مراد ثانی کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ اس کے عدل اور بردباری کی تصدیق اس کے طرزِ عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے جن کا خیال تھا کہ اس کے عہد کی خوشحالی اور اس کی پرسکون موت اس کے غیر معمولی انصاف کا صلہ تھی، لین پول تو یہاں تک لکھ گیا ہے کہ اس کے احترام میں عیسائیوں کے کلیسا جھکے رہے۔

محمد ثانی قسطنطنیہ کا فاتح بن کر اس کا حکمراں ہوا تو فرانسیسی مورخ ولاردن گیبز کا بیان ہے کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعہ تمام رومیوں کو وہاں واپس آنے کی دعوت دی، ان کی مذہبی آزادی کا یقین دلایا، ان کے لیے ایک نیا بطریق مقرر ہوا، تو جب اس کے سر پر کلیسائی تاج رکھا گیا تو سلطان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: تم بطریق ہو، خدا تمھاری حفاظت کرے، ہر حال میں مجھے اپنا دوست سمجھتے رہو اور ان تمام حقوق سے بہرہ اندوز ہو جو تمھارے اسلاف کو حاصل تھے، لارڈ ایورسلے نے تسلیم کیا ہے کہ محمد کی عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی حکومتوں کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اس نے یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی، لین پول نے لکھا ہے کہ محمد ثانی قسطنطنیہ کی فتح کے بعد روم کی طرف بڑھتا، مگر اس کی موت سے یورپ بچ گیا۔

بایزید ثانی کو لوگ صوفی کہتے، اس لیے کہ وہ نہایت سادہ مزاج اور پابند شرع تھا، لیکن

میدان جنگ پہونچ کر صرف ایک مجاہد ہی کی سپہگری کا جوہر دکھاتا، سلیم اول اپنے رشتہ داروں کے لیے ظالم ضرور تھا، مگر اس کا یہ ظلم اس کی رعایا کے لیے سودمند ہوتا، لین پول نے لکھا ہے کہ اس نے صرف نو سال تک حکومت کی لیکن اس نے اپنے امپائر کی حدود کو دوگنا کر دیا، بری جنگ میں ترک ناقابل شکست سمجھے جاتے، سلطان سلیم کی کوشش رہی کہ وہ بحری جنگ میں بھی یہی کارنامے دکھائیں، اس نے فلپ ثانی بن کر اپنے پیچھے ایک الکزنڈر چھوڑا، اس کا لڑکا اپنے زمانہ کا سکندر اعظم ہی تھا، وہ خادم الحرمین الشریفین بھی تھا اور اسی کے نام سے خطبہ پڑھا جانے لگا، جو دولت عثمانیہ کے آخری فرمانروا تک جاری رہا۔

سلیم اول کا لڑکا سلیمان اعظم ایک کامیاب مدبر اور فرمانروا کی حیثیت سے اپنے تمام پیش روؤں سے بڑھ گیا، اپنی فتوحات میں بھی سب پر فوقیت لے گیا، اس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی انتہائی حد تک پہونچ گئی تھی، اس کی خانگی زندگی بھی بے داغ رہی، وان ہیمر لکھتا ہے کہ اسلامی قانون کا پابند ہونے کے باوجود اس میں رواداری تھی، کفایت شعاری کے باوجود اس میں دبدبہ اور کروفر تھا، ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ قرآن کی یہ دو آیتیں اس کا دستور العمل رہیں: اللہ انصاف اور مہربانی کا حکم دیتا ہے، انصاف سے لوگوں کا فیصلہ کرو، اور اپنی خواہش کی اتباع نہ کرو، اس نے اپنی حکومت کے تمام قوانین میں ایسی باضابطگی پیدا کر دی تھی کہ وہ سلیمان قانونی بھی کہلاتا۔

سلیمان اعظم نے اپنی سلطنت کو جس عروج کمال تک پہونچا دیا تھا، اس کو سنبھالنے کے لیے برابر اسی کے پایہ کے فرمانروا ہونے کی ضرورت تھی، جو ممکن نہ تھا، کسی حکومت میں بھی ایسی مثال نہیں ملتی، اسی لیے اس کے کمال کے بعد زوال کا شروع ہوجانا یقینی ہوتا ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں بھی یہی ہوا کیا، بنو امیہ اور بنو عباس کے علاوہ اندلس اور ہندوستان میں جب ان کی حکومتیں انتہائی عروج کو پہونچیں تو اسی کے بعد سے ان کا زوال شروع ہوگیا۔

سلیمان اعظم کے بعد دولت عثمانیہ کے بائیس ۲۲ اور سلاطین ہوئے جن میں کچھ اچھے اور کچھ برے بھی تھے مگر ان میں ان کے پیش روؤں کی بیدار مغزی اور اولوالعزمی نہیں رہی، اس کے علاوہ وہ شروع سے یورپ کے عیسائیوں کے جسم میں خار بن کر چبھتے رہے، عیسائیت اپنی فرسودگی اور کہنگی کی وجہ سے عیسائی حکومتوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی اس لیے عیسائی حکومتوں نے مذہب اور سیاست کو علیحدہ کر دیا تھا، اسلام میں توحید، رسالت، ایمان، برادری اور اخلاق کی جو عملی تعلیمات ہیں، عیسائی بظاہر اس کے ناقد اور نکتہ چیں رہے، لیکن ان کا خیال رہا کہ یہ یورپ میں موثر طور پر پیش ہوتی رہیں تو یہ عیسائیت اور عیسائی حکومتوں پر ضرب کاری لگاتی رہیں گی، انھوں نے اسی جذبے سے صقلیہ اور اندلس کی مسلمان حکومتوں کو ختم کیا، دولت عثمانیہ کی ابھرتی ہوئی قوت بھی ان کے دلوں کی دھڑکنیں بڑھاتی رہی، ایسا بھی وقت آیا کہ یورپ کے توازن کی مالک دولت عثمانیہ بن گئی، پھر ترکوں کا تمدن تو یورپ پر حاوی ہوتا گیا، ایک انگریز مورخ گیسٹن گیلارڈ نے اپنی کتاب "دی ٹرکس اینڈ یورپ" میں لکھا ہے کہ یورپ اپنے آرٹ میں ٹرکش امپائر کے مشرقی باشندوں ہی سے استفادہ کرتا، اٹھارہویں صدی کے آخر تک جو چیز ترکوں کی ہوتی وہی فیشن میں داخل ہو جاتی، حتیٰ کہ موسیقی اور مصوری میں بھی ترکوں ہی کا اسٹائل پسند کیا جاتا، ان کے لباس کی وضع قطع اور شان و شوکت کی بھی نقالی کی جاتی، ترکوں کی ہر چیز فیشن بنتی جا رہی تھی۔

یورپ کے عیسائی اسلام کے پیروؤں کی یہ برتری اور فوقیت کیسے گوارا کرتے، مذہبی اور تمدنی دونوں حیثیت سے ان کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے رہے، اس لیے یورپ میں ان کی حکومت جب کبھی کمزور پڑی، کبھی روس کبھی برطانیہ، فرانس اور روس مل کر، کبھی پولینڈ، کبھی ہنگری اور کبھی آسٹریا نے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی، ٹرکش امپائر کی عیسائی رعایا غداری کر کے ان کی معاون ہو جاتی، بہادر ترک اپنے سے زیادہ طاقتور حریفوں کا مقابلہ تین سو ۳۰۰ سال تک کرتے رہے، لین پول نے اپنی کتاب "ٹرکی" میں ۱۸۸۸ء میں لکھا تھا کہ انیسویں صدی میں ترکوں کو شکستیں ضرور ہوئیں لیکن وہ صحیح معنوں میں شکستوں سے دوچار نہیں ہوئے، ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۲ء تک وہ روسیوں سے لڑتے رہے، اس جنگ میں ان کو تھوڑی سی ہزیمت اٹھانی پڑی، ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۸ء تک وہ یونانیوں سے لڑتے

ان کے یہاں اندرونی فوجی بغاوت کرادی گئی تو اس جنگ میں وہ کچھ ضرور دبے لیکن پھر بھی اس وقت تک یہ سرپیکار رہے جب تک کہ تین بڑی طاقتوں نے مل کر ان کو پسپا کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کر لیا، ۱۸۲۸-۲۹ء میں وہ روس سے پھر معرکہ آرا ہوئے لیکن محمود کو غلط اطلاعات کی بنا پر سپر ڈالنا پڑا، کریمیا کی جنگ میں ترکوں نے روسیوں کو سلسٹریا سے مار بھگایا، لیکن اتحادی روس کی مدد کو پہونچ گئے تو ان کو پسپا ہونا پڑا، اس کے بعد بھی ان کی جنگ روس سے ہوئی لیکن روسی ان پر اپنی توپ اور تفنگ سے غالب نہیں آئے بلکہ رشوتیں دے کر جنگ جیتی، اگر ترک سپاہیوں کو اچھے افسر اور اچھے اسلحے ملتے رہیں تو اب بھی وہ روسیوں کے ٹڈی دل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو جرمنی کے ساتھ شکست ضرور ہوئی لیکن گیسٹن گیلارڈ نے ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا کہ جب اس نے سولہ لاکھ (۱۶۰۰۰۰۰) سپاہیوں کے ساتھ جرمنی کا ساتھ دیا تو اتحادی طاقتیں انتہائی پریشانی میں مبتلا ہو گئیں، روس کی ناکہ بندی ہو گئی تو زار فرڈیننڈ سربیا پر حملہ آور ہو گیا، رومانیہ چاروں طرف سے گھر گیا تو بخارسٹ کا صلح نامہ کرنا پڑا، جرمنی کی فوجیں ترکوں کی مدد سے ایک طرف افغانستان اور دوسری طرف نہر سویز تک پہونچ گئیں، اسی مصنف نے یہ بھی لکھا کہ جنگ کے بعد اتحادیوں نے ترکوں کو سخت سے سخت سزا ضرور دی، لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ اب ترکوں کا کوئی مستقبل نہیں، اور یہ یورپ میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتے، خود ترک سوچیں کہ وہ یہ اہم کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ ان کی شاندار اسلامی تاریخ ان کے سامنے ہے جو ان کو یہ سبق دے سکتی ہے کہ

ع وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر

اگر وہ اپنے اسلاف ہی کی طرح مسلمان بن کر رموز حکمرانی کو عمل میں لائیں تو یقین ہے کہ یورپ کا ہر یہودی اور عیسائی بچہ اپنی زبان حال سے یہ کہتا نظر آئے۔

ع ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۴)

جگر کے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" پر سید صاحب کے تعارف اور اس پر شاہ صاحبؒ کے طویل مضمون کے بعد جگر مجسم نیاز بن کر دارالمصنفین آتے رہے، راقم جنوری ۱۹۳۵ء میں یہاں آیا تو جگر کی صحبتوں سے محظوظ ہونے کا برابر موقع ملا، مجھ کو پہلی دفعہ ان کے دیدار کا جو شرف حاصل ہوا اس کو یہاں پر درج کرنے کو جی چاہتا ہے، جگر کی گوناگوں دلآویزیاں ایسی ہیں کہ قلم بے تحاشہ ہو کر اگر اصل موضوع سے ہٹ جائے تو اس قلمی بے راہ روی کی حظ اندوزی میں بھی خاص کیفیت ہے۔

جون ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا، میں مسلم یونیورسٹی داخلہ کے لیے گیا تھا حضرت سید صاحبؒ کے ایک خط پر جناب رشید احمد صدیقی (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی) نے اپنے یہاں ٹھہرا لیا تھا، جون کی ایک دوپہر میں ان کے باہری کمرہ میں لیٹا ہوا تھا کہ یکایک ایک صاحب جھومتے جھامتے کمرے میں داخل ہوئے، سر کے بڑے بڑے بال الجھے ہوئے تھے، داڑھی بکھری ہوئی تھی، کرتا پیک سے آلودہ تھا کریبد کھلا ہوا تھا، پائجامہ کی ایک موہری گھٹنے تک اٹھی ہوئی تھی، منہ سے شراب کی بو آرہی تھی، میری چارپائی کے

پاس پہونچ کر پوچھا: رشید احمد صدیقی کہاں ہیں؟ میں نے ابھی کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ بغل والے ڈرائنگ روم میں جاکر دھڑام سے گر گئے، اسی طرح پڑے ہوئے تھے کہ کچھ طلبہ یہ پوچھتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے کہ جگر صاحب تو یہاں نہیں آئے ہیں؟ میں نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا، معلوم ہوا کہ یہی ہندوستان کے مشہور غزل گو شاعر جناب جگر مرادآبادی ہیں، اس حالت میں ان کو دیکھ کر دکھ ہوا، جناب رشید احمد صدیقی ان سے ملنے کے لیے باہر نہیں نکلے، طلبہ ایک لاش کی طرح ان کو وہاں سے لے گئے، اسی رات کو شہر میں یونیورسٹی کے ڈے اسکالرز کی طرف سے مشاعرہ تھا، جناب اختر امام صاحب اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے عربی کے طالب علم تھے، عربی میں ایم۔ اے کر کے جرمنی گئے، اور جہاں یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، وہاں سے آکر سیلون یونیورسٹی میں عربی کے استاذ مقرر ہوئے، پھر وہیں عربی اور اسلامیات کے شعبوں کے صدر بھی ہوگئے، عراق، ایران، پاکستان اور روس کی بین الاقوامی علمی کانفرنسوں میں شریک ہو کر اچھی شہرت حاصل کر لی، کچھ دنوں پاکستان کے سفارت خانوں میں کونسلر بھی رہے، اب سیلون ہی کے مستقل شہری ہوگئے ہیں، میرے نام سے معارف میں ان کے بہت سے خطوط شایع ہوئے ہیں، ان ہی کے ساتھ رات کو شہر کے مشاعرہ میں شریک ہوا، اس کے صدر نواب اسمٰعیل خاں تھے جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی رہتے تھے، نواب اسحاق خاں سابق سکریٹری ایم۔ اے۔ او کالج کے صاحبزادے اور نواب شیفتہ خاں کے پوتے تھے، ایم۔ اے۔ او کالج ہی میں تعلیم پائی، سیاسی ذوق بھی رکھتے تھے، اس لیے سیاسی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے، ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنٹ نظر بند کی گئیں تو اس کے خلاف احتجاج کرنے میں پیش پیش رہے، رولٹ ایکٹ کی مخالفت ہندوؤں کے ساتھ مل کر کی، میرٹھ کی کانگریس اور خلافت کانفرنس کی کمیٹیوں کے بھی سرگرم رکن رہے، شدھی کی تحریک چلی تو ۱۹۲۳ء میں اس کی مخالفت میں ایک تنظیم بھی قائم کی، ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک لیجسلیٹو کونسل لکھنؤ کے ممبر رہے، ڈاکٹر ضیاء الدین کے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے کے لیے بھی کھڑے ہوئے، مگر نہ ہو سکے،

پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں قائداعظم محمد علی جناح کے بڑے معتمد ہوگئے تھے، تقسیم ہند کے بعد ہندوستان ہی میں رہے، وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی، ان ہی کی صدارت میں یہ مشاعرہ شروع ہوا تو جناب احسن مارہروی صاحب کارروائی کے نگراں بنے، وہ اس زمانہ میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد تھے، اپنی قابلیت کی وجہ سے بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، اردو کے قدیم شاعر ولی کے دیوان کو ایڈٹ کرنے میں بڑی استعداد کا ثبوت دیا، ان کی منثورات اردو بھی مقبول ہوئی، عروض پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے، اس مشاعرہ میں کچھ شعراء اپنا کلام پڑھ چکے تو جگر صاحب آئے نہیں لائے گئے، نشہ میں چور تھے، ایک درخت کے نیچے پڑے تھے، دو لڑکے پاؤں اور دو لڑکے سر اور ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر لائے، جناب احسن مارہروی صاحب نے طلبہ کو ڈانٹ کر کہا، اس طرح جگر، ان کی شاعری اور مشاعرہ کو رسوا کرتے ہو، مجمع ان کو سننے کے لیے بے تاب تھا، مصرع طرح تھا:

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ان کو سنانے کے لیے کہا گیا تو پہلے نواب اسمٰعیل خاں صاحب کے منہ سے اچک کر سگریٹ چھینا، دو چار کش لگائے، پھر اسی زمین میں اپنی غزل کے دو چار اشعار مشکل سے سنا سکے،

اس ہیئت کذائی میں دیکھنے کے بعد ان کو دارالمصنفین میں دیکھا تو ان کا رنگ کچھ اور تھا، شرعی چست پائجامہ، منور داڑھی اور لمبی کاکلوں کے ساتھ دکھائی دیے، دارالمصنفین جب جب آئے بہت ہی متین اور سنجیدہ نظر آئے، اور اکثر فرمائش کے بغیر بھی اپنا کلام سناتے، کہتے یہاں سنانے میں جی لگتا ہے، ان کو دارالمصنفین کی مجلسوں میں ہر طرح سے بقول شاہ صاحبؒ شریف، وضعدار، بلند نظر اور عالی ظرف انسان پایا، وہ کلام اپنے خاص لہجہ میں سناتے تو ان کے ترنم میں پپیہے کی پکار، کوئل کی کوک اور شیاما کی گنگناہٹ کی لذت محسوس ہوتی، ان دنوں جناب بشیر احمد صدیقی شبلی کالج کے پرنسپل اور جناب نیاز احمد صدیقی وائس پرنسپل تھے، یہ دونوں شبلی کالج میں بہت شاندار اور باوقار مشاعرے کرتے جن میں جگر صاحب ضرور

شریک ہوتے، اعظم گڑھ آنے میں ان کو خاص کشش ہوتی، وہ یہاں آکر مرزا احسان احمد صاحب کے یہاں ٹھہ
گر دار المصنفین میں ضرور حاضری دیتے، اپنے قدر دان حضرت سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ سے نیاز مندا
طور پر ملتے، ان کے لیے کبھی دار المصنفین میں کبھی جناب شبیر احمد صدیقی، کبھی جناب مرزا احسان احمد اور کبھی اقبا
سہیل کے یہاں بھی بزم شاعری منعقد کی جاتی، جس میں وہ بہت بے تکلف رہتے اور تفریحی باتیں بھی ک
جو بہت کچھ اب تک ذہن میں محفوظ ہیں.

وہ کسی ملحد کو پسند نہیں کرتے، اور نہ کسی ملحد کی ملحدانہ شاعری کی داد دیتے، کہتے کہ جو شاعری خال
سے بیگانہ رہے، اس میں کبھی حسن پیدا نہیں ہو سکتا، ایسے شاعر کی شاعری سب کچھ ہو سکتی ہے مگر حسن
کی مظہر نہیں ہو سکتی، جس نے ذرہ ذرہ کو جمال بخشا ہے اور جس نے کلیوں کو چٹک دی اور تاروں کو
دی، اس کے وجود کے احساس ہی سے شاعری میں جمال پیدا ہوتا ہے، اس کے بغیر شاعری کچھ بھی نہیں

جوش ملیح آبادی سے ان کے تعلقات ضرور تھے، مگر وہ ان کے ملحدانہ خیالات کو پسند نہ کرتے
بیان کیا کہ ایک بار وہ جوش ملیح آبادی کے ساتھ تانگے پر کہیں جا رہے تھے، راستے میں ان کے منہ
یا میرے اللہ کی آواز بلند ہوئی، جوش نے تمسخر کے خیال سے کہا: جگر صاحب آپ نے مجھے کیوں
وہ کب چوکنے والے تھے، بولے: میں نے تو اللہ کو پکارا تھا، یہ شیطان بیچ میں کہاں سے بول

ایک بار اپنے ایک ملحد دوست مجازی کو مخاطب کر کے کہا ۔

مجازی سے جگر کہہ دو ارے او عقل کے دشمن   مقر ہو یا کوئی منکر خدا یوں بھی ہے اور یو

ان ہی کی زبانی سنا کہ ایک بار ایک اثنا عشری رئیس کے یہاں مشاعرہ تھا، جہاں یہ شرط رکھ
تھی کہ ہر غزل میں بارہ اشعار ہوں، وہ بھی اس میں شریک ہوئے، جب ان کی باری آئی تو وہ چار غز
چار اشعار سنا کر خاموش ہو گئے، میزبان نے کہا کہ بارہ کی شرط ہے، وہ بولے کہ یہ چار سب پر بھاری
ایک بار ہنس کر کہا کہ میں نے شاعروں کی دو قسمیں کی ہیں، بھانڈ اور سانڈ، بھانڈ تو وہ ہیں جو

گاکر پڑھتے ہیں اور سانڈ وہ ہیں جو پنگھٹ یا بنارس کے گھاٹ پر کسی کو دیکھ کر اشعار کہتے ہیں۔

اثنائے گفتگو میں ایک بار یہ بھی کہا کہ بعض نقصانات ایسے ہیں جن کے پیچھے فوائد ہوتے ہیں، اور بعض فوائد ایسے ہیں جن کے پیچھے نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں، انھوں نے اس بات کو کچھ ایسے عارفانہ رنگ میں کہا کہ اس وقت سے اب تک ان کی یہ بات ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔

وہ جناب اقبال سہیلؔ سے بہت مرعوب رہے، پھر بھی ان کو اپنا کلام شوق سے سناتے، آخر زمانہ میں وہ فارسی میں بھی کچھ کلام کہنے لگے تھے، اقبال سہیل صاحب فارسی میں بڑی استادانہ مہارت رکھتے تھے ان کی نعت اور منقبت مشہور رہے، ایک مجلس میں سہیل صاحب ذرا دیر کرکے پہونچے، جب وہ آکر بیٹھے تو جگر صاحب نے کہا کہ حضرت! کچھ فارسی میں کلام کہا ہے، وہ سنانے کو جی چاہتا ہے، سہیل صاحب بول اٹھے، ابھی کھانا کھا کے آیا ہوں، ذرا ٹھہر جائیے، یہ سنکر خود جگر صاحب کو ہنسی آگئی، سہیل صاحب کے کہنے کا مطلب تھا کہ ان کا فارسی کلام جیسا ہوتا ہے اس کو سن کر کہیں ابکائی نہ آنے لگے۔

سید صاحبؒ کبھی ان مجلسوں میں نہ ہوتے تو شاہ صاحبؒ ہی چھائے رہتے، جن کی عزت جگر صاحب برابر کرتے رہے، یاد آتا ہے کہ شاہ صاحبؒ غالباً سنہ ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں مسوری گئے، ان دنوں جگر صاحب بھی وہاں موجود تھے، جگر صاحب کو شاہ صاحبؒ کے آنے کی خبر ملی تو ان کی قیام گاہ پر ان سے ملنے کو آئے، اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ حیدرآباد کے شہزادہ معظم جاہ بھی آئے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے یہاں مدعو کیا، مگر میں نے جانے سے انکار کیا کہ وہاں جانے کو جی نہیں چاہا، لیکن آپ سے ملنے کو جی چاہا اس لیے حاضر ہوگیا ہوں، اور پھر شاہ صاحبؒ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر وہ پوری غزل نذر کی جو اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد پھر تجدید نکاح کے بعد کہی تھی، جس کے دو تین اشعار یہ ہیں۔

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم — خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم
اللہ رے وہ شدت جذبات کا عالم — کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم

دو بچھڑے دلوں کی وہ باہم صلح و صفائی　　پرکیف وہ تجدید ملاقات کا عالم

جگر صاحب کی وفات ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ہوئی تو شاہ صاحبؒ کو بڑا دکھ ہوا، جس کا اظہار اکتوبر ۱۹۶۰ء کے معارف کے شذرات میں اس طرح کیا:

"افسوس کہ بزم شاعری کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی بالآخر خاموش ہوگئی، ارجناب جگر مرادآبادی نے ۹ ستمبر کو گونڈہ میں انتقال کیا، وہ صحیح معنوں میں اس دور کے رئیس المتغزلین تھے، غزل مدتوں سے بے جان ہو رہی تھی، سب سے پہلے حسرت کی مسیحائی نے اس میں جان ڈالی، پھر فانی، اصغر اور جگر نے اس کو سنوارا، یہ چاروں غزل کے ارکان اربعہ تھے، لیکن جگر نے اس کا رنگ ایسا نکھارا کہ ان کا طرز تغزل غزل گوئی کا معیار قرار پایا، انھوں نے تغزل کو اس درجہ تک پہونچا دیا کہ مستقبل قریب میں ان کے جیسا غزل گو پیدا ہونے کی امید نہیں، ان کا طرز اس قدر مقبول ہوا کہ نئے شعراء کی پوری نسل اس سے متاثر ہوئی، اور نہ صرف تغزل بلکہ جگر کے ترنم، وضع قطع حتیٰ کہ شاعرانہ لاابالی پن کی بھی تقلید کی جانے لگی، اردو شاعری کی تاریخ میں کسی شاعر کو اپنی زندگی میں شاید ہی اتنی مقبولیت ہوئی ہو، اور اس کا اتنا ہمہ گیر اثر پڑا ہو۔"

پھر آخر میں لکھتے ہیں:

"ایک زمانہ تک جگر ایسے رند بلانوش رہے کہ ان کو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا، لیکن ان کا دل ہمیشہ مومن رہا اور ہر زمانہ میں وہ راسخ العقیدہ مسلمان رہے، بزرگوں کی صحبت بھی پائی تھی، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب منگلوریؒ سے بیعت تھے، اصغر صاحب کی صحبت سے ان کو زیادہ فائدہ پہونچا، ادھر چند برسوں سے عملاً بھی دیندار ہوگئے تھے، شراب مطلق ترک کردی تھی، فرائض کے پابند تھے، حج و زیارت کے شرف سے بھی مشرف ہوئے، چہرے پر شرعی داڑھی

وابستگی تھی، اس لیے عملی اعتبار سے بھی ان کی زندگی کا آخری دور بہت اچھا گذرا اور اسی پر جمعہ کے مبارک دن صبح صادق کے وقت ان کا خاتمہ ہوا، جو ان شاء اللہ ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہے۔ اللّٰھمّ اغفر لہٗ وارحمہٗ "

ان سطروں میں شاہ صاحبؒ نے جگر صاحب کی ساری خوبیاں ظاہر کر دی ہیں، جو ان کے جگر صاحب سے گہرے لگاؤ کا بھی ثبوت ہے، وہ اپنی نجی مجلس میں جگر کے اشعار اکثر سناتے رہتے، حضرت سید صاحب کی شاگردی اور شاہ صاحب کی بے تکلف صحبت میں جو تھوڑی بہت چیزیں مجھ کو حاصل ہوئیں ان میں جگر صاحب سے عقیدت بھی ہے، جگر صاحب کی وفات کے بعد شبلی نیشنل کالج اعظم گڈھ کے کالج میگزین کا ایک جگر نمبر نکلا تو اس کو میں نے ہی مرتب کیا، اس کے لیے کئی مضامین لکھ کر وہاں کے طلبہ کو دیے جو ان ہی کے نام سے شائع ہوئے، پھر میں نے خود اس کے لیے "جگر کا فن، ان کی زندگی کی روشنی میں" کے عنوان سے لکھا، جس میں جگر کو اپنا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا:

"قدرت نے جگر کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اردو غزل کی صنف سخن کی دلفریبی اور دلآویزی میں اضافہ کر کے اس کو حسن و عشق کا گلگشت مستانہ پہلے سے زیادہ حسین اور رنگین کاشانہ بنائیں، ان کی اردو غزل گوئی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے تمام پیش روؤں بلکہ معاصروں کے مقابلہ میں ایک بہتر قسم کا کیف، ایک برتر قسم کا نغمہ، ایک اعلیٰ تر قسم کا نشاط اور ایک لطیف تر قسم کا انبساط پیدا کیا، جس کی وجہ سے حسن و عشق کے تصور میں ایک ایسا رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا جس میں ان کی زندگی کی طرح ناسوتی رنگ بھی ہے، ملکوتی بھی اور لاہوتی بھی، ان ہی کا شعر ہے ؎

مجھ سے کہ مطلق ہو مری فطرت بلند	شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے"

انکارِ حدیث پر ایک اہم مضمون

شاہ صاحبؒ نے مئی و جون ۱۹۳۳ء کے معارف میں پچاس صفحے کا ایک مضمون "انکارِ حدیث" کے عنوان سے لکھا، یاد آتا ہے کہ اس زمانہ میں رسالہ نگار (لکھنؤ) میں انکارِ حدیث پر کچھ مضامین شایع ہوئے تھے، مقبول احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ بھی منکرینِ حدیث میں تھے، پھر اہلِ قرآن کے نام سے ایک جدید فرقہ پیدا ہو رہا تھا جو حدیث کا منکر تھا،

شاہ صاحبؒ نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا مذکورۂ بالا مضمون لکھا، اس کی ابتداء اس طرح کی :

"کچھ دنوں سے جب سے حریتِ فکر اور آزادیٔ خیال کی ہوا چلی ہے، ایک جماعت میں جو مذہب کے قیود سے آزاد ہونا چاہتی ہے، حدیث و سنت کے انکار کی عجب وبا پھیل گئی ہے، مذہب کی گرفت زیادہ تر حدیث و سنت کی وجہ سے ہے، کیونکہ کلام اللہ ایک اصولی کتاب ہے جس میں مذہب کے متعلق صرف اصولی اور کلی قوانین ہیں، تمام جزئیات کا اس میں استقصار نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، ان اصول اور کلیات کی تشریح کا دار ومدار تمام تر حدیث و سنت پر ہے، اس لیے آزادی پسند طبائع سرے سے حدیث و سنت کی حجت ہی اور اس کے واجب العمل اور قابلِ حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ جب حدیث و سنت ہی کوئی شے نہ رہ جائے گی تو مذہب کی گرفت خود ڈھیلی پڑ جائے گی، اور مذہب صرف چند عقائد اور چند عبادات کا نام رہ جائے گا، وہ بھی جدید مجتہدین کی تفسیر کے مطابق کوئی مفسر صرف دو تین وقت کی نماز کافی سمجھ لیں گے، کوئی مجتہد اس سے بڑھ کر نماز کو صرف دعا، اور توجہ قلب کے معنی میں لے کر راہ چلتے، سیر و تفریح کرتے، سر راہ گردن جھکا لینا کافی تصور فرمائیں گے"

اس اقتباس کی آخری سطروں میں ڈپٹی مقبول احمد کی طرف بھی اشارہ ہے جنھوں نے رسالہ نگار کے ایک مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین وقت کی نماز ادا کرتے تھے، شاہ صاحبؒ کو اس حریتِ فکر سے بڑی آزردگی رہی، اس لیے ایسے مجتہدین پر یہ لکھ کر

گیا ہے کیونکہ بسا اوقات وہ عربی زبان سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے اس کوشش میں نہایت مضحکہ خیز نمونے پیش کرتے ہیں کہیں ترجمہ غلط، کہیں مفہوم غلط، کہیں نتیجہ غلط، کہیں کسی عبارت کے ناقص ٹکڑے سے استدلال، کہیں تاریخ سے بے خبری، کہیں ان پر مفروضات سے استدلال، کہیں طبع زاد شہادتیں، خود ساختہ توجیہات، تدلیس، خیانت، کم نظری اور ناواقفیت کا کوئی نمونہ ایسا نہیں ہوتا جو ان کی تحریروں میں نظر نہ آتا ہو۔ اس کے بعد یہ منکرین حدیث جو دلیلیں پیش کرتے ہیں ان کا ناقدانہ جائزہ لے کر ان کا رد ایسے انداز میں کیا ہے جو موجودہ ذہن کو پورے طور پر مطمئن کر سکتا ہے۔

منکرین حدیث کی پہلی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع فرمایا، شاہ صاحبؒ نے اس کو یہ کہہ کر رد کیا کہ بے شک ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی، لیکن مطلق اور دائمی نہیں، بلکہ خاص خاص مصالح کی بنا پر، ابتداء میں بہت کم مسلمانوں کو لکھنا آتا تھا، اور جو جانتے بھی تھے وہ بھی یوں ہی سا معمولی، اس لیے حدیثوں کے قلمبند کرنے میں غلط سلط لکھ جانے کا خطرہ تھا، دوسرے شروع میں خاص صحابہ کے علاوہ عام مسلمانوں میں کلام اللہ اور کلام رسول اللہ کے درمیان فرق و امتیاز قائم رکھنے کا صحیح مذاق پیدا نہ ہوا تھا اس لیے دونوں کے مخلوط ہونے کا خطرہ تھا، اس اہم خطرہ سے حفاظت کے لیے آپ نے ابتداء میں ممانعت کی تھی لیکن جب فن کتابت ترقی کر گیا اور صحابہؓ میں کلام اللہ اور کلام رسول اللہ میں فرق و امتیاز کی پوری صلاحیت آ گئی تو آپ نے یہ ممانعت ختم کر دی، اور جو لوگ لکھنے میں مہارت رکھتے تھے انھیں کتابت کی اجازت دے دی چنانچہ عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے، سب کچھ لکھ لیتے تھے، تو قریش نے ان کو منع کیا اور کہا کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو لکھ لیتے ہو، حالانکہ آپ بشر ہیں، غصہ اور رضا دونوں کی حالت میں فرماتے ہیں، ان کے کہنے پر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے لکھنا روک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے

اپنی انگلیوں سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: تم لکھا کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

یہ اجازت تنہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ بہت سے صحابہ آپؐ کی اجازت سے حدیثیں لکھا کرتے تھے، فتح مکہ میں جب آپؐ نے تحریم حرم پر خطبہ دیا تو آپؐ نے یہ احکام ایک یمنی ابوشاہ کو لکھوا دیے، پھر آپؐ کے حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ بھی بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے، آپؐ نے عمال کو بہت سے احکام لکھوا کر بھیجے جن پر خلفائے راشدین کے عہد میں عمل ہوتا رہا، یہ تحریری ہدایات علم حدیث کا پہلا مجموعہ تھیں۔

ان تمام تشفی بخش دلائل کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ آپؐ نے کتابت حدیث کی دائمی ممانعت فرمائی تو اس سے روایت حدیث اور حدیث وسنت کے ناواجب العمل اور ناواجب الطاعۃ ہونے کا ثبوت کہاں سے ملتا ہے، کتابت حدیث کی ممانعت اور شے ہے، اور حدیث کی روایت اور اس کا واجب العمل ہونا اور شے ہے، عہد رسالت میں تو تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی، ادھر زبان مبارک سے کچھ نکلا اور ادھر اس پر عمل شروع ہوگیا، اور پھر یہ عمل تواتر کی شکل میں چلا۔ اس لیے تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی۔

منکرین حدیث دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خلفائے راشدین خصوصاً شیخینؓ حدیثوں کو ناقابلِ حجت سمجھتے تھے، اس کے ثبوت میں یہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا، اس لیے تم لوگ کوئی حدیث بیان نہ کرو، جو شخص تم سے حدیث پوچھے اس سے کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے، اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام، منکرین حدیث یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سو حدیثوں کا ایک مجموعہ

تیار کیا تھا، آپ نے حضرت عائشہؓ سے اس کو منگوا کر جلا دیا، اور فرمایا کہ مجھے خوف معلوم ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ مجموعہ محفوظ رہ جائے، ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے ان پر وثوق ہو، لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں۔

اسی طرح منکرین حدیث یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے حسبنا کتاب اللہ اور لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے روکتے تھے، قرظہؓ بن کعب راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ان کو عراق بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم لوگ ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے باشندوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم ان کو احادیث میں روک کر قرآن سے غافل نہ کر دینا، قرآن میں آمیزش نہ کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کرو، قرظہ جب عراق پہونچے تو لوگوں نے کہا، ہم سے حدیث بیان کرو تو انھوں نے کہا ہم کو عمرؓ نے منع کیا ہے۔ اس قبیل کی اور روایتوں سے منکرین حدیث یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شیخینؓ حدیث کی اشاعت کو روکتے تھے۔

شاہ صاحبؒ اس کے جواب میں رقمطراز ہیں کہ ایسی روایتیں تذکرۃ الحفاظ سے لی گئی ہیں، لیکن ان سے حدیث و سنت کے خلاف نتیجہ نکالنا معترضین کی کوتاہی نظر اور ان کا قصور فہم ہے، ان میں بعض روایتیں سرے سے غلط ہیں، یہ ضروری نہیں کہ تذکرۃ الحفاظ کی اس قسم کی ہر روایت قابل قبول ہو خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ صحاح کی مستند روایات میں احادیث و سنت کی اشاعت اور اس کے واجب العمل ہونے کے متعلق بھی [illegible] کے احتجاج با حدیث و سنت کے ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں واقعات موجود ہیں۔

شاہ صاحبؒ یہ نصوص نقل کرکے لکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین کتاب اللہ کے بعد حدیث و سنت ہی کو [illegible] تھے، کسی صورت میں [illegible] سے سرمو تجاوز نہ کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کا دستور العمل یہ تھا کہ جب [illegible] پیش آتی تو سب سے پہلے کتاب اللہ اور اس کے بعد سنت [illegible] تھے

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا بھی یہی طرز عمل رہا، بلکہ انھوں نے سنت رسولؐ کے ساتھ سنت ابوبکرؓ کو بھی شامل کر لیا تھا، اور جب آپ کے زمانہ میں بکثرت فتوحات حاصل ہوئیں تو آپ نے ان ملکوں کے عمال کو انتظام ملکی کے ساتھ اہل ملک کی دینی اور سنت نبویؐ کی تعلیم کا بھی حکم دیا، اشاعت حدیث کیلئے علمائے صحابہ کو مختلف ملکوں میں بھیجتے رہے، چنانچہ فقیہ الامۃ عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ معقل بن یسارؓ، عبداللہ بن مغفلؓ اور عمران بن حصینؓ کو بصرہ اور عبادہ بن صامتؓ کو شام روانہ کیا، اور امیر معاویہؓ والی شام کو لکھا کہ یہ لوگ حدیث سے سر مو تجاوز نہ کرنے پائیں، پھر حضرت عمرؓ نے کن کن باتوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر عمل کیا، اس کی بہت سی مثالیں شاہ صاحبؒ نے دی ہیں، اور جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید میں مسند دارمی، کتاب القضاء، ابوعبیدؒ، موطا امام مالکؒ، مسند احمد بن حنبل وغیرہ کی سندیں پیش کی ہیں، جس کے بعد منکرین حدیث کی دلیل بالکل پادر ہوا ہوکر رہ جاتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس روایت کا بھی تجزیہ کیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پانسو حدیثوں کو جلا دیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت ہی صحیح نہیں، اس کا راوی ابراہیم بن عمر بن عبید اللہ التیمی مجہول ہے، رجال کی کتابوں میں اس کا ذکر ہی نہیں، جس کا راوی ایسا مجہول ہو اس کی روایت کا کیا پایہ ہو سکتا ہے، اسی طرح شاہ صاحبؒ نے ان تمام روایتوں کو مستند حوالوں سے رد کیا ہے جو حضرت عمرؓ کی مخالفت حدیث کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔

منکرین حدیث تیسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ ایسے صحابہؓ بھی ہیں جن کو کلام [illegible] قرار دیا ہے، پھر بھی ان کی روایتوں کو قبول کر لیا جاتا ہے، مثال میں حسان بن ثابتؓ [illegible] پیش کیا جاتا ہے، جنھوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تھی، شاہ صاحبؒ [illegible] حضرت حسان بن ثابتؓ کی شہادت سے متعلق کلام پاک میں جو ذکر ہے وہ [illegible] نہ کہ روایت حدیث سے متعلق ہے، پھر ان سے صرف ایک ہی حدیث [illegible]

قبولِ روایت کا اعتراض ہی غلط ہو جاتا ہے، پھر قصور وار ایک شخص ہو اور ملزم ساری جماعت ٹھہرائی جائے یہ کون سا اصول اور قانون ہے۔

منکرینِ حدیث یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ حدیثوں کے متعلق صحابہؓ کی رائے اچھی نہ تھی، وہ انھیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے تھے، مثال میں ابن عباسؓ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ جب سے لوگ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں بیان کرنے لگے ہیں اس وقت سے ہم نے حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا، امیر معاویہؓ، امام شعبیؒ اور سائب بن یزیدؒ وغیرہ کی اسی قسم کی روایتیں پیش کی جاتی ہیں، شاہ صاحبؒ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ان بزرگانِ دین نے روایت اس لیے نہیں چھوڑی کہ وہ حدیث کے منکر تھے یا اسے قابلِ حجت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ لوگوں نے قولِ رسولؐ میں جب آمیزش شروع کر دی تو وہ حدیث بیان کرنے میں احتیاط کرنے لگے، اس سے ان کے احتیاط فی الحدیث کے سوا کچھ اور ثابت نہیں ہوتا، ابن عباسؓ اپنی احتیاط کے باوجود دو ہزار چھ سو ساٹھ (۲۶۶۰) روایتوں کے راوی ہیں، عبد اللہ بن عمرؓ کی مرویات کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس (۱۶۳۰) ہے، ابن مسعودؓ آٹھ سو اڑتالیس (۸۴۸) حدیثوں کے راوی ہیں۔

منکرینِ حدیث یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ڈیڑھ ڈھائی سو برس بعد حدیث کی موجودہ کتابیں لکھی گئی ہیں، اور جو قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اتنے طویل عرصہ کے بعد لکھا گیا ہو اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، شاہ صاحبؒ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس قسم کا اعتراض کوتاہ نظری اور تاریخِ حدیث سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، واقعہ یہ ہے کہ عہدِ رسالت، عہدِ خلفائے راشدین اور عہدِ بنی امیہ میں کوئی ایسا دور نہ تھا جس میں حدیثوں کے مجموعے نہ مرتب کیے گئے ہوں، وہ اب بجنسہٖ تو نہیں ہیں لیکن بعد کی کتب مدونہ میں وہ تمام مجموعے شامل ہو گئے، اس لیے گو وہ آج مستقل صورت میں نہیں مگر موجودہ کتب کے اجزا بن گئے، اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے مستند حوالوں سے یہ دکھایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ

آپ کی اجازت سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جس کو وہ صادقہ کہتے، حضرت ابوہریرہؓ نے بھی اپنی تمام مرویات قلمبند کی تھیں حضرت علیؓ نے چند فقہی حدیثیں لکھی تھیں اور اس تحریر کو وہ صحیفہ کہتے تھے، حضرت عمرؓ اپنے عمال کو مذہبی احکام و مسائل لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے، حضرت انسؓ بن مالک اپنے لڑکوں سے فرماتے تھے کہ علم حدیث کو لکھ کر قید کرو، سعیدؓ بن جبیر روایت کرتے ہیں کہ میں ابنؓ عباس اور ابنؓ عمر سے رات کو جو حدیثیں سنتا تھا ان کو لکھ لیتا تھا، حضرت عبداللہؓ بن عمر کے مشہور محدث غلام نافع ان کے سامنے ان کی حدیثیں لکھا کرتے تھے، آبان بھی حضرت انسؓ سے جو کچھ سنتے قلمبند کر لیتے، بنی امیہ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے حکم سے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھی گئیں اور جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیجا گیا۔

آخر میں شاہ صاحبؒ نے اپنے انداز بیان کے پورے زور کے ساتھ لکھا کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر بنی امیہ کے اختتام تک حدیثیں نہیں لکھی گئیں، تب بھی حدیث و سنت کے نا واجب العمل اور ناقابل صحت ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اصل شے تواتر عمل ہے، ہم کو دیکھنا یہ چاہیے کہ ان زمانوں میں مسلمانوں کا عمل کیا تھا، جس چیز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی میں ہزاروں صحابہؓ، پھر خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں بے شمار صحابہؓ، لاکھوں تابعین، پھر بنی امیہ کے صد سالہ دور میں سیکڑوں ائمۂ اسلام، لاکھوں تبع تابعین اور کروڑوں مسلمان بلا اختلاف پابندی کے ساتھ عمل کرتے چلے آئے ہیں اور آج تک وہ عمل جاری ہے، اس کو نا واجب الطاعۃ اور نا واجب العمل کس طرح کہہ سکتے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مذہب علمائے اسلام، بلکہ کسی قابل ذکر مسلمان نے آج تک احکام و اعمال نبویؐ میں فروعی اختلاف کے سوا جو حدیث و سنت ہی سے متفرع تھے، کوئی اصولی اختلاف کیا ہے یا اس کے خلاف عمل پیرا ہوا ہے؟ اگر کوئی مثال ہو تو پیش کرنی چاہیے، ورنہ پھر امت اسلامیہ کے سواد اعظم کے عملی تواتر کی [illegible]

صحابہ، تابعین، علمائے اسلام اور ایمۂ مذہب سب ہی تھے، کون رد کرسکتا ہے اور کون عقل اسے تسلیم کرسکتی ہے۔

شاہ صاحب کی ان سطروں میں کیسی ایمانی غیرت وحمیت ابھر آئی ہے' اور انھوں نے جو چیلنج دیا اس کو اس زمانہ میں کوئی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا، ڈپٹی مقبول احمد جیسے منکر حدیث تو پسپا ہوکر رہ گئے، پھر انھوں نے ایسے مضامین نہیں لکھے، یاد آتا ہے کہ ان کا تبادلہ اعظم گڈھ ہوا تو ایک روز بہت خاموشی سے دارالمصنفین آئے اور پشیمان، نادم اور محجوب ہوکر سید صاحبؒ کے پاس بیٹھے، کسی اور سے نہ ملے۔ سید صاحبؒ کے اخلاق سے متاثر ہوکر ایک شام کو دارالمصنفین اس وقت آئے جب یہاں چائے ہورہی تھی، وہ بھی چائے نوشی میں شریک ہوگئے، اس زمانہ میں مولوی مسعود علی ندوی مرحوم چائے پی کر ٹینس کھیلنے کے لیے سلطان کلب جایا کرتے تھے، وہ اپنا بلّا لے کر جانے لگے، تو ڈپٹی مقبول احمد نے مزاحًا ان سے کہا: "با ایں ریش و بش یہ ٹینس کا بلا"۔ مولوی صاحب کب چوکنے والے تھے، فورًا جواب دیا: "با ایں عقل و دانش قرآن و حدیث پر مضمون نگاری"۔ چائے کی مجلس قہقہوں سے گونج اٹھی۔

<u>عرب کی موجودہ حکومتیں</u> | ۱۹۳۴ء میں شاہ صاحبؒ کی ایک تصنیف "عرب کی موجودہ حکومتیں" شایع ہوئی، وہ خود اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے' اور اس کو وہ وقتی چیز سمجھتے تھے، سید صاحبؒ کو اسلام اور اسلامی ممالک سے کچھ ایسا لگاؤ اور انس ہوگیا تھا کہ وہ ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات ہندوستان کے مسلمانوں کو فراہم کرکے اپنے ذوق کی بھی تشنگی بجھانا چاہتے، مثلاً صقلیہ کی تاریخ کو مسلمان بھول چکے تھے' مگر وہ مولوی سید ریاست علی ندوی سے اس کی تاریخ لکھانے میں ان سے پوری محنت لے رہے تھے، اسی لیے ان کی خواہش ہوئی کہ عربوں کی موجودہ حکومتیں جہاں جہاں ہیں' ان سے بھی مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے، ان ہی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ اپنی اس کتاب کے دیباچہ میں

لکھتے ہیں:

"جزیرۃ العرب مسلمانوں کا مذہبی مرکز اور ان کا حقیقی سرچشمہ فیض ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصیت سے اس سرزمین کے ساتھ ایک والہانہ شیفتگی رہی ہے، اور وہ اس کی ہر خدمت کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے رہے ہیں، اس سعادت کے حصول میں کسی ملک کے مسلمانوں سے ان کا قدم پیچھے نہیں پڑا، آج بھی اس ارض مقدس کے زائروں میں سب سے بڑی تعداد ہندی مسلمانوں کی ہوتی ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس عقیدت و شیفتگی کے باوجود عوام کا کیا ذکر، بہت سے خواص کو بھی جزیرۃ العرب کے صحیح حالات سے واقفیت نہیں ہے، حج کے تعلق سے صرف ایک حجاز سے تھوڑی بہت واقفیت ہوجاتی ہے، باقی عرب کے اور کسی حصہ کے متعلق انھیں کوئی معلومات نہیں کہ آج جزیرۃ العرب میں کتنی حکومتیں ہیں، کہاں کہاں ہیں، ان کی اندرونی حالت کیا ہے، بیرونی دنیا سے ان کے کیا تعلقات ہیں، اقوام عالم میں ان کی سیاسی پوزیشن کیا ہے؟

اس لاعلمی کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں اس وقت تک اس موضوع پر کوئی مستقل معلومات نہیں ہیں، اور ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو اس کمی کو پوری کر سکے، اس لیے ہم نے اس کتاب میں عرب کی تقریباً تمام موجودہ حکومتوں کے مختصر گر جامع حالات جمع کر دیے ہیں، گو یہ حالات بہت مختصر ہیں، تاہم اجمالی معلومات کے لیے کافی ہیں،

یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک میں عرب کا مختصر جغرافیہ ہے، دوسرے میں حکومتوں کے حالات ہیں، پہلا حصہ ایک صاحب نظر " طالب علم مقیم مکہ " کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا کاتب سطور کا"

اس کی ضخامت ایک سو ستر صفحے ہے، اس کے شروع میں عرب کا مختصر جغرافیہ یعنی اس کے

مشتمل ہے، جو ایک صاحبِ نظر طالب علم مقیم مکہ کا لکھا ہوا ہے، جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، دوسرے حصہ میں جو خود شاہ صاحبؒ کا لکھا ہوا ہے، عرب میں اس وقت کی حکومتوں نجد و حجاز، عسیر، یمن، امارات نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین و شام کا ذکر ہے، اس کتاب کی تیاری میں جن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے اس کو شاہ صاحبؒ نے یہ لکھ کر بتایا ہے کہ جزیرۃ العرب کے حالات شام کے نامور عربی النسل عیسائی اہل قلم امین ریحانی کے سفرنامۂ ملوک العرب سے اخذ کیے گئے ہیں، شام سے متعلق معلومات وہاں کے مشہور مسلمان اہل قلم محمد کرد علی صاحب المجمع العلمی کی خطط الشام سے ماخوذ ہیں، یمن کی تفصیلات وہاں کے مصنف شیخ عبدالواسع یمنی کی تاریخ یمن اور عراق کے حالات رسالۃ العرفان صیدا اور وہاں کی تعلیمی رودادوں سے لیے گئے ہیں،

جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اُس وقت عرب کی حکومتیں کچھ اور تھیں، اب ان کا نقشہ کچھ اور ہو گیا ہے، مگر اس سے اس دور کی حکومتوں سے متعلق مفید معلومات اب بھی حاصل ہو سکتے ہیں بعض پرانی چیزوں سے بھی نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، کتاب کے ابتدائی حصہ کو پڑھ کر ناظرین کو خود تعجب ہوگا کہ عرب کی حکومتیں مختلف حصوں میں تقسیم تھیں اور ان پر بھی ان کا اپنا اختیار نہیں تھا، اگر ان کا مختصر ذکر کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا، اس سے کتاب کی نوعیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

پہلا باب حکومت نجد پر ہے، جس میں [illegible] سے اس کی تاریخ لکھ کر عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل فیصل السعود کے تسلط کا زمانہ دکھایا گیا ہے، اور ان کے اتحاد عرب کے خیال، نظام حکومت، پابندیٔ شرع، حلم و عفو، فوج، محاصل، تعلیمی ترقیوں اور اہل نجد کے طبقات کا ذکر ہے، اس میں سلطان عبدالعزیز کی خوبیوں کی تفصیل بھی ملے گی جس کا اندازہ شاہ صاحبؒ کی اس رائے سے ہوگا کہ انصاف پسند یورپ کو تعجب ہوتا ہے، اس کی ہر بات پر ان کی نظر بہت غائر رہتی ہے، اس کے متعلق ان کی یہ رائے نہایت دلچسپ ہے کہ یورپ اس آہنی پھاٹک کے مثل ہے [illegible] (ص ۴۵)

شاہ صاحب نے اس کی بھی نشان دہی کی ہے کہ نجد کے خشک بنجر اور غیر تربیت یافتہ علاقہ میں ایک مقام عنیزہ ہے، اس کو نجد کا پیرس کہنا چاہیے۔ (ص ۵۵)

دوسرا باب حکومت عسیر پر ہے، جو یمن سے متصل ہے، یہاں کے ادریسی حکمرانوں کا تعلق مراکش کے مشہور صوفی بزرگ احمد بن ادریس سے ہے جو ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے، وہ حسنی سادات میں سے تھے ان میں سے سید محمد سنوسی مغربی نے روحانی فیوض حاصل کیے، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عسیر کے باشندوں میں قدیم عرب کی تمام خصوصیات موجود ہیں، شجاعت، فیاضی اور مہمان نوازی کی وہی آن قائم ہے، (ص ۶۹)

یہاں سادات بہت آباد ہیں، ان کی دست بوسی ہر شخص پر فرض ہے، وہ کشکول لے کر بازار نکل جاتے ہیں، اور جس دوکان سے جو چیز چاہتے ہیں بلا قیمت اٹھا لیتے ہیں، کوئی روک نہیں سکتا، وہ غلہ ترکاری گوشت اور مٹھائی سے کشکول بھر کے واپس آتے ہیں (ص ۶۶)

تیسرا باب حکومت یمن پر ہے، یہاں زیدی شیعوں کی حکومت ہے، جو زید بن علی زین العابدینؒ کی طرف منسوب ہیں، ان کی حکومت دسویں صدی کے ربع اول میں قائم ہوئی، لیکن وقتاً فوقتاً دوسری قومیں بھی تھوڑے تھوڑے عرصہ تک حکمراں ہوتی رہیں، ان ہی میں قرامطہ اور ترک تھے، ۱۹۱۱ء میں ترکوں کی باج گذار ریاست ہوگئی، یمن عرب کا نہایت شاداب اور سرسبز خطہ ہے، اس میں صنعت و حرفت بھی خاصی ہے، یہاں ہر قسم کے کپڑے، رنگین اور سادے فرش بنتے ہیں، تانبا بکثرت ہوتا ہے، سونے چاندی قیمتی پتھروں اور پٹرول کی بھی کانیں یہاں ہیں، یمنی حکومت کی بنیاد تو خالص مذہبی ہے، لیکن علاقہ ترکی حکومت سے ملتی جلتی ہے، حدیدہ اس کا اہم بندرگاہ ہے، اس کے امام اپنے ان حصوں کو لینے کی فکر میں ہیں جو یمن سے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے تھے

چوتھا باب حکومت [illegible] پر ہے، یہ پہلے سلطنت ترکی کے مقبوضات میں شامل [illegible] کے ساتھ [illegible] کا اب مختصر سا ذکر ہے، عدن کے کھنڈر [illegible]

ترکوں کی سیاست تھی، مگر ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا، لحج انگریزوں کے زیر اثر ہو گیا، پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے لحج اور عدن دونوں پر حملے کیے جس سے لحج بہت تباہ ہوا، جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی تو لحج زیدی حکمرانوں کو واپس مل گیا، عدن پر انگریزوں کا قبضہ رہا اور لحج پر بھی انگریزوں کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو گیا، یہ حکومت رقبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹی تھی، مگر ترقی میں بہت آگے رہی۔

پانچواں باب نواحی تسعہ پر ہے جس کے ساتھ نو قبائلی ریاستیں تھیں (۱) الصبیحہ: یہ متعدد قبائل حطیفی اور بریمی وغیرہ کا مجموعہ ہے، عدن کے مغربی سمت میں عمران سے باب المندب تک لب ساحل آباد ہے، (۲) آل فضل، عدن کے مشرقی جانب حایلہ کے حدود سے لے کر مغربی عوالق تک لب ساحل ۱۰۰ میل کے رقبہ میں آباد ہے (۳) العوالق، لب ساحل آل فضل کے قریب آباد ہے (۴) الواحدی، عوالق کے پاس شمال مغرب میں آباد ہے، جہاں ان کا پایۂ تخت اور بلحاف بندرگاہ ہے (۵) العوازل آل فضل اور عوالق کے درمیان آباد ہیں (۶) الیوافع، سمت مغرب میں وادی رقوح کے بعد کوہستانی علاقہ میں آباد ہیں (۷) العلوی، حواشب کے ہمسایہ تھے، (۸) القطیبی، بڑا جنگجو قبیلہ ہے (۹) الحواشب لحج اور صبیحہ کے قریب آباد ہیں، یہ سارے قبائل انگریزوں کے زیر اثر رہے، انگریزوں کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"انگریز کسی مقام پر خواہ کتنی ہی ذلیل شرائط پر کیوں نہ داخل ہوں لیکن جہاں ایک مرتبہ ان کے قدم پہونچ گئے وہاں پھر کسی دوسرے حکمران کا ٹکنا مشکل ہے"

"انگریزی سیاست ایک ننھے سے زندہ جسم کی طرح ابتدا میں بہت چھوٹی سی شکل میں نمودار ہوتی ہے، پھر رفتہ رفتہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ترقی کرتے کرتے ایک دیو ہیکل شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے، شروع میں دوستانہ معاہدہ ہوتا ہے، پھر اس میں وقتاً فوقتاً نہایت غیر محسوس طور پر تغیر کا اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ اس کا سمجھنا بھی مشکل ہے، اور جب معاہدہ اس کے نرم گرفت میں آ گیا

تو پھر جنبش نہیں کر سکتا، یہ ایک عام اصول ہے، جو عموماً برتا جاتا ہے اور بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے۔"

شاہ صاحبؒ نے یہ تبصرہ انگریزوں کی حکومت میں رہ کر لکھا، اس قسم کی معاندانہ بلکہ باغیانہ تحریر کوئی جری اہل قلم ہی لکھ سکتا ہے۔ انگریزوں کے خلاف دارالمصنفین کے اہل قلم یہ جرأت برابر دکھلاتے رہے،

چھٹا باب بحرین پر ہے، جو میرے خیال میں اس کتاب کا بہت ہی اچھا باب ہے۔ اس کے شروع میں خلیج عجم کی اہمیت دکھائی گئی ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہی سرزمین تہذیب و تمدن کا سب سے پہلا گہوارہ تھی، خلیج عجم ہی کے باشندوں نے سب سے پہلے دنیا میں جہاز رانی کی بنیاد ڈالی، بحرین خلیج فارس کا مستطیل جزیرہ ہے، اس کے آثار قدیمہ اس کی تاریخی عظمت کے شاہد ہیں۔ ابتدائے تاریخ اسلام سے لیکر تاتاریوں کے ہنگامہ تک یہ اسلامی سلطنتوں اور امرائے عرب کے ماتحت رہا، آخر میں تیمور لنگ کا قبضہ ہوا، پھر پرتگالی اس پر قابض ہو گئے، لیکن وہ چالیس[۴۰] سال کے بعد نکال دیے گئے، جس کے بعد بحرین ایران کے ماتحت ہو گیا، پھر آل خلیفہ کی حکومت یہاں ہوئی، ان کے بعد کبھی سلطان مسقط، کبھی نجد کے ابراہیم بن عصفان اور کبھی آل خلیفہ کا تسلط اس پر ہوا، پھر خود بحرین میں سخت قسم کی خانہ جنگی شروع ہو گئی جس سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا، ۱۹۰۳ء سے انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حکومت قائم ہو گئی، شیخ حمدون نام کے حکمراں رہے، بحرین اپنے موتیوں کی تجارت کی وجہ سے مشہور ہے، موتیوں کا یہ سب سے بڑا مخزن ہے، یہ بہت بڑی بحری تجارت کا راستہ بھی ہے۔

ساتواں باب کویت پر ہے، یہ بھی خلیج فارس کی چھوٹی سی ریاست ہے، اس کا رقبہ چار ہزار مربع میل[۴] ہے، یہاں آل صباح کی حکومت ہے، جو مشہور قبیلۂ ربیعہ کی شاخ اسد ہیں، گیارہویں صدی میں یہ لوگ نجد سے کویت چلے آئے تھے۔ ان کے خاندان میں اختلاف ہوا، تو پورا کویت حکومت دولت عثمانیہ کے زیر سیادت آگیا، مگر آل صباح کی خانہ جنگی جاری رہی، اس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، کیونکہ ان کی نظر خلیج فارس پر تھی، انگریزوں نے ترکوں کی سیادت ختم کر دی، خود اس کے چودھری بن بیٹھے اور کویت کے

حکمراں کو ان سے یہ معاہدہ کرنا پڑا کہ حکومت برطانیہ کے سوا اور کسی حکومت سے کوئی علاقہ نہ رکھیں گے، اس زمانہ میں کویت کی سب سے بڑی تجارت موتیوں، ہاتھی کے دانت اور کشتیوں کی ہوتی تھی۔

آٹھواں باب عراق پر ہے، جو عربوں اور ترکوں کی کشمکش، پھر جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں کی سامراجی ریشہ دوانیوں کی بہت ہی اچھی تجربہ گاہ ہے، اس جنگ کے بعد عراق، شام، لبنان، فلسطین اور اردن کے اندر جو سیاسی گتھیاں پیدا ہوئیں ان کی تفصیلات بڑی لمبی اور عبرتناک ہیں، مگر شاہ صاحبؒ نے ان تمام پیچیدہ حالات کو کچھ ایسے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے کہ ساری پیچیدگیوں کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے، دکھایا ہے کہ اگر مسلمانوں یعنی عربوں اور ترکوں میں اختلاف نہ ہو جاتا تو وہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو قدم جمانے کا موقع نہ ملتا، عرب ترکوں کے خلاف اس لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ وہ اپنے علاقوں میں آزادی چاہتے تھے، اس وقت مشرق وسطیٰ کا پورا علاقہ ترکی امپائر میں تھا، اس سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اجتماعی قوت بنی تھی، یورپ کی عیسائی قومیں مسلمانوں کی اس متحدہ قوت کو پسند نہ کرتی تھیں، اس لیے اس پر ضرب کاری لگانا چاہتے تھے، پہلی جنگ عظیم میں ان کو یہ موقع مل گیا، شریف حسین اس وقت عربوں کے سب سے بڑے اور عالی حوصلہ امیر تھے، وہ ترکوں کے خلاف انگریزوں سے مل گئے، انگریزوں نے ان کو ترکوں سے مکمل آزادی کا خواب دکھلایا، انھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے اشارہ پر اکتوبر ۱۹۱۶ء میں حجاز میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اتحادیوں نے سند تصدیق دی، انگلستان اور فرانس کے جہاز تہنیت و مبارکباد کے پیام لے کر آئے، اس طرح شریف حسین کے ہاتھوں سے مقدس حجاز اتحادیوں کے ہاتھوں فروخت ہو گیا، شریف حسین کے لڑکے امیر فیصل ترکوں سے خوں ریز اور ہولناک جنگ کر کے شرق اردن کے راستے سے شام میں داخل ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۱۸ء تک وہاں سے دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، عربوں کو توقع تھی کہ اب ان کی خود مختار حکومت ان علاقوں میں قائم ہو گی، مگر اتحادیوں نے

انہوں نے انگریزوں سے شام کے کئی ٹکڑے کر دیے، صور سے اسکندرونہ تک فرانس کے قبضہ میں آ گیا اور فلسطین انگریزوں کے حصہ میں آیا، پس خوردہ حلب سے دمشق تک امیر فیصل کے لیے نامزد ہوا، مگر اس فیصلہ کے خلاف شورش اور بغاوت ہوئی، امیر فیصل نے صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کچھ کوشش کی، مگر جولائی ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں اور امیر فیصل کو ان کے متعلقین کے ساتھ ایک ٹرین میں بند کر کے بغداد روانہ کر دیا جس کے بعد وہاں اسلامی حکومت کا جنازہ نکل گیا۔ اسی زمانہ میں فرانس نے لبنان میں اپنے اقتدار اعلیٰ کے اندر ایک حکومت قائم کر دی اور اس کے ساتھ حدود جبل عامل، وادی تیم، بعلبک، بقاع، طرابلس اور حصن صافیتا تک بڑھا دیے گئے، نصیریہ کے علاقہ میں بھی ایک علیٰحدہ حکومت قائم کر دی گئی جو دولت علویہ کے نام سے موسوم ہوئی، اس کا صدر مقام لاذقیہ بنایا گیا، یہ بھی فرانسیسیوں کے ماتحت رہی، جبل دروزہ میں دروزیوں کی حکومت فرانسیسی کی نگرانی میں قائم ہوئی، دمشق اور حلب میں بھی فرانس نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں اپنے زیر سیادت بنا دیں، اس طرح یہ سارا علاقہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ کر پرزے پرزے ہو گیا، فلسطین کا علاقہ برطانیہ کے قبضہ میں رہا، جس نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں اس کے انتظامات اپنے ذمے لے لیے اور اس کو وطن الیہود بنا دیا جس سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان مستقل جھگڑے کھڑے ہو گئے، شرق اردن شریف حسین کے بیٹے امیر عبداللہ کو ان کی وفاداری یعنی غداری کے صلہ میں دیا گیا، اس تقسیم اور تجزیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"جنگ عظیم سے پیشتر یہ کل علاقہ تنہا دولت عثمانیہ کے ماتحت تھا، چونکہ صرف ایک حکومت تھی اس لیے اخراجات بہت کم تھے، اور اب جب کہ ایک کے بجائے چھ سات حکومتیں اپنے جملہ لوازم کے ساتھ، گو وہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، قائم ہو گئیں تو فطری طور پر اس کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ گئے، اور یہ صرف اس لیے کیا گیا تاکہ اس بہانہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کھپت

[illegible]
شورہ اور نگرانی کے بہانے سے انگریز اور فرانسیسی حکام اور عہدیداروں کی پرورش کا انتظام ہو جائے

عراق کی سرگذشت بھی شام کی طرح سبق آموز ہے، جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریزوں نے عراق میں ترکوں کو شکست دی تو ترکوں نے شام کے ساتھ عراق، عسیر، یمن اور موصل اتحادیوں کے حوالے کر دیے، مگر معاہدۂ ورسائی کے مطابق موصل کا علاقہ فرانسیسیوں کو، بصرہ اور بغداد کی ولایت انگریزوں کو ملی، مگر جب سان ریمو کا معاہدہ ہوا تو موصل کے ساتھ شمال سے جنوب تک کل عراق برطانیہ کو مل گیا، عراقی اس سے مطمئن نہیں ہوئے، انھوں نے ہنگامے شروع کیے، انگریزوں نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے امیر فیصل کو وہاں کا بادشاہ اس شرط پر بنا دیا کہ وہ اپنی حکومت میں انگریزوں کے علاوہ کسی اجنبی کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھائیں گے، اور عراق کے برطانوی ہائی کمشنر کے ذریعہ سے جملہ امور میں مشورہ کریں گے، اس طرح ایک عجیب معجون مرکب حکومت قائم ہو گئی، جسے نہ آزاد کہہ سکتے تھے اور نہ انتدابی، اس لیے عراقیوں میں پھر شورش شروع ہو گئی، جس سے ہنگاموں کے بعد پھر انگریزوں سے یہ معاہدہ ہوا کہ عراق میں ایک مستقل اور آزاد حکومت قائم ہو گی، لیکن عدالت اور ان محاصل حکومت میں جن سے انگریزی فوجیں فائدہ اٹھاتی ہیں، بدستور انگریزوں کے امتیازات اور تحفظات باقی رہیں گے اور عراق میں انگریزی فوج کی نقل و حرکت میں ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی جائے گی اور ان کو انگریزی ہوائی مستقر قائم کرنے کے لیے جگہ دی جائے گی، وغیرہ وغیرہ۔

اب جب کہ راقم یہ تحریریں لکھ رہا ہے مشرق وسطیٰ کی سیاسی حالت بہت کچھ بدل چکی ہے، شام، لبنان، عراق اور اردن مکمل آزاد ہو چکے ہیں، مگر فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی جنگ جاری ہے، فلسطین میں یہودیوں کی باضابطہ حکومت قائم کر دی گئی ہے، فلسطین کا نام جاتا رہا ہے، اس [illegible] اسرائیل کہلاتا ہے، مگر مشرق وسطیٰ اب بھی بڑی طاقتوں کا سیاسی جولان گاہ بنا ہوا ہے، بلکہ پہلے فرانس اور برطانیہ دونوں یہاں سے نکل چکے ہیں اور ان کی جگہ پر امریکہ اور روس کود پڑے ہیں، اور دونوں پنجہ [illegible]

اور پر فریب حکمت عملی سے اس کو سیاسی جہنم بنائے ہوئے ہیں اور مستقبل بعید میں یہ امید نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو امن و سکون حاصل ہو سکے گا، اب وہاں کی تاریخ کچھ اور بن رہی ہے، لیکن شاہ صاحب کی کتاب "عرب کی موجودہ حکومتیں" کے مطالعہ سے آج سے نصف صدی پہلے وہاں جو سیاسی شطرنج کی بساط بچھائی گئی تھی اس کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی، اس کو پڑھ کر عبرت ہوتی ہے کہ عربوں کو اپنے باہمی اختلافات اور مناقشات سے کیسے کیسے برے دن دیکھنے پڑے، ان کی حکومتیں گئیں، خوں ریزیاں ہوئیں، غلامی کا طوق ان کی گردنوں میں ڈالا گیا، ان کی خودداری اور عزت نفس بھینٹ چڑھی، خود اسلام کی حمیت و غیرت سخت آزمائش میں مبتلا ہوئی، مگر ماضی کے ان عبرتناک واقعات سے انھوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا، اور نہ کوئی عبرت حاصل کی، ان کی انسانی اور جبلی سرشت ان کی دینی غیرت پر غالب ہوتی رہی، یہ ساری چیزیں شاہ صاحب کی اس کتاب سے ناظرین کے سامنے واضح اور منقح ہو جائیں گی، اس لحاظ سے اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ (باقی)

سلسلۂ تاریخ اسلام

مرتبہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

تاریخ اسلام حصۂ اول: عہد رسالت و عہد خلافت راشدہ کی مذہبی و سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ۔ قیمت ... ۱۷

تاریخ اسلام حصۂ دوم: اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل۔ قیمت ... ۱۵

تاریخ اسلام حصۂ سوم: عباسیوں کے پہلے حکمراں ابو العباس سفاح سے ابو اسحٰق متقی اللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ۔ قیمت ... ۱۸

تاریخ اسلام حصۂ چہارم: عباسی خلیفہ مستکفی باللہ کے عہد سے مستعصم باللہ تک کی تاریخ جس پر عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ قیمت ... ۱۹

یہ سلسلۂ تاریخ اسلام شاہ صاحب کی تصنیفی زندگی کا شاہکار ہے

"منیجر"

کلام اقبال

میں رومی کی شعری تلمیحات و اقتباسات[1]

از : ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی، گورنمنٹ کالج لاہور

حکیم الامت علامہ اقبال کے کلام میں بیسیوں مقامات پر فارسی کی شعری تلمیحات نظر آتی ہیں، چونکہ علامہ دوسرے مشہور فارسی شعراء کی نسبت مولانائے روم سے زیادہ متاثر ہیں اس لئے ان کی شعری تلمیحات تعداد میں زیادہ ہیں۔ ذیل میں علامہ کے تین مجموعوں میں رومی کی شعری تلمیحات کو ان کے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مثنوی مسافر کے آغاز میں "خطاب بہ اقوام سرحد" کے تحت دین اسلام اور زندگی کے اسرار و رموز بیان کرکے دل کی مستی اور حقیقتِ دین پر روشنی ڈالی اور اہل سرحد کو مرد ماہ کا صید بننے کی دعوت دی گئی ہے . . . . . اس حصے میں علامہ نے رومی کے درج ذیل چار شعروں سے استفادہ کیا ہے :-

رزق از حق جو مجو از زید و عمر — مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر
گل مخور گل را مخر گل را مجو — زانکہ گل خوار است دائم زرد رو
دل بجو تا جاودان باشی جوان — از تجلی چہرہ ات چون ارغوان
بندہ باش و بر زمین رو چون سمند — چون جنازہ نے کہ بر گردن برند

---

[1] اس مضمون کی پہلی دو قسطیں مجلہ راوی صد سالہ نمبر اپریل ۱۹۷۷ء (مشتمل بانگ درا و پیام مشرق) و مجلہ اقبال اکتوبر ۱۹۷۷ء (مشتمل بال جبریل) شایع ہو چکی ہیں۔ یہ تیسری قسط ہے۔ ہر قسط اپنی جگہ ایک مکمل مضمون ہے۔ یہ آخری قسط مثنویہائے مسافر و پس چہ باید کرد . . . . زبور عجم اور جاوید نامہ پر مشتمل ہے۔ ارمغان حجاز میں رومی کا کوئی شعر نظر نہیں آیا۔

یہ اشعار مثنوی رومی میں تین مختلف مواقع پر آئے ہیں۔ پہلا شعر رزق از حق . . . الخ پانچویں دفتر میں قصہ اہل ضروان میں آیا ہے۔ اہل ضروان کا باپ ایک سخی آدمی اور اللہ والا تھا۔ وہ مسکینوں کو وظیفے وغیرہ دیتا۔ اور باغ اور کھیت کی پیداوار مثلاً انگور کے لیے آٹا دانہ اور دیگر اشیا حلوہ یا لوہ وغیرہ کا عشر (۱/۱۰) ان میں تقسیم کر دیا کرتا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مختلف پیداوار میں خوب خوب برکت ڈال رکھی تھی۔ وہ شخص کسی کا محتاج نہ تھا جب کہ ہر کوئی اس کا محتاج تھا۔ اس کے فرزند اس کی اس سخاوت سے سخت نالاں اور چیں بجبیں تھے انھیں یہ وظیفے اور عشر تو نظر آتے تھے، لیکن ان کے طفیل جو برکت تھی وہ ان کی نظر سے اوجھل ہی رہتی۔ وہ ہمیشہ اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتا رہتا کہ مسکینوں مفلسوں کو خرچ اور عشر دینے سے ہاتھ نہ روکنا، تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سبب تمھارے باغ اور کھیت پھلتے پھولتے رہیں۔ مولانا اتنا قصہ بیان کرنے کے بعد یہ فلسفہ پیش کرتے ہیں کہ ہر چیز مثلاً دولت پھل فصل خدا کی عطا کردہ ہے اس نے ہر چیز بے حساب بھیجی ہے یہاں جتنا کوئی خرچ کرے گا اتنا ہی نفع پائے گا، یہ دنیا جائے منافع ہے پھر اسکی مثال اسطرح دیتے ہیں کہ کسان اپنی زیادہ تر پیداوار بعد ازاں بو دیتا ہے کہ یہاں کی آیندہ فصل کی اصل ہوتی ہے وہ اپنی پیداوار سے کم کھاتا اور زیادہ بو دیتا ہے، کیونکہ اسے اس کے اگنے میں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ زمین میں اس لئے دانہ بکھیرتا ہے کہ دہیں سے اسے غلہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح موچی کی مثال ہے، جو اپنی روٹی سے پیسے بچا کر چمڑے کی خرید پر خرچ کر دیتا ہے۔ مولانا زمین اور چمڑے کو محض پردہ قرار دیتے ہوئے تلقین کرتے ہیں کہ روزی کی اصل خدا کی طرف سے جانو جب کہ یہ اشیا (زمین چمڑا وغیرہ) آمدنی کی اصل ہیں، انہی کے وسیلے سے رب جلیل بند رزق کھولتا ہے یہ آمدنی بلاشبہ اسی کی جانب سے ہے، اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔ تم اسی لئے دانہ بوتے ہو کہ ایک سے ہزاروں دانے حاصل کرو۔ چلئے تم نے اس زمین میں جسے تم سبب سمجھتے ہو بیج بو دیا۔ لیکن

جب ایک عرصہ تک اس میں کچھ نہیں اگتا تو کیا کرتے ہو؟ یہی نا کہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور منت سماجت اور فریاد و دعا کرنے لگتے ہو۔ اللہ کی طرف رجوع کرتے وقت سر پہ ہاتھ رکھتے ہو، تو یہ سر اور ہاتھ ہی اس کی جانب سے عطائے رزق کے گواہ ہیں، تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ رزق دینے والی ذات صرف وہی باری تعالیٰ ہے، لہٰذا جو کوئی بھی رزق کا خواہاں ہو اسی رازقِ مطلق سے مانگے۔ مولانا اسی طرح طلب رزق، منعمی اور نصرت وغیرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخر ایک وقت ان سے محروم ہو جاؤ گے تو اس وقت بھلا کس کو پکارو گے، ظاہر ہے اسی ذات اقدس کو پکارو گے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ابھی سے اسے پکارنا شروع کر دو باقی سب کو چھوڑ دو، تاکہ تم ہی اس دنیا کی سلطنت کے وارث بن سکو۔

این زمین و سختیان پرده است و بس	اصل روزی از خدا دان هر نفس
که اصول و دخل اینها برده اند	هم از اینها می کشاید رزق بند
دخل از آنجا آمدستش لاجرم	هم از آنجا میکند داد و کرم
چون بکاری در زمین اصل کار	تا بروید هر یکی را صد هزار
گیرم اکنون تخم را گر کاشتی	در زمینی کش سبب پنداشتی
چون دو سه سالی نروید چون کنی	جز که در لابه و دعا بر سر زنی
دست بر سر می زنی سوی اله	دست و سر بر دادن رزقش گواه
تا بدانی کاصل اصل رزق اوست	تا هم از وی جوید آنکو رزق جوست
رزق از وی جو مجو از زید و عمرو	مستی از وی جو مجو از بنگ و خمر
منعمی زو خواه نی از گنج و مال	نصرت از وی خواه نی از عم و خال

عاقبت زاینہا بخواہی ماندن ہین کرا خواہی در آندم خواندن

این دم او را خوان و باقی را بمان

تا تو باشی وارثِ ملکِ جہان

دوسرے اور تیسرے شعر کا تعلق مثنوی کے دفتر دوم سے ہے۔ اس دفتر میں ایک جگہ ایک شخص کی داستان بیان کی گئی ہے جو ایک گھڑسوار بزرگ کو روک کر اس سے کچھ راز دل کہنا چاہتا ہے۔ سوار اس سے کہتا ہے کہ میاں جلدی بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتے ہو، میرا گھوڑا بڑا تند خو ہے۔ کہیں تم پر دولتی نہ جھاڑ دے۔ سائل جان جاتا ہے کہ اس شخص سے دل کی بات نہ کہی جا سکے گی۔ لہذا اصل بات کہنے کی بجائے اس سے کہتا ہے کہ میں اس گلی کی کسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خیال کے مطابق مجھ ایسے شخص کے لیے کیسی عورت مناسب رہے گی۔ وہ شخص تین قسم کی عورتوں کا نام لیتا اور کہتا ہے کہ ان میں سے دو تو باعثِ رنج ہیں، اور ایک گنج رواں ہے، مؤخر الذکر عورت کاملاً تمہاری ہوگی۔ جب کہ دوسری نیم تمہاری اور نیم جدا، اور تیسری قطعاً تمہاری نہ ہوگی۔ اب دفان ہو جاؤ کہیں گھوڑے کی دولتی سے عالم بالا کو نہ پہنچ جاؤ۔ اتنا کہہ کر وہ بزرگ گھوڑے سمیت بچوں کے جمگھٹے میں جا گھستے ہیں۔ لیکن سائل مسلسل ان کے تعاقب میں ہے اور آواز دے کر کہتا ہے کہ یہ جو کچھ آپ نے کہا اس کی تفسیر بھی بتاتے جائیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ پہلی عورت تو وہ ہے جو دوشیزہ ہے، اور کاملاً تمہاری رہے گی، دوسری بیوہ اور تیسری جو کسی طرح بھی تمہاری نہ رہ سکے گی وہ عورت جو پہلے خاوند سے اولاد رکھتی ہے، اس کی تمام تر توجہ اور محبت اس طرف ہوگی۔ لو اب بھاگ جاؤ ورنہ گھوڑے کا سُم تمہارے سر پر آیا بزرگ اتنا کہہ کر لڑکوں میں یہ جا وہ جا۔ لیکن سائل ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا پیچھے سے پھر پکارتا ہے کہ میرے صرف ایک سوال کا جواب دیتے جائیں اور وہ یہ کہ آپ اس قدر صاحب عقل و دانش ہیں پھر آپ کا یہ لڑکوں بچوں میں کھیلنا کودنا کیسا؟

وہ صاحب جواب میں کہتے ہیں کہ یہ او باش (اہل شہر) مجھے قاضی شہر بنانا چاہتے ہیں، میں نے بچنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں تجھ ایسا فرزانہ وعاقل ملنا محال ہو ان کے اس شدید اصرار نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے خود کو بظاہر شوریدہ و دیوانہ بنا لیا ہے، لیکن بباطن وہی کچھ ہوں جو ہوں، میری عقل خزانہ ہے اور میں ویرانہ ہوں۔ اگر اپنا خزانہ ظاہر کر دوں تو میں دیوانہ ٹھہرا۔ دراصل دیوانہ وہ ہے جو دیوانہ نہیں ہے۔۔۔۔ اس کے بعد وہ بزرگ اپنی عقل کو عرض کی بجائے جوہر قرار دیتے ہیں۔ یہاں علم تقلیدی و تعلیمی کا ذکر کر کے دنیوی علم کے طالب کو چوہے کی مانند قرار دیا گیا ہے جو زمین میں جگہ جگہ سوراخ کرتا رہتا ہو اور جب اسے روشنی نظر آتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے، یہی کچھ حال غافل کا ہے، جو انوار خدا سے چھپتا ہوا جگہ جگہ سوراخ کر رہا ہے، دنیوی علم کا طالب گویا ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر اگر اسے صحیح عقل کے پر عطا کر دے تو وہ چوہے پن سے ہٹ کر پرندوں کی طرح بلندیوں پر اڑنے لگے۔ بصورت دیگر اس کے لیے صرف مایوسی و محرومی ہی ہے آگے چل کر مولانا اس ظاہری علم و گفتار کو بے جان اور خریداروں کا متلاشی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ علم، بحث مباحثے کے لئے تو بڑی کام کی چیز ہے لیکن جب اس کا کوئی خریدار نہ ہو تو یہ اپنی موت آپ ہی مر جاتا ہے۔ جب کہ علم باطنی (روحانیت و معنویت) کا خریدار خود اللہ ہے جو ایسے علم والے کو اوپر طلب کرتا ہے کہ آؤ اللہ اسے خریدتا ہے،، وہ کہتے ہیں کہ صاحب علم باطنی کا خون بہا، جمال ذوالجلال ہے، اور وہ اپنا خون بہا کھاتا ہے کہ یہ کسب حلال ہے، عام انسان اس علم کے خریدار نہیں ہو سکتے۔ لہذا مولانا انھیں خریداران مفلس قرار دیکر ان سے پہلو تہی کرنے کو کہتے ہیں، کیونکہ ایک مشت گل کیا خریداری کر سکتی ہے، یہاں مولانا لفظ گل سے استفادہ کرتے ہوئے اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ گل نہ خرید و [illegible]

گل یعنی کیچڑ، نہ کھاؤ اور گِل کی تلاش نہ کرو کیونکہ گِل خوار ہمیشہ زرد رو رہتا ہے، پھر مولانا باطن کی طرف توجہ کرنے کا درس دیتے ہیں کہ اہل دل (صاحب بصیرت و باطن) ہمیشہ جوان اور تجلی یزدی سے اس کا چہرہ روشن رہتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ طالب دل بن تاکہ تو ہمیشہ گُل کی طرح شاداب و خنداں رہے، مولانا ایسے دل کو دل ہی نہیں تسلیم کرتے جو مطلوب گِل ہو۔۔۔۔ اس کے بعد مولانا بڑے ہی پُرسوز و پُر تاثیر لہجے میں لطف و بخشش ربانی کے طالب ہوتے ہوئے رب العزت سے دستگیری کرنے اور خطاؤں سے عفو و درگذر فرمانے اور نفس پلید کے شر سے محفوظ رکھنے کی دعا کرتے ہیں، آگے چل کر بھی مولانا اسی سوز و گداز میں ڈوب کر حضور حق اپنے عجز و بیچارگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے فضل و کرم کے خواہاں ہوتے ہیں، یہ دعائیہ اشعار کچھ اس قدر تاثیر کے حامل ہیں کہ قاری پر رقت اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ دعا دل کی انتہائی گہرائیوں سے نکلی ہے۔

علم گفتاری کہ آن بیجان بود — عاشق روی خریداران بود
گرچہ باشد وقت بحث این علم زفت — چون خریدارش نباشد مرد و رفت
مشتری من خدایست و مرا — میکشد بالا کہ اللہ اشتریٰ[1]
خونبہای من جمال ذوالجلال — خون بہای خود خورم کسب حلال
این خریداران مفلس را بہل — چہ خریداری کنند یک مشت گِل
گِل مخور گِل را مخر گِل را مجو — زانکہ گِل خوار است دایم زرد رو
دل بجو تا دائما باشی جوان — از تجلی چہرہ ات چون ارغوان

[1] سورۃ التوبہ آیہ ۱۱۱۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔۔۔۔

طالب دل باش و تا باشی چو دل — تا شوی شادان و خندان همچو گل
دل نباشد آنکه مطلوب گل است — این سخن را روی با صاحبدل است
یارب این بخشش نه حد کار ماست — لطف تو لطف خفی را خود سزاست
دستگیر از دست ما ما را بخر — پرده را بردار و پردهٔ ما مدر
باز خر ما را ازین نفس پلید — کاردش تا استخوان ما رسید
از چو ما بیچارگان این بند سخت — که گشاید جز تو ای سلطان بخت
این چنین قفل گران را ای ودود — که تواند جز که فضل تو گشود
ما ز خود سوی تو گردانیم سر — چون تویی از ما به ما نزدیکتر[1]
با چنین نزدیکی دوریم دور — در چنین تاریکی بفرست نور

مثنوی مسافر میں مذکورہ چوتھا شعر مثنوی رومی کے چھٹے دفتر سے ہے۔ مولانا نے ایک غلام کی کہانی بیان کی ہے جو اپنے طور پر اپنے آقا کی لڑکی کا طلبگار ہے۔ لڑکی کی شادی کسی امیرزادے سے ہو جاتی ہے۔ یہ بات غلام کے لئے انتہائی صدمے کا باعث بنتی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے، کسی کو اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا، اور نہ اسے کہنے کا یارا۔ آخر اس کی مالکہ اپنے شوہر کے ایما پر پیار محبت سے اس سے راز اگلوا لیتی ہے، جب وہ کہتا ہے کہ میرے مالک کی بیٹی ہو اور بیاہی کسی اور سے جائے تو مالکہ طیش میں آجاتی ہے، لیکن اس کا خاوند اسے صبر کی تلقین کرتا اور کہتا ہے کہ میں خود ہی اسے بغیر کسی ڈانٹ ڈپٹ کے تدبیر کے ساتھ اس طمع سے باز کر لونگا۔ اس پر وہ عورت لہجہ بدل کر اس سے کہتی ہے، ہمیں تمہاری اس خواہش کا علم نہ تھا۔ بہرحال اب تم مطمئن رہو لڑکی کی شادی

---

[1] سورۂ ق، آیہ ۱۶۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے جی میں جو خیالات گزرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ۔

تھی سے ہوگی۔ غلام خوش ہو جاتا ہے اور اس کی بیماری جاتی رہتی ہے۔ چند دنوں کے بعد شادی کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے، شادی کے روز اچھی خاصی دعوت برپا ہوتی، اور خوب ڈھولکی بجتی ہے، رات ہوتی ہے تو آقا بڑی چالاکی سے کسی بٹے کٹے آدمی کو زیورات سے آراستہ کر کے ہاتھوں کو مہندی لگا حجلۂ عروسی میں بٹھا دیتا ہے، یہاں مولانا نے بڑے مزے کی بات کہی ہے کہتے ہیں مالک نے غلام کو مرغی دکھا کر مرغابیش کر دیا، اب جو غلام خوشی خوشی حجلۂ عروسی میں پہنچا تو لینے کے دینے پڑ گئے، اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا لیکن باہر ڈھولک اور مہمانوں کا شور، کون اس کی داد فریاد سنتا۔ صبح تک غریب کی وہ درگت بنی کہ الامان والحفیظ۔۔۔۔ دوسرے دن صبح رسم کے مطابق طاس وغیرہ اس کے پاس لائے گئے تاکہ وہ حمام سے ہو آئے۔ وہ شامت کا مارا بھنا جالوں حمام گیا، واپس آیا تو کف افسوس ملتا ہوا جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو مذکورہ لڑکی دلہن بنی پاس آ بیٹھی، ماں بھی نگہبانی کی خاطر قریب ہی بیٹھ گئی تاکہ غلام کوئی حرکت نہ کر بیٹھے۔ لیکن غلام کی جو بری حالت ہو چکی تھی اس کے بعد اس میں اتنی سکت کہاں، گھور کر لڑکی کی طرف دیکھتے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا، خدا نہ کرے تجھے ایسی بد فعال سے کسی کو سابقہ پڑے کہ صبح کو تو تیرا چہرہ تاتاری حسینوں کی مانند ہو اور وقت شب تو۔۔۔۔۔۔ توبہ توبہ۔

اس حکایت سے مولانا کا مقصود یہ ہے کہ ہر انسان اس غلام کی طرح مبتلائے حرص و آز اس دنیا کی تمام نعمتیں آزمائش سے پہلے اسے اسی طرح حسین نظر آتی ہیں، یہ دنیا اور اس کی نعمتیں پیاسے کو دور سے پانی دکھائی دیتی ہیں، جب کہ ان کی حقیقت سراب کی سی ہے۔ یہ جہان درحقیقت ایک انتہائی چاپلوس اور گندی کھوسٹ بڑھیا ہے، جو خود کو نو عروس کی سی مانند ظاہر کرتی ہے۔ یہاں مولانا تلقین کرتے ہیں کہ اس عروس کے سرخ گالوں پر مت جاؤ اور اس کے تہمد آلود ڈنک سے بچو، بصورت دیگر خوشیاں مناتے مناتے کہیں اس غلام

ساشیہ 41 82286 کلام اقبال
7.6.82

ع مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤ، صبر اختیار کرو کہ یہی آسایش و مسرت کی کنجی ہے، اس دنیا
کو ظاہر اور نمایاں جانو۔ مولانا دنیا کی انہی ظاہری خوبیوں لیکن باطنی خرابیوں کا ذکر
ہوئے یہاں کی سرداری، بادشاہی و عظمت کو درد و تعب اور اذیت و مرگ سے تعبیر کرتے
اور اس قسم کی زندگی کو مُردوں کی سی زندگی قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے اور مردانِ خدا کی سی
بسر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہر دو زندگیوں کا مقابلہ کرکے مؤخر الذکر زندگی
مل و برتر بتایا گیا ہے، دوسری یعنی دنیا پرست زندگی مثل جنازے کے ہے، جسے لوگ کندھوں
لے چلتے ہیں اور یہ تابوت لوگوں پر بوجھ ہوتا ہے،.... بہتر یہی ہے کہ اپنا بوجھ کسی دوسرے پر ڈالنے
کے اپنے آپ پر ڈالا جائے اور اس دنیا کی سرداری کے پیچھے بھاگنے کی بجائے درویشی اور خدا کی
اختیار کی جائے،........

ہمچنیں جملہ نعیم این جہان — بس خوشست از دور پیش از امتحان
می نماید در نظر از دور آب — چون روی نزدیک آن باشد سراب
گندہ پیر است او و از بس چاپلوس — خویش را جلوہ دہد چون نو عروس
ہین مشو مغرور آن گلگونہ اش — نیش نوش آلودۂ او در اچش
تا نیفتی چون فرج اندر حرج — صبر کن کالصبر مفتاح الفرج
آشکارا دانہ پنہان دام او — خوش نماید ز او لت انعام او
چون بپیوستی بدام ای ہوشیار — چند نالی در ندامت زار زار
نام میری و وزیری و شہی — نیست الا درد و مرگ و جان دہی
بندہ باش و بر زمین رو چون سمند — چون جنازہ نہ کہ بر گردن نہند
جملہ را حمال خود خواہد کفور — بار مردم گشتہ چون اہلِ قبور

برجنازہ ہر کہ را بینی بخواب | فارس منصب شود عالی رکاب
زآنکہ آن تابوت بر خلقت بار | بار بر خلقان نہاد این کبار
بار خود برکس منہ بر خویش نہ | سروری را کم طلب درویش بہ

مثنوی پس چہ باید کرد ... کی تمہید میں حکیم الامت، مرشد رومی کو دانائے اسرار فرنگ قرار دے کر ان سے درخواست کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے مانند ہر بتخانہ کہن کو منہدم کر دیں۔ اس کے بعد وہ رومی سے دین و سیاست کے معنی پوچھتے ہیں۔ اس حصے میں مولانائے روم کا یہ شعر آیا ہے۔

غم خور و نان غم افزایان مخور | زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر

مثنوی رومی کے دفتر سوم میں حضرت مریمؑ کے غسل اور اس موقع پر حضرت جبریلؑ کی آمد سے متعلق قرآنی قصہ بیان ہوا ہے۔ اس قصہ کے ساتھ ساتھ مولانا نکتے سے نکتہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں، شب کا ذکر آگیا ہے تو اس پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ رات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے کہ لوگ عالم خواب میں ہونے کے سبب کچھ دیر کے لیے حرص و آز سے محفوظ رہتے ہیں، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ غم کو بھی خوشی سمجھ کر تناول کرنا چاہیے، پھر بچکانہ خوشی سے بچنے کو کہا ہے کہ بچے کی تمامتر توجہ کھانے پینے کی طرف ہوتی ہے جب کہ دانشمند (اہل باطن و بصیرت) کو آخرت کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ بچے کو تو گدھے کا تھان پر کثرت سے گھاس نظر آتی ہے، لیکن عاقل جانتا ہے کہ آخر اسے قصاب کے ہاتھوں ختم ہونا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ جو علف قصاب کی طرف سے ملتی ہے وہ تلخ ہے، اس لئے کہ ادھر تو وہ گھاس ڈالتا ہے اور ادھر گھاس کھانے والے کے گوشت کے لئے ترازو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا تلقین کرتے ہیں کہ جاو حکمت سے کام لیتے ہوئے وہ علف

رزق کھاؤ جو رب قدوس نے محض اپنے فضل و کرم اور بخشش و عطا سے دیا ہے، بقول مولانا لوگوں نے حکمت کی بجائے اسے روٹی کا نام دے لیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس کے دئے ہوئے رزق سے کھاؤ۔ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے رزق حکمت بہتر ہے کہ وہ گلے میں اٹکتا نہیں۔ اگر یہ ظاہری دہان بند کر لیا جائے تو ایسا دہن کھل جاتا ہے جسے لقمہ ہائے راز میسر آتے ہیں۔ . . . جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مولانا جب کسی موضوع پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں تو ان پر کچھ ایسی کیفیت وارد ہوتی ہے کہ وہ اس موضوع کے دوران کسی خاص لفظ یا چیز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور پھر اسی لفظ یا چیز اور اس کے متعلقات پر پوری روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں، اور یوں بات سے بات نکلنے کا سلسلہ دور تک پھیلتا جاتا ہے، بعض مرتبہ تو وہ جلد ہی اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ لیکن کئی مرتبہ بہت دور جا کر انہیں اصل موضوع کی طرف لوٹنے کا خیال آتا ہے، چنانچہ اس حصے میں بیان تو حضرت مریمؑ کی داستان ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ باطن کی طرف توجہ اور اس کی پرورش و تربیت کرنے کا درس بھی ہے، اور چونکہ اس نکتہ کے بیان میں کھانے کا ذکر آگیا تھا۔ اس لئے اب مولانا کھانے پینے اور اس کے متعلقات کا ذکر کر کے اپنے نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگر دیو نفس کے دودھ سے منہ موڑ لیا جائے تو اس دودھ چھڑانے کے عوض بڑی بڑی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اس کے بعد وہ خود کو نیم خام کہہ کر اپنی ان باتوں کو نیم پختہ[1] قرار دیتے اور سنائیؒ کی مثنوی الٰہی نامہ[2] کے حوالے سے

---

[1] مولانا نے لفظ ترک جوشی استعمال کیا ہے، یہ دراصل کنایہ ہے نیم خام پکانے سے، کہتے ہیں کہ ترک گوشت کو پوری طرح نہیں پکاتے اور وہ پکا، پنے دیتے ہیں اس لیے کہ ان کے مطابق پورا پکانے سے گوشت میں وہ طاقت نہیں رہتی۔ مثنوی شریف (کانپور) دفتر سوم، حاشیہ ص ۴۰ [2] مشہور صوفی شاعر حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی کی مشہور مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ کا دوسرا نام (تاریخ ادبیات در ایران جلد ۲ ص ۵۶۱)

کہتے ہیں کہ غم کھا لو لیکن غم بڑھانے والوں کی روٹی نہ کھانا، اس لئے کہ عاقل (صاحب باطن و معنویت) کو غم ہی عزیز ہے اور میٹھی چیزوں سے تو بچوں یعنی نادانوں کو رغبت ہوتی ہے پھر مولانا قندِ مسرت (حقیقی خوشی) کو باغِ غم کا میوہ کہتے ہیں، اور ظاہری مسرت و شادمانی کو زخم قرار دے کر غم کو اس کا مرہم بتاتے، اور جہاں بھی یہ غم ملے اسے سینے سے لگانے کا درس دیتے ہیں کہ اس سے انسان صاحبِ عظمت بنتا ہے۔ ان کے مطابق اہل معنی اور عشاق، انگور کے اندر ہے کو اور "معدوم" سے "شے" کو دیکھ لیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو در وی بسط بیں — تازہ باش و چین میفگن بر جبین
کودکان خندان و دانایان ترش — غم جگر را باشد و شادی ز شش
چشمِ کودک ہمچو خر در آخور است — چشمِ عاقل در حسابِ آخر است
او در آخور چرب می بیند علف — وین ز قصابِ آخرش بیند تلف
آن علف تلخست کان قصاب داد — بہرِ لحمِ ما ترازوئی نہاد
رو ز حکمت خور علف کان را خدا — بی عوض دادہ است واز محض عطا
رزقِ حکمت بہ بود در مرتبت — کان گلوگیرت نگردد عاقبت
این دہان بستی دہانی باز شد — کو خورندۂ لقمہ ہای راز شد
گر ز شیرِ دیوتن را وابری — در فطامِ او بسی حلوا خوری
ترک جوشی کردہ ام من نیم خام — از حکیمِ غزنوی بشنو تمام
در الٰہی نامہ گوید شرحِ این — آن حکیمِ غیب و فخر العارفین
غم خور و نانِ غم افزایان مخور — زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر
قندِ شادی میوۂ باغِ غم است — این فرح زخمست و آن غم مرہمست

غم چو بینی در کنارش کش بعشق | از سر ربوہ نظر کن در دمشق
عاقل از انگور، می بیند ہمی | عاشق از معدوم، شی بیند ہمی

اقبال کی اسی مثنوی میں "در اسرار شریعت" کے عنوان کے تحت دولت کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے سرمایہ داری اور سرمایہ دار کی سفاکانہ روش اور گھناؤنے کردار کی مذمت کی گئی ہے۔ اس حصے میں مولانا کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ ہوا ہے۔

مال را اگر بہر دیں باشی حمول | نعم مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ

اس شعر کا تعلق مثنوی رومی کے دفتر اول میں شیر اور جنگلی جانوروں کی داستان سے ہے۔ جانور شیر سے بچنے کے لیے اسے توکل و قناعت کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں، لیکن شیر ان کے برعکس، جد و جہد کا قائل ہے۔ نتیجۃً دونوں طرف سے اپنے اپنے نظریات پر زور دیا جاتا ہے۔ جس حصے میں یہ شعر آیا ہے، اس میں شیر جہد کو توکل پر ترجیح دیتا اور اس کے فوائد بیان کرتا ہے، وہ دلائل کے طور پر انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی جد و جہد اور ابرار و مومنین کے جہاد کا ذکر چھیڑتا اور بتاتا ہے کہ کس طرح انھوں نے دنیا کی صعوبتیں برداشت کیں، ان کی تمام تدابیر کثافت و آلودگی سے پاک تھیں، انھوں نے آسمانوں پر کمندیں ڈالیں اور ان کے نقش دکھی، ہیں بھی افزایش کی شان تھی، مولانا یہاں اسی حوالے سے جد و جہد اور عمل پیہم کا درس دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قضا سے پنجہ آزمائی کو جہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا، بلکہ ایمان و طاعت کی راہ اختیار کرنا جہاد ہے۔ وہ بڑے دعوے سے کہتے ہیں کہ اس راہ میں کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ طالب دنیا کے لیے آخر خرابی و تباہی اور جویائے عقبیٰ کے واسطے راحت و خوشحالی جاوید ہے، دنیوی شان و شوکت کی خاطر کیے جانے والے حیلے اور سوچی جانے والی تدابیر آخر بیکار ثابت ہوتی ہیں، ہاں اس دنیا سے خود کو

دور رکھنے کی تدبیریں نتیجہ خیز اور بار آور ٹھہرتی ہیں، یہاں مولانا دنیا کو زنداں قرار دے کر اس سے جلد تر چھٹکارا پانے کو کہتے ہیں، ان کے بقول اس مال و دولت یا فرزند و زن کا نام دنیا نہیں، بلکہ خدا سے غافل ہونا دنیا ہے، چنانچہ جو کوئی دین کی خاطر مال سے استفادہ کرتا ہے، اس کا مال، مالِ صالح ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ مالِ صالح نعمت ہے، اس سے ہٹ کر مال کا استعمال گویا وبال ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ پانی کشتی کے اندر ہو تو اس کی تباہی کا باعث، لیکن کشتی سے باہر یہی پانی اس کی تقویت و روانی کا سبب بنتا ہے، سو جس نے دنیوی مال و ملک سے توجہ ہٹالی اس نے سلیمان ہوتے ہوئے بھی خود کو مسکین و درویش ہی کہا، اس نکتہ کی وضاحت مولانا بند کوزہ کی تمثیل سے کرتے ہیں جو ڈوبنے کی بجائے پانی پر تیرتا رہتا ہے، اس کی وجہ اس کے دل کا باد سے پُر ہونا ہے۔ اسی طرح جب انسان کا باطن بادِ درویشی سے پُر ہوگا تو وہ آبِ جہاں پر برقرار و ساکن رہے گا، پانی سے ڈوب نہیں سکتا کہ اس کا دل نغمۂ الٰہی سے پُر اور شاد ہوتا ہے۔ پھر یہ تمام دنیا اس کی مِلک و سلطنت ہی کیوں نہ ہو اس کی نظروں میں ہیچ و بے وقعت ٹھہرتی ہے، اس کے بعد مولانا دہانِ دل کو علمِ الٰہی کی باد سے پُر کر کے اسے کوزے کی طرح بند کرنے اور اس پر مُہر لگا دینے کو کہتے ہیں کہ یہی "حق" ہے اور حق ہی درحقیقت درد و دوا اور بعد سب کچھ ہے، جب کہ منکر کی تمام تر جد و جہد حق کے خلاف ہوتی ہے، یہاں مولانا پھر جہدِ حق کی تلقین کرتے ہیں۔

کافرم من گر زیان کردہ است کس — در رہِ ایمان و طاعت یک نفس
سر شکستہ نیست این سر را مبند — یک دو روزی جہد کن باقی بخند
بد محالی جست کو دنیا بجست — نیک حالی جست کو عقبیٰ بجست
مکرہا در کسب دنیا بارد است — مکرہا در ترک دنیا وارد است

مگر آں باشد کہ زنداں حفرہ کرد — آنکہ حفرہ بست آں کاریست سرد

ایں جہاں زندان و ما زندانیان — حفرہ کن زندان و خود را وارہان

چیست دنیا از خدا غافل بدن — نی قماش و نقرہ و فرزند و زن

مال را کز بہر دیں باشی حمول — نعمَ مالٌ صالحٌ گفت آں رسولؐ

آب در کشتی ہلاک کشتی است — آب در بیرونِ کشتی پشتی است

چونکہ مال و ملک را از دل براند — زاں سلیمان خویش جز مسکیں نخواند

کوزۂ سربستہ اندر آب زفت — از دلِ پُر باد فوقِ آب رفت

باد درویشی چوں در باطن بود — بر سرِ آبِ جہاں ساکن بود

آب نتواند مر او را غوطہ داد — کش دل از نفخِ الٰہی گشت شاد

گرچہ ایں جملہ جہاں ملکِ وی است — ملک در چشمِ دلِ او "لا شئے" است

پس دہانِ دل ببند و مہر کن — پر کنش از بادِ کبر من لدنٌ

جہد حقست و دوا حقست و درد — منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

کسب کن سعی نما و جہد کن — تا بدانی سرِّ علمِ من لدنٌ

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہی کے آخری حصے "در حضور رسالتمآبؐ" میں حکیم الامت لکھتے ہیں کہ ۳ راپریل ۱۹۳۶ء کو میں بھوپال میں مقیم تھا کہ رات سید احمد خاںؒ رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا، انھوں نے فرمایا کہ اپنی علالت کے بارے میں حضور رسالتمآبؐ کے حضور عرض کر...... چنانچہ اس حصے میں علامہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے خطاب ہے، اس کے آخر میں اپنی بیماری و ناتوانی کا تذکرہ کیا ہے، اس حصے کے آخر میں مولانائے روم کا یہ شعر آیا ہے ؎

خود بدانی قدرِ تن از جان بود قدرِ جان از پرتوِ جاناں بود[1]

مثنوی رومی کے تیسرے دفتر میں عہد حضرت داؤدؑ کے ایک شخص کی داستان بیان ہوئی ہے، جو شب و روز خدا کے حضور، بغیر کسی محنت کے روزیٔ حلال کی دعا، کیا کرتا تھا، یہ داستان وقفوں کے ساتھ بیان ہونے کے سبب خاصی دور جا کر ختم ہوئی ہے، مذکورہ شخص بڑے الحاح کے ساتھ اور مسلسل اس قسم کی دعا، کرتا ہے جو آخر قبول ہو جاتی ہے، چنانچہ ایک روز ایک گائے اس کے گھر میں آ گھستی ہے، وہ فوراً اسے ذبح کر کے قصاب کے پاس پہونچتا ہے تاکہ وہ اس کی کھال اتار دے، اتنے میں گائے کا مالک اسے آ پکڑتا ہے کہ کس بنا پر تو نے میری گائے ذبح کر ڈالی، وہ اپنی دعا، اور اس کی قبولیت کا ذکر کرتا ہے جس پر گائے کا مالک اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالتا ہے، مالک اس سے اس ضمن میں کوئی ٹھوس دلیل مانگتا ہے، اور وہ دعا، کے سلسلہ میں اپنے خون جگر کھانے اور اس کی قبولیت پر اصرار کرتا ہے، مالک

---

[1] یہ شعر مثنوی کے مختلف نسخوں میں معمولی تغیر کے ساتھ اس طرح آیا ہے: ہمچناں کہ قدر تن از جان بود ..... الخ (ملاحظہ ہو مثنوی شریف (کانپور) دفتر سوم ص ۳۰۶، کتاب مثنوی (ایران) ص ۲۶۵، مثنوی معنوی (ایران) ص ۵۰۰) اس قسم کے چند اشعار جن کا علامہ نے ادنیٰ تغیر حوالہ دیا ہے، شاید مثنوی کے کسی خاص نسخے سے ماخوذ ہوں لیکن خیال اغلب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے یادداشت سے کام لیا ہوگا، جس کے سبب بعض اشعار کا ایک آدھ لفظ بدل گیا یا کسی شعر کا کوئی ٹکڑا آگے پیچھے ہو گیا (اس کی کچھ امثال پہلے گذر چکی ہیں اور ایک آدھ مثال آگے آئے گی) ورنہ برصغیر اور ایران میں شایع شدہ مثنوی کے بیشتر نسخوں میں ایسے اشعار کا متن اور ترتیب الفاظ یکساں ہے۔ اس قسم کے بدلے گئے، اشعار کی تلاش میں، جیسا کہ پہلے عرض ہوا، ہرچند خاصی محنت و وقت سے کام لیا گیا، پھر بھی علامہ کے سب مجموعہ ہائے کلام میں آمدہ مثنوی کے اشعار میں سے دو یا تین اشعار مل نہ سکے، جن کا اپنی اپنی جگہ پر ذکر کر دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی صاحب راہنمائی فرما دیں تو ممنون ہوں گا۔

لوگوں کو اکٹھا کر لیتا اور اپنا معاملہ پیش کرتا ہے کہ اگر دعا ہی کے زور پر یہ کچھ ہونے لگتا تو ہر کوئی دوسروں کی جائداد ہتھیا لیتا اور ایک ازلی فقیر محتشم و مالدار بن جاتا، اس پر لوگ ملزم کو گائے واپس کرنے یا قید میں چلنے کو کہتے ہیں۔ دعا کنندہ پھر اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہے کہ مجھے رسوا نہ کیجیو، مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس پہونچتا ہے، آپؑ مدعا علیہ (دعا کنندہ) سے گائے ذبح کرنے کی وجہ پوچھتے ہیں، وہ اپنے سات سال تک مسلسل دعا مانگنے اور اس کی قبولیت کا ماجرا بیان کرتا ہے حضرت داؤدؑ بھی مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیتے ہیں، مدعا علیہ اللہ کے حضور پھر اسی گریہ و الحاح سے کام لیتا ہے، اسی اثناء میں خدا کی جانب سے حضرت داؤدؑ کو سزا و انتقام کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے جس پر آپؑ مدعی کو اس سے درگذر کرنے کو کہتے ہیں، مدعی اس فیصلہ کو ناانصافی اور ظلم و ستم پر محمول کرتا اور آپ سے کہتا ہے کہ آپ مجھ پر ایسا ظلم نہ کریں۔ اب حضرت داؤدؑ اس سے فرماتے ہیں کہ تم اپنا سارا مال مدعا علیہ کو دے دو۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف مدعی واویلا کرنے لگتا ہے بلکہ لوگ بھی آپ پر تنقید شروع کر دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ آپؑ کے "ضمیر کار" سے غافل ہوتے ہیں، آخر آپؑ رازسے پردہ اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، آپؑ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مدعی نے ایک موقع پر اپنے آقا کو قتل کر کے فلاں درخت کے نیچے دبا دیا تھا، اور اب یہ مقتول کا مال دبائے ہوئے ہے، اور مدعا علیہ اس مقتول کا لڑکا ہے جو اس وقت بچہ تھا، اب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم کے سبب اس قاتل کا یہ جرم چھپا رکھا تھا، لیکن اس نے ناشکری کی، یعنی اس نے بعد میں اپنے مقتول مالک کے بال بچوں کی خبر گیری نہ کی اور نہ کبھی بے نواؤں کو کھانا کھلایا اور ایک گائے کی خاطر مالک کے بیٹے کو زمین پر پٹخا اور اذیت دی، اور یوں وہ اپنے گناہوں سے پردہ اٹھانے کا خود ہی ذمہ دار ٹھہرا، اللہ تو بہرحال اس کے جرم پر پردہ ڈالے ہوئے تھا، حضرت داؤدؑ کے اس بیان کے بعد لوگ مذکورہ درخت کے قریب پہونچتے ہیں اور وہی کچھ دیکھتے ہیں جو حضرت داؤدؑ نے بیان کیا تھا

وہ آپ سے اپنی تنقید کی معذرت کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت داؤدؑ مدعی (گائے کے مالک) کو اسی تلوار سے جس سے اس نے مدعا علیہ کے باپ (اپنے مالک) کو قتل کیا ہوتا ہے، قصاص کے طور پر قتل کرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ کہانی یہاں اس نتیجہ کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے کہ:

کشتہ شد ظالم، جہانے زندہ شد　　　ہر یکے از نو خدا را بندہ شد

اب مولانا نفس انسانی کو اسی قاتلِ آقا سے اور عقل کو مدعا علیہ (گائے ذبح کرنے والے) سے تشبیہ دیتے ہیں، اور حضرت داؤدؑ ان کے نزدیک "حق" کی علامت ہیں، یا شیخ کی، جو نائبِ حق ہے، جس کی قوت و یاری سے ظالم کو مارا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مولانا ایک مثال لائے ہیں جس میں "سبب" پر بحث کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام قطعِ اسباب کے لیے آئے اور انھوں نے اپنے معجزات سے دنیا پر اپنے جھنڈے گاڑ دیے، اور قرآن مجید بھی قطعِ سبب ہی سے بھرا پڑا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جسے عقل نہیں، بلکہ بندگی حل کر سکتی ہے۔ اتنا کہہ کر مولانا عقل پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فلسفی معقولات کا قیدی ہے، جب کہ صاحبِ معنیٰ و باطن "عقلِ عقل" کا شاہسوار ہے۔ انسان کی عقلِ عقل مغز ہے، اور یہ ظاہری عقل و فلسفہ چھلکا، اور اس بصیرت و عقلِ باطن سے عاری لوگ جو گویا حیوان ہیں، مغز کی بجائے چھلکے اور بھُس کے متلاشی رہتے ہیں۔ لیکن طالبانِ مغز کو چھلکے سے نفرت اور مغزِ نغز ان کے لیے حلال ہے۔ اگر سطحی اور ظاہری عقل، دلائل کے انبار سے لدی ہوئی ہے تو عقلِ کل بغیر ایقان کے ایک قدم بھی نہیں اٹھاتی۔ ظاہری عقل اپنے دلائل سے مزید الجھنوں اور تاریکیوں کا سبب بنتی ہے جب کہ عقلِ باطن یا عشق چاند ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی طرح شفاف و روشن ہے۔ یہ عقل سیاہی سفیدی کے جھگڑوں سے فارغ اور اس کی چاندنی دل و جان کو منور کرتی ہے۔ یہ سیاہی اور سفیدی "قدر" کی بدولت ہے۔ چنانچہ یہ اسی قدر کے سبب ہے کہ شبِ قدر ستاروں کی مانند روشن و تاباں ہے، یہاں

پھر ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ تھیلی یا بٹوے کی قدر و قیمت اس میں پڑی ہوئی دولت کے باعث
اگر اس میں دولت نہ ہو تو وہ بے کار شے رہ جاتی ہے، اسی طرح جسم کی قدر و منزلت روح سے ہے
ں کی قدر و منزلت بھی تو محبوبِ حقیقی کے طفیل ہے، دوسرے لفظوں میں جسم بغیر روح کے بے کار چیز ہے'
وح اگر دنیوی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک اور صحیح معنوں میں معنویت و باطنیت کی حامل اور
حق ہے تو قابلِ قدر ہے، لہٰذا اگر جان پرتوِ حق کے بغیر زندہ رہنے والی ہوتی تو پھر کافروں کے
ے میں "میّتون" کیوں اترتی، یہاں مزید وضاحت کے لیے مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب
یہاتِ رومی سے کچھ اقتباس درج کرنا نامناسب نہ ہوگا:

"مولانا جس طرح ہستی میں بے شمار مدارج کے قائل ہیں اسی کے مطابق ان کے نزدیک عقل کے بھی مدارج ہیں، جماد و نباتات و حیوان بھی عقل سے معرا نہیں، ان سے بڑھ کر وہ عقل ہوتی ہے جس کو عام طور پر لوگ عقلِ انسانی کہتے ہیں، مگر مولانا کے نزدیک اس عقلِ انسانی میں بھی عقلِ حیوانی کی بہت سی آمیزش ہے، اسی لیے وہ زیادہ تر حیوانی خواہشات اور مادی ضرورتوں کے پورا کرنے کا آلہ بنی رہتی ہے' اس سے ذرا اوپر حکما یا فلاسفہ کی عقل ہے، جو منطق اور علت و معلول کے محدود قانون سے تمام حقائقِ حیات کا احاطہ کرنے کی مدعی ہے، یہ بھی ایک جزوی عقل ہے جسے حکما، عقلِ کلی سمجھ لیتے ہیں، اس سے اوپر عقلِ نبوی ہے جس کا اندازِ بصیرت اور اندازِ استدلال حکما، و متکلمین سے

سورۃ المومنون، آیہ ۱۲ - ۱۵ اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے بنایا، پھر ہم نے اس کو نطفہ سے
بنا کر ایک مدت معینہ تک ایک محفوظ مقام میں رکھا، پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے اس خون کے
ے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا، پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزا) کو ہڈیاں بنا دیا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت
ا دیا، پھر ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اس کو ایک دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنا دیا، سو کیسی بڑی شان ہے
اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے، پھر تم بعد اس (تمام قصۂ عجیبہ کے) ضرور ہی مرنے والے ہو۔

رنگ ہے، فلسفی کی عقل اور نبی کی عقل میں پوست و مغز کا فرق ہے، لیکن چونکہ فلسفیانہ عقل ابھی زیادہ بلند درجے کی عقل حیوانی ہی ہے اس لیے اس کا میلان بھی زیادہ تر مادی عالم ہی کی طرف ہوتا کیونکہ بقول مولانا حیوان سبزیوں اور پھلوں کے چھلکوں ہی کے طالب ہوتے ہیں، اور اگر مل جائیں تو انھی پر قناعت کر لیتے ہیں، وہ یہ نہیں سوچتے کہ جن پھلوں کے یہ چھلکے ہیں، ان کا مغز کیا تھا یہ مادی عقل عام انسانوں کے علاوہ فلاسفہ کے دست و پا بھی پکڑ لیتی ہے۔ مادی عقل سے اوپر جو عقل ہے مولانا اسے عقلِ عقل کہتے ہیں، اہلِ دل اس عقلِ عقل پر سوار ہوتے ہیں اور گرفتار نہیں ہوتے ..... عقلِ استدلالی تو دفتروں کے دفتر سیاہ کرتی ہے، پھر بھی لاکھوں دلائل میں سے یقین کی چمک پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس کے اندر عقلِ عقل ہے، اس کے لیے انفس و آفاق منور ہو جاتے ہیں ..... حقائقِ حیات کی نسبت انسان کا علم ترقی پذیر ہے، کسی ایک زمانہ میں زندگی بسر کرنے والی نسلیں یہ صلاحیت نہیں رکھتیں کہ ہر قسم کے حقائق ان پر منکشف ہو سکیں، ارتقائے حیات کے بعد اور تغیرِ احوال کے ساتھ بعض ایسی صداقتیں قابلِ قبول ہو جاتی ہیں جن کے لیے انسان پہلے زمانے میں تیار نہ تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عارفوں اور مفکروں کو چاہیے کہ تحریر و تقریر سے کچھ نہریں کھودتے رہیں حالانکہ وہ جانتے ہوں کہ یہ نہریں ایک مدت تک سوکھی رہیں گی اور ان میں پانی بہت بعد کے زمانہ میں آنے لگا، ہر قرن میں جو نئے مفکر اور نئے عارف پیدا ہوں گے ان کو ان کی کھودی ہوئی نہروں سے فائدہ پہنچے گا۔ آخر توریت و انجیل و زبور سے بھی تو صداقتِ قرآن کے لیے ثبوت مہیا ہوئے، اگر اس وقت نگار خانۂ چین نہیں بن سکتا تو جو نقش اس وقت تمہارے لیے ممکن ہیں، انھیں ہی جریدۂ عالم پر ثبت کر دو۔ بہ آور ہر چہ اندر سینہ داری .....[1]"

ہمچنیں ز آغازِ قرآں تا تمام　　رفضِ اسباب است و علت والسلام

---

[1] تلمیحاتِ رومی ص ۳۶۸ - ۳۷۰

کشت این نز عقل کار افزا شود — بندگی کن تا ترا پیدا شود
بند معقولات آمد فلسفی — شہسوار عقلِ عقل آمد صفی
عقل عقلت مغز و عقل تست پوست — معدهٔ حیوان ہمیشہ پوست جوست
مغز جوے از پوست دارد صد ملال — مغز نغزاں را حلال آمد حلال
چونکہ قشرِ عقل صد برہاں دہد — عقل کل کے گام بے ایقاں نہد
عقل دفترہا کند یکسر سیاہ — عقلِ عقل آفاق دارد پُر زماہ
از سیاہی وز سفیدی فارغ است — نور ماہش بر دل و جاں بازغ است
این سیاہ و آں سفید از قدر یافت — زاں شب قدر است کاختر وار تافت
قیمتِ ہمیان و کیسہ از زر است — بے زری ہمیان و کیسہ ابتر است
ہمچناں کہ قدرِ تن از جاں بود — قدر جاں از پرتو جاناں بود[۱]
گر بُدے جاں زندہ بے پرتو کنوں — ہیچ گفتے کافراں را "میتون"
(تم ضرور مرنے والے ہو)
ہین بگو کہ ناطقہ جو می کند — تا بقرنے بعد ما آبے رسد
گرچہ ہر قرنے سخن آرے بود — لیک گفتِ سابقاں یارے بود
نے کہ ہم تورات و انجیل و زبور — شد گواہ صدق قرآں اے شکور

---

[۱] اس سے ملتا جلتا مولانا کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو

آں چنانکہ پرتو جاں بر تن است — پرتو ابدال بر جانِ من است
(کتاب مثنوی .... ۱۲، ص ۱۰۹)

(باقی)

سیرتِ شامی

سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد

از

جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

علامہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی نویں / دسویں صدی ہجری کے مشہور مورخ، نامور محدث اور جلیل القدر سیرت نگار ہیں، وہ صالحیہ (دمشق) میں پیدا ہوئے، لیکن تعلیم و تربیت مصر میں ہوئی، بقول سید عبدالحی الکتانی وہ امام جلال الدین السیوطی کے نامور شاگرد تھے، عمر کا بیشتر حصہ برقوقیہ (صحراء قاہرہ) میں گذارا، اور وہیں ۹۴۲ھ / ۱۰۳۶ء میں آسودۂ خاک ہوئے (فہرس الفہارس، جلد دوم، ص ۳۹۲، مطبوعۂ فاس)۔

ابن العماد حنبلی نے علامہ شعرانی کی لواقح الانوار فی طبقات الاخیار کے حوالہ سے علامہ شمس الدین الصالحی کے حالات میں لکھا ہے "وہ صالح عالم تھے، مختلف علوم میں دسترس رکھتے تھے، انھوں نے عمر بھر شادی نہیں کی، وہ مہمان نواز، رعب دار، شیریں مقال اور شب زندہ دار تھے، کوئی عالم مرجاتا اور اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا تو ان کے وظائف مقرر کر دیتے تاآنکہ وہ کمانے کے قابل ہو جاتے، حکام اور ان کے اعوان و انصار کے عطیات قبول نہ کرتے، بلکہ ان کے ہاں کے پکے ہوئے کھانے سے بھی پرہیز کیا کرتے تھے، انھوں نے بے مثال طریقے سے سیرۃ النبی تالیف کی ہے اور لوگوں نے بڑے شوق سے اس کی نقول حاصل کی ہیں۔" (شذرات الذہب [illegible]، مطبوعۂ قاہرہ)

شمس الدین الصالحی کثیر التصانیف عالم تھے، بروکلمان نے ان کی گیارہ کتابوں کے نام لکھے ہیں (تاریخ ادب ۲: ۳۹۲ و تکملہ، ص ۲: ۵۰۴)۔ ان میں ممتاز ترین تصنیف "سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" ہے

لی ساری زندگی کا ماحصل اور تمام عمر کا سرمایہ ہے، انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"میں نے اس کتاب کو تین سو کتب کی مدد سے لکھا ہے اور اس کی تصنیف میں صحت و صواب کو مدنظر رکھا ہے۔ اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بحر فضائل کے چند قطرات کا ذکر آپ کی ولادت مبارکہ سے لے کر آپ کی وفات تک کیا ہے، اور اس میں آپ کے اعلام نبوت، شمائل، سیرت، افعال اور احوال اور انعامات الٰہی کا بیان بھی ہے، میں نے موضوع احادیث کے ذکر سے پرہیز کیا ہے، ہر باب کے خاتمہ پر مشکل اور نادر الفاظ کی شرح لکھی ہے اور متناقض احادیث کے درمیان توفیق و تطبیق دینے کی کوشش کی ہے"

اس کتاب کی تصنیف میں فاضل مصنف نے کتب حدیث اور شروح حدیث کے علاوہ سیرت ابن ہشام سے لے کر امام سیوطی کے زمانہ تک کی جملہ کتب سیرت کو پیش نظر رکھا ہے، اس طرح یہ کتاب سیرت مبارکہ کا ۃ المعارف بن گئی ہے، استناد اور کثرت معلومات کی وجہ سے یہ کتاب زمانۂ مابعد کے سیرت نگاروں کے لیے قیمتی ماخذ کا کام دیتی رہی ہے، اس سے استفادہ کرنے والوں میں حسین بن محمد الدیار البکری (م ۹۶۶ھ) مصنف تاریخ الخمیس، الشہاب الخفاجی (م ۱۰۶۹ھ) مصنف نسیم الریاض اور علامہ قسطلانی (م ۹۲۳ھ) ر الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ) شارح المواہب اللدنیہ قابل ذکر ہیں، جو السیرۃ الشامیہ کے نام سے اس کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔

کتاب کی غیر معمولی ضخامت اس کی اشاعت میں ہمیشہ حائل رہی ہے، اب مصر کی مشہور علمی مجلس المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کی چار ضخیم جلدیں شائع کی ان میں سے ہر جلد بڑے سائز کے کم و بیش چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ان کے اشمولات کا مختصر سا تعارف

مندرجہ ذیل سطور میں کیا جاتا ہے۔

پہلی جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض فضائل، بنائے کعبہ، حرم مکہ، آپؐ کے آباء واجداد کے مفصل حالات اور آپ کی ولادت مبارکہ کا بیان ہے۔

باب ثالث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے مبارکہ کی تفصیل اور ان کی دلنشین لغوی تشریح ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات (ص ۵۰۰ تا ۶۶۰) تک چلی گئی ہے، اس ضمن میں تقریباً ایسے بیس اشخاص کی نشاندہی کی ہے جن کا نام جاہلیت اور صدر اسلام میں بھی محمدؐ تھا۔

دوسری جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل وفضائل، بعثت، نزول وحی، ہجرت حبشہ اور مختلف قبائل میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے ذکر پر مشتمل ہے۔

تیسری جلد کا پہلا باب معراج نبوی کے لیے وقف ہے، جو کتاب کا طویل ترین باب ہے اور تقریباً ڈھائی سو صفحات پر محیط ہے، باقی ابواب میں ہجرت مدینہ، اسمائے مدینہ، فضائل مدینہ اور سنہ ۱ھ وسنہ ۲ھ کے واقعات کا بیان ہے۔

چوتھی جلد میں غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے مفصل واقعات ہیں، ہر واقعہ کی مناسبت سے حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے قصائد بھی مذکور ہیں، اور ان کی لغوی تشریح سب پر مستزاد ہے۔

اس جلیل القدر کتاب کا یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے، مذکورۂ بالا مندرجات کے علاوہ تفسیر اور حدیث کے بہت سے ضمنی مباحث بھی آ گئے ہیں، غرضیکہ یہ کتاب تاریخ، سیرت، ادب اور لغت کا بیش بہا خزانہ ہے۔ کتاب کی تصحیح میں ایڈیٹر صاحب نے بڑی عرق ریزی کی ہے، قرآنی آیات، احادیث اور اشعار کی نہایت محنت سے تخریج کی ہے، متعلقہ اشخاص پر حواشی لکھے ہیں اور بعض ضعیف اور مشتبہ احادیث پر مفصل کلام کیا ہے، ان چار جلدوں میں سنہ ۵ھ تک کے واقعات آ گئے ہیں، باقی ماندہ چار یا پانچ جلدیں آئندہ برسوں میں شائع ہوں گی۔

امیر خسرو کی مشہور نعتیہ غزل

از

جناب شہاب سرمدی صاحب علی گڑھ

گذشتہ جنوری میں دہلی میں چودھویں صدی ہجری پر جو بین الاقوامی سمینار دہلی میں ہوا، اس موقع پر جناب شہاب سرمدی سے بڑی پُرکیف اور مخلصانہ ملاقاتیں سمینار کے اجلاسوں اور لودی ہوٹل کے اندر ہوتی رہیں، ذکر آیا کہ وہ نعتیہ غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

امیر خسرو کی ہے یا کسی اور خسرو کی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ امیر خسرو کے کسی دیوان میں نہیں، اس لیے انھی کی نہیں ہوسکتی ہے، جناب شہاب سرمدی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ یہ انہی کی ہے، وہ فن موسیقی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے انھوں نے باضابطہ موسیقی کے تال اور سُر کا مظاہرہ کرکے ثابت کیا کہ یہ امیر خسرو کے سوا کوئی اور کہنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا، انھوں نے جو تفصیلی گفتگو کی اس کو سن کر میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ یہ سب کچھ لکھ کر بھیج دیں، ذیل میں ان کی یہ تحریر شائع کی جارہی ہے، وہ اس وقت دہلی کے انڈین ہسٹاریکل ریسرچ کونسل کے فیلو ہیں، قیام علی گڑھ میں رہتا ہے، پرانی تہذیب اور شائستگی کے نمونہ ہیں، وطن الٰہ آباد ہے۔ "ص ع"

خسرو علیہ الرحمۃ کی جس غزل کا آپ نے ذکر فرمایا تھا اس کے سلسلہ میں ایک اور بات سمجھ میں آتی یا کہیے یاد آتی جو بنیادی شکل معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ عام معلومات کی بات ہے کہ ان کا کلام جتنا ترکیب میں

آسکا یا لایا گیا اس سے کچھ زیادہ یا اتنا ہی وہ کلام تھا، جو سیر و سینہ ہی رہا، چنانچہ :-

شعر راکر دم سے دفتر، بہ تحریر آمدی — علم موسیقی سے دیگر بود اگر باور بود

یہ "گر باور بود" توجہ طلب ہے، جو نہ جو خسرو کو یہ اندیشہ تھا کہ شنیدہ اور دیدہ میں دیدہ بازی لے جائے گا، پھر بھی جو مجھے سمجھیں گے وہ میرے اس کہے کو بھی سمجھیں گے، وہ اور اسے باور کریں گے۔ اب ذرا غزل کی جانب تھوڑی دیر کے لیے پوری توجہ فرمائیے؛ مگر پہلے ایک دو حرف تمہیدی :

دیباچۂ **غرۃ الکمال** میں موصوف نے غزل کو ایک صنفِ پیش پا افتادہ تو خیر نہیں کہا، مگر کہتے کہتے رہ گئے، اس لیے کہ یہ انہی کا کہا ہے کہ آج کی دلی میں جسے دیکھیے وہ سات شعر موزوں کر لیتا ہے، اور بے نکیل اونٹ کی طرح بلبلاتا پھرتا ہے، اس کے بعد جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ان کے اسی دیوان میں ایک دو، دس، پانچ نہیں، سیکڑوں پوری کی پوری غزلیں شامل ہیں، ایسا کیوں ہوا، آپ ضرور جانتے ہوں گے، میں اب تک نہیں جان سکا مگر میرے لیے یہ قطعاً قرینِ قیاس ہے کہ اس کی ایک معتد بہ وجہ تھی، "لاابالی غزل" کا "مطرب و ساقی کی محفل" سے نکل کر خانقاہ پہنچنا اور خسرو ہی کے ہاتھوں اس کا متدین و معتبر ہو جانا تھا۔ خوش بختانہ اس قرینے کے حق میں دستاویزی شہادتیں وافی نہ بھی سہی، مگر کافی پھر بھی ہیں؛ چنانچہ میر خورد کی بزم کی محفل اور اس میں امیر خسرو نے شیخ اوحدی کی غزل پر یا اُن کے صاحبزادے امیر حاجی نے سعدی کی غزل پر جو ٹکڑے لگائے ہیں، کیا وہ ان کے کسی بھی دیوان میں اب تک مل سکے ؟ اس کی تصدیق ضروری ہے۔

اسی طرح ان سے منسوب یہ دوہا :

کھسرو رین سہاگ کی جو جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دو ہو بھئے اک رنگ

یہ دوہا بیک نظر ان کے اس شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے :

(تن میرو ۔ پیو کو) (دو ہو بھئے اک رنگ)
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ؛ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری[1]

[1] حاشیہ ص ۵۹ پر۔

پاکہیں ان کی ہوا ملا؟ اب تو خیر ملتا ہے، مگر عجب کی یہ بات ہے تب بھی یا اس کے فوراً بعد بھی اس کا ذکر
نہ کیا؟

اب آئیے غزل کی طرف:

نمی دانم چہ محفل بود شب جائے کہ من بودم

ب تک ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں مل سکی، مگر کیا صرف اتنا کہنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، کہ
ان کی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا نہ ممکن ہوگا، نہ مناسب، اس لیے کہ یہ امر مسلم ہے کہ خسرو نے
گفتہ "خود" دفتر کے دفتر "صرف لحن بندی اور سرود و سماع کے لیے تصنیف کیے تھے، اور اس لیے
تحریر میں لانا بھی ضروری نہ جاتا تھا، یا کم سے کم انھیں اپنے پاس لکھ کر محفوظ نہیں رکھا تھا، یہ غزل
اور یقیناً ادبی نہیں، قطعاً ایک غنائی تصنیف تھی، اسے بھی انھوں نے اپنے عندلیبانِ دہلی کے حوالہ
نے کے بعد بھلا دیا ہو تو کیا عجب!

ان سب کے علاوہ ایک بڑی میرے نزدیک اور میری ناچیز نظر میں ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ
زل سے خود ہی کیوں نہ پوچھ لیا جائے، کہ یہ ہے کس کی؟ آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی عالم آشکار
"یافتِ ہند" میں امیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا کچھ کلام جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے، اگر ان کا
، تب ہی کسی خسرو جیسے ہی کا ہو سکتا ہے، میری بھی یہی گزارش اس غزل کے بارے میں ہے، خاص کر
اپر کہ اس کا ہر مصرع یہ بتاتا ہے، کہ اسے جس نے نظم کیا ہے، اس کے فداداد حس و شعور کی گرفت میں
بحر و وزن ہی نہیں، لحن، ابعاد، ضرب، ایقاع کے تقاضے بھی تھے، چنانچہ آپ خسرو کی ایسی تمام
، بالخصوص اس غزل کی تقطیع کر دیکھیے، فارسی زبان کی بقول علامہ شبلی علیہ الرحمہ الفاظ کے معاملہ میں

یہ صفحہ ۵۹ ملاحظہ اس شعر کو بھی میں خسرو ہی کا سمجھتا آیا ہوں، درانحالیکہ مطبوعات میں ان کے نام سے نہیں
پ یقیناً جانتے ہوں گے کہ وہ ان کا نہیں تو کس کا ہے۔

تھی وہ مثنی، اس لیے مفردات کی جگہ مرکبات کی بھرمار کے باوجود ہر کن ایسا سمجھا اور سڈول ہوگا کہ اسے مُسر
ملکے کے سانچوں ڈھانچوں میں جس طرح چاہیے ڈھال لیجئے، ایک دلچسپ اور مفید پہلو اور ہے یعنی اردو
وفارسی لغات کے اختتامیوں کا ساکن، بلکہ کبھی کبھی ساکنین کی صورت میں ان زبانوں کی خصوصیات میں
شامل ہونا، موسیقی کے لیے یہی خصوصیت ایک بڑی قباحت بن جاتی ہے کہ اس یا ان غیر متحرک آواز یا آوازوں
کو نہ ابھارا جائے، تو بات نہیں بنتی، اور ابھارا جائے، تو کیسے. خسرو غزل و ترنم دونوں کے رسیا تھے،
انھوں نے صرف اپنے فطری سلیقہ سے اس مشکل کو جس طرح آسان کیا ہے، وہ ان ہی کے کہے کو جانچ پرکھ کر
سمجھا جا سکتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

اس کی تقطیع ہوگی،

خدا خود میر (ءِ) مجلس بود، دَ اندر لا مکاں خسرو

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

اضافت جو صوتی اعتبار سے ہمزہ ہوتی ہے، اسے کس طرح ایک رکن خفیف بنایا ہے.
دال کی آواز کو پیوستہ آواز ہمزہ سے ضم کر کے کیا خوبصورت کام لیا ہے، کہ ہر حرکت ایک دوسرے
میں پیوستہ ہوتی چلی جاتی ہے،

اب ذرا اس مصرع کو گیت کا ایک پد تصور فرمائیے، تو اس کے ارکان کی ماترک گنتی ہوگی،

مفاعیلن م فا عی لن

۷ ماترے = ۱ ۲ ۰ ۲ ۰ ۲ ، ۲

یعنی اسی سے اس غزل کی قدرتی لے قائم ہوتی ہے.
اسی لیے ماتروں کی کوئی تال چلے مثلاً مغلئی جسے بعد میں [illegible]

اس کے بول ہیں:

‖ دھن دھن تگ | دھن تگ | تن تن تگ ‖

اسی طرح تیورا ہے، مگر پشتو تو ذکر رہا بحر و وزن کے لحاظ سے ذکر وادر دونوں سے اقرب ہے۔

خود زبان پشتو بھی وہی ۶ ماتروں کی تال ہے اور اس کی چال ہے:

‖ دھین (دہیں) تگ | دھین ایں | دھا دھا ‖

(وقفہ)
اور ڈھولک کے بول ہیں، اور میں جانتا نہیں لیکن عجب نہیں یہی بول دف کے بھی رہے

یعنی:-

تْ ۱	کَ ۲	دِی ۳	نْ ۴	(وقفہ) (برام)	دھَا ۵	دھَا ۶	دِنْ ۷
م	فَا	عِی	لُن		وم	فاعی	لُن

یہ خاص عمل کی باتیں ہیں، اس لیے زیادہ تفصیل میں جانے سے جی ڈرتا ہے کہ مبادا آپ اکتا جائیں۔

آپ خسرو شناس ہیں، اور حق آشنا، ان تمام باتوں پر ایک بات اور اضافہ فرما لیجیے، اور وہ بات ہی نہیں بڑے کانٹے کی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان قومیں جیسے ایک آس کا شعر اور اس کے عملی عوامل اپنے ساتھ لائیں، ویسے ہی تال کا تصور بھی بصورت دائرہ لائیں، اس لیے جہاں سے نغمہ پر ختم یعنی مفاعیلن کا وزن قائم ہوا، تو وہی اساسی بیچ میں زحافات و متنوعات چاہے جیسے جتنے بھی آجائیں۔

اگر کبھی کسی قدر فرصت سے نیازمند حاصل ہو سکا تو اس غزل کو صرف Demonstrably عملی ثابت کرنے کے لیے مغلئی اور پشتو دونوں تالوں میں پیش کرنے کا شرف حاصل کروں گا۔

بہ افضل الرحمن۔

جیسے آپ کسی جا نکار قوال یا عطائی سے اس غزل کو سنیے آپ کو معاً محسوس ہی نہیں معلوم ہو جائے گا

کہ یہ گنگنانے کے لیے نہیں گانے کے لیے کہی گئی تھی، اور اس کا کہنے والا یقیناً جتنا بڑا شاعر تھا، اتنا ہی بڑا صاحبِ تصنیف ماہرِ موسیقی بھی تھا،

اس سلسلہ میں ایک ثبت بات اور: فارسی غزل ہمیشہ سے ایک غنائی صنفِ ادب رہی ہے، مگر اس کی غنائیت کتنوں سے نبھ پائی، ہمام و سعدی اس کے محسنین اولی رہے ہیں، حسن علا سجزی اور امیر خسرو دونوں نے اپنے قیام ملتان کے زمانہ میں ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، چنانچہ

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آزری

اسی زمین میں سعدی کی بھی غزل ہے، جس کا مشہور شعر ہے،

صورت گر دیبائے چیں آں صورتِ روشن ببیں
یا صورتے کش آں چنیں، یا ترک کن صورت گری

ظاہر ہے کہ شیخ کی قدرتِ کلام اور قوتِ ابداع میں کس کو شک ہو سکتا ہے، مگر خسرو کی غزل کا ہر شعر پیدائشی نغمہ ہے، شیخ کا کامیاب ترین شعر بھی زیادہ سے زیادہ جانِ تغزل ہے، اور بس، ابن بطوطہ کہتا ہے، جب میں چین پہونچا تو وہاں لوگوں کو شیخ علیہ الرحمہ کی ایک غزل پر وجد کرتے پایا، اس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے:-

چوں دل ب	مہرت	دادہ ام	در بجرۂ	افکرات	تا دہ ام
مفعول	فع لن	فاعِلن	مفعول	فع لن	فاع لن
چوں درن	مازمن	تادہ ام	اگوئی ب	محرا	بندری
مفعول	فع لن	فاع لن	مفعول	فع لن	فاع لن

شیخ کی غزل نقشِ اول ہے، اس کی تقطیع پر نظر کیجیے، حروف کی، اصوات کی کتر بیونت ملتی ہوئی ملے گی، خسرو کی ہر غزل سُر، تال سے لیس ہونے کی وجہ سے نک سک درست ہے، اسے بحر و بند کیجیے

توہر ٹکڑا اپنی جگہ خود مکتفی ہوگا۔

آخر میں یہ کہ قول فیصل تو نہ اپنا کہا ہو سکتا ہے، نہ کسی اور کا، مگر حق و عدل دونوں کا عندیہ یہی ہے، کہ ایک ہی غزل کیا خسرو کا سارا کلام جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہونچا ہے، خاص کر وہ جو آپ سماع کے سوز و ساز کی جان بنا ہوا ہے، اسے قانون شہادت کے مطابق — Unless the Contrary is proved ہمیں خسرو ہی کی تسلیم کرتے رہنا ہوگا۔ خدا کرے کہ مزید تحقیق بھی یہی ثابت کرے۔ آمین!

(دارالمصنفین کی نئی کتاب)

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محب وطن فارسی شاعر، نہ سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں دولرانی خضرخاں اور مطلع الانوار وغیرہ جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے جان نثار مرید و عاشق حضرت امیر خسرو کو معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں اور خود ان کے کلام بلاغت نظام کی روشنی میں ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ روپیہ۔ مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمن

سلسلۂ شعر العجم

اس میں فارسی شاعری کی ابتداء، اس کی عہد بہ عہد ترقیوں اور ہر دور کی شاعری کی خصوصیات اور اسباب پر مفصل بحث اور اسی کے ساتھ ہر دور کے مشہور اور نامور شعراء کا مختصر تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، مولانا شبلی کا ایک شاہکار ادبی کارنامہ، اس کی دوسری جلد میں حضرت امیر خسرو کے حالات کے ساتھ ان کی تمام مثنویوں اور کلام پر بڑی تفصیل کے ساتھ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

قیمت [illegible] ۱۱ [illegible]

آثارِ علمیہ

مرادآباد

محترمی سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج گرامی؟

آپ کا محبت نامہ ملا، جزاکم اللہ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ارشادات و مکتوبات دلی سے شائع ہوئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھجوا دوں، بشرطیکہ معارف میں اس پر تبصرہ آپ کے قلم ہی سے ہو، کیونکہ اولیاء اللہ سے آپ کو مناسبت ہے۔

حضرت شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے سوانح آپ نے ان کی تصانیف سے شروع کیے ہیں، ماشاء اللہ خوب ہیں، اسی طرح اگر شاہ صاحبؒ کے خطوط مہیا ہو سکیں تو ان سے بھی سوانح کے لیے کافی مواد ملے گا، یہ تو شاید آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ حضرت سید صاحبؒ کی وفات کے بعد میں نے حضرت شاہ صاحبؒ کو پہلا خط تحریر کیا تھا، کہ وہ سید صاحبؒ کے جانشین ہیں، سید صاحبؒ نے سیرت پاکؐ کی چھ جلدیں لکھیں اس کی ایک جلد باقی رہ گئی ہے، اس کو پورا کرنا ان کا کام ہے، ان کو یہ بھی لکھا کہ سید صاحبؒ آخر میں کسی اللہ والے سے بیعت ہو گئے تھے، وہ بھی کسی سے بیعت ہو جائیں، اس سلسلہ میں چند نام بھی تحریر کیے تھے، ان کو یہ بھی لکھا کہ تبلیغی جماعت کے پروگراموں میں بھی شرکت کیا کریں، شاہ صاحبؒ حضرت شیخ زکریا سے بیعت ہوئے، تبلیغی اجتماعات میں بھی کبھی کبھی شرکت کرتے رہے، دعوت کے عنوان سے معارف میں کچھ لکھنا بھی شروع کیا تھا، ساتویں جلد کا جو حصہ حضرت سید صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا اس کی اشاعت کر چکے

سعادت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی۔

شاہ صاحبؒ کے سفرِ حج کی آخری قسط مجھے نہیں مل سکی تھی، ان کے سوانح میں ان کے سفرنامۂ حج کا بھی ذکر ہونا چاہیے، جب وہ دوسرے حج پر تشریف لے جا رہے تھے تو اس سے پہلے ندوہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت دعوت کے کام کے سلسلہ میں کچھ تفصیلی گفتگو ہوئی تو فرمایا تھا کہ حج سے واپسی پر ان شاء اللہ اس پر اہتمام سے لکھنے کی کوشش کروں گا، مگر اس کے لیے ان کو وقت بہت کم ملا، شاہ صاحبؒ کا ملت کے مسائل میں مولانا شبلیؒ اور سید صاحبؒ ہی کی طرح کا تھا، گو ان کو اس کے اظہار کا موقع کم ملا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب سے بھی شاہ صاحبؒ کے سوانح میں معاونت لینی چاہیے، شاہ صاحبؒ کو مولانا سے بہت تعلق تھا، "خواص" کے عنوان سے جب مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تو شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ جس کے ہاتھ نے یہ مضمون لکھا اس کا استلام کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد پر ردولی شریف حاضری ہوئی، جامع مسجد میں تبلیغی اجتماع ہوا، اس میں شاہ صاحبؒ اور شاہ آفاق احمد مرحوم بھی شریک تھے، میں نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ اگر سجادگانِ خانقاہ کا طریقہ کار حضرت مخدومؒ کے طریقہ کار کے خلاف ہوگا تو مخدوم صاحبؒ کے طریقہ ہی پر چلا جائے گا، سجادہ صاحب کی پروا نہیں کی جائے گی، حضرت شاہ آفاق احمد کو یہ بات ناگوار ہوئی جس کا اظہار انھوں نے شاہ صاحبؒ سے کیا تو شاہ صاحبؒ نے بہت زور سے فرمایا بالکل ٹھیک کہا ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے پہلے سفرِ حج میں حضرت شاہ صاحبؒ نے مسجد حضرت ابوبکرؓ اور دیگر مقامات پر تبلیغی جماعت کے ساتھ شرکت کی۔

شاہ صاحبؒ کے اجدادِ کرام کے حالات بھی ان کے سوانح میں آنے چاہئیں، ان کا سلسلۂ [illegible]

حق تعالیٰ شانہٗ نے اکابر صوفیہ کرام کے سلسلہ میں آپ سے جو خدمت لی ہے اس کا حق بھی ادا ہو جائیگا۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کا رمضان المبارک اس مرتبہ جنوبی افریقہ میں گذرے گا۔ رمضان کے بعد دو ہفتے انگلستان میں گذاریں گے، حج کے بعد ہندوستان تشریف لائیں گے، بندہ نے حضرت کو لکھا تھا کہ اپنی طاقت کے زمانہ میں تو سفر نہیں فرمایا، مگر اب حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو مختلف ممالک میں پہونچا رہا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کا قدم مبارک روس، چین اور امریکہ پر بھی پڑ جائے، حضرت کا جواب آیا کہ عمر کے ابتدائی پچاس ساٹھ سال تو سوائے دلی اور سہارنپور کے کہیں سفر میں نہیں گذرے، لیکن بڑھاپے میں مجبور کیا جا رہا ہوں، حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ بھی حضرت شیخ کی بہت رعایت فرماتے تھے کہ ان کو سفر کی زحمت نہ دی جائے، مگر اب ان کی پوری معذوری کی حالت میں پورے عالم کی راہیں ان کے لیے کھل رہی ہیں، اس مرتبہ حضرت شیخ سہارنپور تشریف لائیں تو آپ بھی ایک عشرہ ان کے یہاں ضرور گذاریں۔

شاہ صاحبؒ کے کچھ خطوط اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں، ان کو معارف میں شایع کر دیں تو اچھا ہے، والسلام

افتخار فریدی

خطوط شاہ صاحب

اعظم گڈھ

مکرمی! السلام علیکم

امید ہے آپ بخیر ہوں گے، میں ۱۳ر مئی کو دہلی پہونچ گیا تھا، ۱۵ر جون کو اعظم گڈھ آیا، اس وقت سے برابر آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کرتا رہا، مگر آپ کا پتہ گم ہو گیا تھا، آپ کے ہندوستان آنے کی اطلاع بھی ایک صاحب کے ذریعہ ہو گئی تھی، اس لیے مجبوراً بستی نظام الدین کے پتہ سے خط لکھنے والا تھا کہ آپ کا پتہ "سنبھلی گیٹ، فریدی بلڈنگ" یاد آگیا، خدا کرے صحیح ہو اور خط آپ کو مل جائے۔

آپ نے جس اخلاص اور محبت سے میری پذیرائی کی اور جو لطف و کرم فرماتے رہے، اس کا اگر میں شکریہ ادا کرنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتا، واقعہ یہ ہے کہ سفر حج میں سب سے زیادہ سہولت و آرام مجھے آپ ہی کی وجہ سے ملا، جس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، میں نے علی میاں کو بھی اس سے مطلع کر دیا ہے، اپنے سفر کی روداد میں بھی لکھ رہا ہوں جو معارف میں چھپے گی، اس میں تبلیغی جماعت کے کاموں کا بھی ذکر ہوگا، چھپنے کے بعد اس کی کاپی آپ کو بھیجوں گا۔

اپنے پروگرام سے مطلع فرمائیے گا، ان شاء اللہ آیندہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے گا، معلوم نہیں اعظم گڈھ کے لیے آپ کب تک وقت نکال سکیں گے اور کب تک آپ سے نیاز حاصل ہوگا اور امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

معین الدین

۲۵ر جون ۶۶ء

اعظم گڈھ ۱۹ر مئی ۷۱ء

مکرمی! السلام علیکم

رسالے بھی مل گئے تھے اور خط بھی ملا، اس سے پہلے خط کا جواب میں نے رائے بریلی دیا تھا، معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ملا، موجودہ حالات کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا ہے صحیح ہے، لیکن اب حالت ایسی بگڑ گئی ہے کہ جب تک کوئی بڑا مصلح اور مجدد نہ پیدا ہو محض تقریر و تحریر اور وعظ و پند سے اصلاح کی امید نہیں، تاہم جو کچھ امکان میں ہے اس کو تو کرنا ہی چاہیے، یہ فرض تو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، رسالوں پر معارف میں ریویو ہوگا۔ اور امید ہے سب خیریت ہوگی۔

معین الدین

اعظم گڈھ

مکرمی! السلام علیکم، آپ کا خط ملا، اس طرف وطن چلا گیا تھا، اس لیے جواب میں تاخیر ہو گئی،

تبلیغی رسالوں پر ان شاء اللہ جلد ریویو ہوگا، لکھنؤ میں خبر ملی تھی کہ علی میاں اگست کے آ
خیر میں واپس ہوں گے، میں ابھی رودولی سے واپس آرہا ہوں، اس لیے علی میاں کی واپسی کے بعد
دوبارہ سفر مشکل ہے، ممکن ہے رمضان تک جانا ہو۔

معین الدین

۱۳راگست ۱۹۴۳ء

اعظم گڈھ

مکرمی: السلام علیکم

ادھر عرصہ سے آپ کا خط نہیں آیا تھا، میں خط لکھنے والا تھا کہ آپ کا خط آگیا، جس مضمو
آپ نے پسند فرمایا ہے اس کی دوسری قسط جولائی کے پرچہ میں چھپ رہی ہے، ابھی وقتاً فوقتاً
اس کا سلسلہ قائم رہے گا۔ آپ کے باقی رسالوں پر ریویو کے لیے ہدایت کردی ہے، ہفتہ عشرہ
میں رودولی جانے کا ارادہ ہے، آخر جولائی تک واپسی ہوگی۔

معین الدین

۲رجولائی ۱۹۴۳ء

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان میں فقہ اسلامی کی نشو ونما (۷۱۱ء تا ۱۲۰۶ء)

جنوری ۱۹۸۰ء کے آخری ہفتہ میں حکومت ہند کی جانب سے پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اس میں کرک شیتر یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایس۔ بی۔ پی۔ نگم نے مذکورۂ بالا عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا جس کی تلخیص ذیل میں درج ہے: (عمیر الصدیق ندوی)

ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی تاریخ کی طرح اس ملک میں اسلامی فقہ وقانون کے ارتقاء کی تاریخ بھی نہایت دلچسپ و بوقلموں ہے، اس علم کو تقریباً نظر انداز کیا جاتا رہا، جس سے خود عہد وسطیٰ کی تاریخ میں متعدد غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں، اس کوتاہی کا بنیادی سبب خود اس عہد کی تاریخ کے مدونین میں باہمی ربط وضبط کا فقدان تھا، عہد وسطیٰ کے مورخین نے زیادہ تر معاصر تاریخوں پر بھروسہ کیا، وہ فقہاء اور اسلامی قوانین کے ان اثرات کا مطالعہ نہ کر سکے جنھوں نے اس پورے عہد کی پالیسیوں پر گہرے اثرات ڈالے، یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ تاریخی کتابوں میں بہت سے ایسے فتاوی بھی ہیں جو اس دور کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کے سلسلہ میں دیے گئے۔

گو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی اولین آمد کا سراغ ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء میں ملتا ہے جبکہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں عثمان ثقفی کی سربراہی میں اس پر حملہ ہوا، اس کے بعد بھی جستہ جستہ مسلمانوں کے حملے ہوتے رہے لیکن سندھ سب سے پہلا مشہور جرنیل محمد بن قاسم کی قیادت میں فتح ہوا جب یہ علاقہ باقاعدہ قبضہ میں آیا تو سب سے پہلے انتظامی مسائل پیدا ہوئے، لیکن خاص بات یہ تھی کہ غیر مسلم

اپنے قدیم روایتی طریقوں سے اپنی عبادت گاہوں سے پوجا پاٹ کریں کہ نہیں، برہمن ان معابد کے محافظ ہوتے تھے، کیا ان کو حکومت کی ملازمتیں دی جائیں؟ یہ سوالات خلیفہ ولید بن عبد الملک دربار میں زیر غور آئے، اور اس کے نتیجہ میں حجاج بن یوسف گورنر بصرہ نے محمد بن قاسم کو یہ فرمان " یہ ہمیں آیا کہ اعیان و رؤسا، کی اس درخواست پر کہ مندروں کی تعمیر اور مذہبی امور میں رواد متعلق ہمارا کیا رویہ ہوگا، تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ ٹیکس ادا کر کے ہمارے ذمی ہو گئے تو ہم جان و مال میں کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں، انھیں مندروں کی تعمیر کی اجازت ہے، مذہبی امور میں کسی قسم کی ممانعت نہ ہوگی" اور نہ ان کو ان کے مذہب پر پابند رہنے کی وجہ سے سزا دی جائے کوئی ان میں رکاوٹ نہ ڈالے تاکہ وہ اپنے گھروں میں خوشی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں" چنانچہ جن مندروں کی عمارتوں کو جو نقصان پہونچا تھا ان کی مرمت کا حکم دیا گیا، اور قدیم دستور کے مط برہمنوں کو مال گذاری کی آمدنی سے تین فیصدی الاؤنس مقرر کیا گیا۔

بعد کے عرب حکمرانوں کا ذکر گرچہ بلاذری، سیوطی اور یعقوبی نے کیا ہے، لیکن یہ ذکر صرف ا کے ناموں اور ان کے انتظامی امور تک محدود ہے، تاہم نئے نظام حکومت کے تحت زراعت ا اور تجارت نے اس قدر ترقی کی کہ ایک گورنر جنید بن عبد الرحمٰن السامی نے خلیفہ ہشام بن عبد الملک دربار میں آٹھ کروڑ درہم کا خراج بھیجا۔

پہلی صدی ہجری میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر بہت سے حملے کیے تو سندھ کے انتظ ڈھانچہ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں، اس کے صوبے کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئے، ا یہ اس بڑے فاتح کی زد میں آسانی سے آ گئے، سلطان نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں جو انتظامی تبد کیں ان سے متعلق معاصر تاریخوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسلامی فقہ کے مکاتب فکر عرصہ سے باضابطہ قائم ہو چکے تھے، محمود حنفی فقہ کا پابند تھا، اور اسی کو اپنے مفتوحہ علا

گیا، جہاں کے رسوم و رواج قانون بن جاتے تھے۔ سلطان کے نام سے فقہ میں ایک کتاب [illegible] الدین یہ ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے، پنجاب میں غزنویوں کی حکومت قائم ہوئی اس میں فقہ ہی رائج رہا۔

ترکوں کی فتح کے بعد ہندوستان میں اسلامی فقہ کا جو ارتقاء رہا اس کی واضح صورت سامنے ہے، ترکوں نے مذہبی اور غیر مذہبی قوانین کا جو نفاذ کیا اس کا پس منظر بہت ہی صاف ہے۔

تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، مولفہ فخر مدبر نے لکھا ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک کے احکام میں یہ بھی تھا کہ خراج کی وصولی میں شرع کے قوانین کی پابندی کی جائے، اس سے پہلے خراج کی وصولی کاشتکاروں کے مذہب کا خیال کیے بغیر کی جاتی تھی، سلطان نے حکم دیا کہ جس زمین کی کاشت مسلم کرتے ہیں اس کا خراج پیداوار کا $\frac{1}{5}$ وصول کیا جائے اور مسلم کاشتکاروں سے پیداوار کا $\frac{1}{2}$ تک خراج لیا جائے۔ اس میں شک ہے کہ یہ تبدیلی زیادہ دنوں تک جاری رہی، کیونکہ بعد کے سلاطین کے عہد میں عشر اور خراجی زمین کا ذکر نہیں ملتا، منگولوں کے حملوں کی وجہ سے بہت سے مسلمان ہندوستان آگئے، یہاں انہیں سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت میں جاگیریں ملیں، پہلے کی طرح تفریق باقی رہتی تو خزانے کی آمدنی پر بڑا اثر پڑتا، اس لیے یہ تفریق ختم کر دی گئی۔

فخر مدبر نے ایک دوسری کتاب آداب الحرب والشجاعۃ میں بڑی تفصیل سے جزیہ کی وصولی، معاہدوں کی پابندی اور ان کا احترام، جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک، غیر مسلموں کے ساتھ عدل پروری اور مساوات کا ذکر کیا ہے، فخر مدبر نے جو پند و نصائح لکھے ہیں، وہ محض نمائشی نہیں کیونکہ [illegible] عہد میں نقیبا سے مشورے کیا کرتا تھا، شمس الدین التمش نے شیخ نور الدین مبارک غزنوی سے جو گفتگو کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان ان امور سے اچھی طرح واقف تھا لیکن ان کے مشوروں کا پابند ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

شیخ نورالدین مبارک غزنوی نے سلطان کو رائے دی کہ وہ غیر مسلموں کو نیست و نابود کر دے، مسلمانوں میں جو بد اخلاقی پھیلی ہوئی ہے اس کو ختم کرے اور ان آزاد خیالوں کا خاتمہ کر دے جو کہ ناقدین اور اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آئے۔

شعار النوٰۃ محمدی میں ضیاء الدین برنی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب دہلی مغرب سے آتے ہوئے علماء کا ایک مرکز بن گیا تو انھوں نے دیکھا کہ سلطان التتمش ہندوؤں کے ساتھ بڑی رواداری سے پیش آتا ہے، وہ سلطان کے پاس ایک وفد لے گئے اور اس پر زور دیا کہ وہ ہندوؤں کو مجبور کرے کہ اسلام یا موت میں کسی ایک کا انتخاب کر لیں، لیکن سلطان نے یہ معاملہ اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کے سپرد کیا، جس نے یہ کہہ کر اس مطالبہ کو رد کر دیا کہ حکومت اہل دانش و بینش کی رائے سے چلتی ہے، ورس دینے والوں کے توہمات اور تعصبات سے باقی نہیں رہ سکتی۔

سلطان التتمش کے کمزور جانشینوں میں یہ اہلیت نہیں تھی کہ وہ حنفی فقہ میں تبدیلی کرتے، لیکن بلبن نے یہ اقرار کیا کہ شرعی قوانین کے تحت حکومت کا انتظام و انصرام ناممکن ہے۔

۱۲۹۰ء میں خلجیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد بھی مروجہ قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، کیونکہ جلال الدین خلجی کسی تبدیلی کا خواہاں نہیں ہوا، لیکن اس کے جانشین علاء الدین خلجی میں بڑی جارحیت تھی، اس نے شرعی احکام کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنایا۔ فقہاء نے اس کو غیر مسلموں سے برتاؤ، قانون جزیہ اور شاہی خزانہ سے متعلق شرعی قوانین کے مشورے دیے تو اس نے ان کے تمام مشوروں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ وہی کرتا ہے جس میں ریاست کی فلاح ہوتی ہے، فقہاء اس کے خلاف رہے، لیکن سلطان نے ان کی مخالفت کا خیال کیے بغیر حمید ملتانی کو صدر جہاں کے عہدہ پر مامور کیا، جس کی صرف خوبی یہ تھی کہ تیل مالش اچھی طرح کرتا تھا، اور سلطان کا بدن دابنے میں ماہر تھا، یہ سلطان کا عہد اسلامی فقہ کے لیے بڑا تاریک عہد تھا، یہ پہلا سلطان ہے جس نے جرائم کرنے والوں کی بیویوں اور بچوں کو اذیت دے کر ہلاک کرنے کی روایت

قائم کی، اس نے ہندو سود خوروں کی جائداد ضبط کرکے ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ اس نے سب سے وحشت ناک سزا اسمٰعیلی بوہروں کو دی جن کو محض اس شبہہ میں کہ وہ بداخلاقی پھیلاتے ہیں بالکل تہس نہس کر دیا۔ مظالم کا یہی سلسلہ اس کے بیٹے سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں جاری رہا، اس نے دیوگیری کی مہم سے واپس آکر اپنے ایک درباری اسد الدین کے چودہ بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کی حکومت مختصر رہی لیکن اپنے باپ کی طرح وہ بھی مروجہ قوانین کا پابند نہیں رہا،

امیر خسرو نے ایک حیرت انگیز واقعہ کا ذکر کیا ہے، کہ اس نے اپنے بڑے بھائی خضر خاں کو صرف اس لیے ختم کر دیا کہ اس نے اپنی منکوحہ بیوی دیول رانی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا، جس سے وہ شادی کا خواہش مند تھا۔ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ خلجیوں کے دور میں کچھ فتاویٰ دباؤ کے تحت دیے گئے۔ ۱۳۲۰ء میں سلطان قطب الدین کو خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں نے قتل کر دیا۔ خسرو خاں نے عدت کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر اس کی بیوہ سے شادی کر لی، لیکن بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق نے غلط فیصلہ دینے والے قاضیوں کو سزائیں دیں۔

سلطان غیاث الدین تغلق کے دور کی قانونی تاریخ کے باب میں تاریخ فیروز شاہی اور دوسری معاصر تاریخیں خاموش ہیں، امیر خسرو کی سیر الاولیاء میں سماع کے جواز سے متعلق خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ زادہ حسام الدین اور قاضی جلال الدین کے درمیان نزاع کا مختصر ذکر ہے، اس سلسلہ میں ایک محضر ہوا جس کی صدارت سلطان غیاث الدین تغلق نے کی، قاضی جلال الدین، دیوان قضاۃ میں نائب حاکم کے عہدہ پر تھے، انھوں نے قاضی حمید الدین ناگوری کا ایک فتویٰ پیش کیا، جس میں سماع کو حرام قرار دیا گیا تھا، قاضی کمال الدین، صدر جہاں نے امام ابو حنیفہ کا ایک فتویٰ سماع کی حرمت میں دکھایا، مگر شیخ بہاء الدین ذکریا کے پوتے شیخ علم الدین نے اس تنازعہ کو یہ فیصلہ دے کر ختم کیا کہ سماع روحانی زندگی کے لیے

حلال ہے، لیکن اگر یہ تفریح کے لیے ہے تو حرام ہے۔ مخصوص ... سلطان محمد یا کوئی فیصلہ صادر کرنے سے روک دیا، سلطان نے ان ہی سے اتفاق کیا، سلطان محمد بن تغلق ایک علمی تعلیم یافتہ اور قابل حکمران تھا، نظریاتی اعتبار سے اس کا رجحان معتزلہ کے مکتب فکر کی طرف تھا، وہ اپنے دور کے ممتاز منطقیوں مثلاً سعد منطقی، نجم انتشار اور علیم الدین جیسے یگانۂ روزگار سے متاثر تھا۔ سلطان نے فقہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ عدل پروری سے متعلق اپنے خیالات رکھتا تھا، مشہور سیاح ابن بطوطہ دارالسلطنت کا قاضی بنا دیا گیا تھا، اس کا بیان ہے کہ سلطان نے ایک دیوان سیاست قائم کیا تھا، اس نے اس کے لیے خود قوانین وضع کیے تھے قاضی القضاۃ کمال الدین شاہی محل میں عدالت قائم کرتے تھے، وہ سختی سے قوانین کا نفاذ کرتے تھے ابن بطوطہ نے کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں، جن میں خود سلطان کو عدالت میں آکر اپنے خلاف فیصلہ سننا پڑا اور عدالت کے احکام کی بجاآوری کرنی پڑی، لیکن ان کے باوجود جرائم سے متعلق قوانین ناقابل تصور حد تک سخت تھے، اعتراف جرم کے لیے سخت جسمانی اذیتیں دی جاتیں، اور وہ ہلاک بھی کر دیئے جاتے۔ ان مظالم کے خلاف شیخ شہاب الدین کی طرف سے جو اپنے دور کے ممتاز فقیہ تھے، تنہا آواز بلند ہوئی، وہ گرفتار کر لئے گئے، ایک دوسرے فقیہ عفیف الدین کاشانی کو سلطان کے خلاف برسرعام نکتہ چینی کے الزام میں جسم کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

سلطان محمد تغلق کا دور ہمارے لئے یوں اہم ہے کہ فقہ پر پہلی کتاب مجموعہ خانی کے نام سے مرتب کی گئی، یہ قتلغ خان کے نام پر معنون ہوئی، یہ اب تک غیر مطبوعہ ہے، یہ حنفی مسلک کے قوانین پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، اس میں حفیظ الدین ابو البرکات احمد (متوفی ...) کو نسفی ...

سلطان فیروز شاہ تغلق کا دور اپنے پیش رو کے دور سے قطعاً مختلف ہے، سلطان قانونی اور فقہی جزئیات سے باخبر تھا، اس کی فتوحات فیروز شاہی سے ظاہر ہے کہ وہ شرعی قانون کی پابندی چاہتا تھا، اس نے لکھا ہو کہ گذشتہ دنوں خون پانی کی طرح بہایا گیا، اعضاء کی قطع و برید، مثلہ سازی اور سزاؤں کی صورت میں انسانی جسم کی توہین روا رکھی گئی، خدا نے مجھے توفیق دی کہ خون مسلم کی ارزانی کو ختم کروں، اور ہر قسم کی ایذا رسانی اور تعذیب کا سدّباب کروں، سلطان نے صرف فقہ حنفی کی ترویج میں ہی حصہ نہیں لیا، بلکہ سیرابی اور اس قسم کے دوسرے ٹیکسوں کو بند کر دیا، عفیف کے بیان کے مطابق اسے اس نرمی کے نتیجے میں سالانہ تیس لاکھ ٹنکہ کا خسارا برداشت کرنا پڑا، اس نے تفتیش چشم دیدگواہوں کی تصدیق اور کھلے مقدموں کے ضابطہ اصول قائم کئے۔

سلطان فیروز شاہ کے دور ہی میں ہندوستان کے حالات کے مطابق اسلامی فقہ کو مرتب کرنے کا احساس ہوا، قاضی صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی نے اسلامی فقہ پر ایک جامع کتاب مرتب کی، جو فقہ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہے، اور یہ فیروز شاہی کے نام سے معنون ہے، سوال و جواب کی صورت میں یہ کتاب ان مسائل کا احاطہ کرتی ہے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، چند مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے

سوال :- ایک مسلمان کے والدین غیر مسلم ہیں، تو کیا قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو گھر سے بے گھر کر دے،

جواب :- نہیں،

سوال :- ایک ہندو بیمار ہو تو کیا قانوناً ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کی عیادت کرے، اور دیکھ بھال کرے،

جواب :- ہاں

سوال :- فرض کیجئے کہ ایک مسلمان نے ایک ہندو کو قتل کر دیا تو اس ہندو کے خون بہا کتنا دیا جا سکتا ہے ؟

جواب :- وہی رقم جو ایک مسلمان کے قتل کے خون بہا میں دی جاتی ہے۔

سوال :- اگر ہندو کے گاؤں میں کوئی پرانا مندر ہے تو کیا مسلمانوں کو قانوناً اس کے انہ

جواب :- نہیں۔

سوال :- کیا ہندوؤں کو اپنے رہائشی مکانات پر بھی خراج کی رقم ادا کرنی ہوگی

جواب :- نہیں۔

سوال :- ایک ہندو غیر مزروعہ زمین کو قابل کاشت بنا لیتا ہے، تو کیا قانوناً اس کا مالک ہو سکتا ہے۔

جواب :- ہاں

سوال :- ایک ہندو کے مسلم رشتہ دار کو مالی امداد کی شدید ضرورت ہے، قانون کسی دباؤ کے تحت اس ہندو سے اس کے مسلم رشتہ دار کی اعانت کرا سکتا ہے ؟

جواب :- نہیں۔

سوال :- اگر ایک مسلمان عورت معاوضہ میں کسی ہندو بچے کو دودھ پلاتی ہے تو کیا یہ جائز ہے

جواب :- اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سلطان فیروز پر ایک متعصب و متشدد حکمران ہونے کا الزام ہے، مگر مندرجہ بالا حقائق دوسری ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

فقہ القرآن:۔ مرتبہ مولانا عمر احمد عثمانی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۲۲، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر ادارۂ فکر اسلامی، کاشانۂ حنیفہ نمبر ۲۴۰ گارڈن ایسٹ، اسرداس روڈ کراچی نمبر ۳

مولوی عمر احمد عثمانی نامور عالم دین، اور حضرت مولانا تھانویؒ کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کے لائق فرزند ہیں، اُن کو علم کا ذوق اور دین کی خدمت کا ولولہ اپنے قابل فخر بزرگوں سے وراثۃً ملا ہے، اس لئے وہ تعلیمی مشغولیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں، زیر نظر کتاب میں اسلامی فقہ کے ان احکام و مسائل کو مرتب و مدون کیا گیا ہے، جن کی صراحت قرآن مجید میں موجود ہے، عربی میں احکام القرآن پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں امام ابوبکر جصاص رازی کی احکام القرآن بہت اہم اور آج تک متداول ہے، لیکن اردو میں اس موضوع پر غالباً ابھی تک کام نہیں ہوا تھا، اس کتاب کا مقصد اسی کمی کو پورا کرنا ہے، اس میں کتب فقہ کی طرح مختلف فقہی ابواب قائم کرکے ان کے تحت اس سلسلہ کی آیتیں مع تشریح نقل کی گئی ہیں، اس طرح طہارت، میاہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج، نکاح اور رضاعت کے زیر عنوان ہر ایک سے متعلق مطالب آیتیں درج کی ہیں، الفاظ کی لغوی تشریح پر خاص توجہ کی ہے، مصنف نے صرف قرآنی آیات نقل کرکے ان سے متعلق فقہی احکام ذکر کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہر ہر بات سے متعلق گوناگوں فروعی مسائل جزئیات، فقہاء کے اختلافات اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے مرجح و مختار مسلک کا بھی ذکر کیا ہے، کہیں کہیں ضعیف

احادیث پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے، اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جو بڑی محنت لکھی گئی ہے، اس لیے بہت قابل قدر ہے، مگر مصنف نے بعض جگہ استنباط میں بیجا تکلف سے جیسے والشفع والوتر سے جفت و طاق رکعتوں کا استنباط، اسی طرح بعض جگہ ان کا استنباط واضح زیادہ واضح نہیں ہے، اور کہیں کہیں ان کی تشریح اطمینان بخش نہیں ہے، مقدمہ میں انھوں لکھا ہے کہ صحیحین کی احادیث بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہیں، اس کے لکھنے میں بڑی ذمہ داری خ ہو جاتی ہے، اور پھر اس کی تشریح و توضیح جس انداز سے کی گئی ہے، اس کے بعد روایات کوئی معیار باقی نہیں رہتا، بلکہ اس سے انکار حدیث کے فتنہ کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ بھی ہے متعدد فقہی ابواب نظر انداز کر دیے ہیں، جیسے بیوع، اطعمہ اور اشربہ وغیرہ، ان سب کے متعلق بھی قرآن مجید میں ہدایات موجود ہیں، کہیں کہیں لفظوں کی نامانوس جمع استعمال کی گئی ہے، یتیموں، ریاحین، طہارتیں وغیرہ۔

"سفر حجاز" اور "گیارہ سفر"، از مولانا عبد الماجد دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۲۰۰ و ۳۰۹، قیمت ۴۰ چالیس و ۳۰ تیس روپے، ناشر: ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ ۱۷

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم ۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، اسی میں انھوں نے اپنے اس مقدس سفر کی مفصل روداد لکھی تھی جو شایع ہو کر بہت مقبول اور ان کی زندگی میں اس کے کئی کئی ایڈیشن نکلے، اب ان کے اور ان کی کتابوں اور تحریروں عاشق و شیدائی جناب منظور علی لکھنوی ثم کلکتوی نے اسے آفسٹ پر بہت خوبصورت شایع گو یہ سفرنامہ نصف صدی قبل کا ہے، تاہم اس میں بیان کیے گئے مشاہدات و کیفیات کا انداز اتنا اچھوتا ہے کہ ان کی تازگی، لطافت اور جلوہ سامانی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، مرکز ایمان و وجد

مقدس سرزمین کی باتیں مولانا عبدالماجد صاحب جیسے صاحب دل ادیب وانشاپرداز کے قلم سے ع ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا، کا مصداق ہیں،

اس میں صرف حج و مناسکِ حج یا خشک فقہی احکام و مسائل ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ تفسیر کے غوامض، حدیث کی شرح و توجیہ، تصوف کے اسرار و نکات، تاریخی و جغرافیائی حالات اور مسنون دعائیں وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہے، مولانا کی دقتِ نظر نے جو خامی و بدنظمی دیکھی اس کا بھی ذکر کیا ہے، اس طرح یہ سفرنامہ آج بھی [illegible] کے لیے بہت کارآمد اور پُر از معلومات ہے ممکن ہے بعض قارئین کو کہیں کہیں مولانا کی خوش عقیدگی حد سے بڑھی ہوئی معلوم ہو اسی طرح حجاز کے مسئلہ میں اُن کا جو نقطۂ نظر ہے اس سے اس دور کے دوسرے اکابر کو اختلاف رہا ہے،

دوسری کتاب بھی مولانا کے گیارہ جلبوں کے سفر کی روداد ہے، اس میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں لاہور کے ایک سفر کی روداد بھی ہے، مولانا کے بعض سفر ذاتی نوعیت کے تھے گو ان میں بھی انکا اصل مقصد کتب خانوں سے استفادہ ہی ہوتا تھا، اور بعض کی نوعیت علمی تھی، مثلاً لاہور کا سفر ایک علمی مذاکرہ میں شرکت کے لیے ہوا تھا، اور مدراس میں ان کو سیرت پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا، بمبئی میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جناب شہاب الدین دسنوی سابق پرنسپل صابو صدیق پالیٹکنک بمبئی نے ایک مجلس مقالات کا پروگرام رکھ دیا تھا اس میں دوسرے ارکان کی طرح مولانا نے بھی حصہ لیا تھا،

مولانا نے ہر سفر کی روانگی سے واپسی تک کی بہت مکمل روداد قلمبند کی ہے ان کی باریک بیں نگاہ معمولی اور چھوٹی باتوں کو بھی پوری طرح محسوس کر لیتی ہے اس لیے انکا سفرنامہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہوتا ہے، وہ صرف واقعاتِ سفر اور دعوت و مدارات ہی کے ذکر پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ ہر جگہ کی قابل ذکر باتیں خصوصاً علمی مشاہدات و تاثرات بھی بیان کرتے ہیں اور ہر جگہ کے لائق

اصحاب علم و ذوق اور روحانی اشخاص کا ذکر بھی کرتے ہیں، اور یہ ذکر مختصر ہونے کے باوجود بہت متوازن اور ایسا جامع ہوتا ہے کہ اشخاص کا سراپا سامنے آجاتا ہے، ہر ہر شہر کے کتب خانوں کی سیر کا ذکر بھی کیا ہے، جنوبی ہند خصوصاً مدراس کے سفر میں وہاں کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تمدنی حیثیتوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اور شمالی ہند سے تقابل کر کے دکھایا ہے کہ وہاں کے مسلمان دوسری قوموں کے مساوی ہیں، نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز برتا جاتا ہے اور نہ اردو زبان بے تعصبی کا شکار ہے، حیدرآباد کے سفر نامہ میں اس کے اہم علمی، ادبی اور اشاعتی اداروں کے علاوہ اس کی "تسخیر" کا بھی دردانگیز نقشہ کھینچا ہے، دونوں سفر نامے مولانا کے ادب و انشاء کی رعنائیوں اور لطافتوں سے معمور ہیں۔

ملت اسلامیہ کا سفر:- مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۶۶، قیمت ۔ تین روپے۔ پتہ:۔ اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا۔ ناگپور۔

یہ کتابچہ ملت اسلامیہ کی مختصر سرگذشت ہے، اس میں مسلمانوں کے گذشتہ واقعات، عہد رسالت، خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ، خلافت عباسیہ اور دولت عثمانیہ وغیرہ کے زیر عنوان سنہ وار بیان کیے گئے ہیں، عباسیوں کے ضمن میں ان کے زمانہ کی خود مختار سلطنتوں، پھر اندلس کے امویوں اور ایران و ہندوستان کی مسلم حکومتوں کا تذکرہ بھی ہے، مصنف نے گذشتہ صدیوں کی بعض اہم شخصیتوں کا اجمالی تعارف اور اس صدی کی اصلاحی تحریکوں اور مختلف ملکوں میں طلبہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور سیاسی واقعات کی طرح علمی، ادبی اور تمدنی کارنامے بھی بیان کیے ہیں لیکن یہ تصویر دھندلی ہے، یہ کتاب پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے شائع کی گئی ہے تاکہ مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ سے واقف ہو کر سبق حاصل کریں۔ "ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ اگست ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

([illegible])

....

جلد ۱۲۸ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

۲۰-۲۱ اگست ۱۹۸۱ء کو دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کا سالانہ جلسہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا، جس سے اس احاطہ میں بڑی رونق اور چہل پہل رہی، معزز اراکین سے اس کے خدمت گذاروں کو ہر قسم کا استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

مجلس انتظامیہ میں کچھ جگہیں خالی ہو گئی تھیں، ان پر جناب حکیم عبد الحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ دہلی) جناب محامد علی عباسی صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس (حیدر آباد) اور جناب حافظ محمد یوسف صاحب کوکن عمری (مدراس) کا انتخاب ہوا، اس جلسہ میں ایک بہت ہی اہم تجویز یہ بھی منظور ہوئی کہ ۲۱-۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین میں ایک بین الاقوامی سمینار "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ہو جس میں بیرونی ممالک کے فضلا کو مدعو کر کے اس پر مفید اور سیر حاصل بحث کی جائے، مستشرقین کے رول پر معارف کی زیر نظر اشاعت میں کچھ مباحث ناظرین کی نظروں سے گذریں گے، یہ تحریریں آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی ہیں، اس عرصہ میں اور بہت مستشرقین پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام اور اسلامی موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے، سمینار میں گذشتہ اور موجودہ تمام مستشرقین کا جائزہ اس حیثیت سے لیا جائیگا کہ ان کی قلمی کاوشوں اور علمی ہنگامہ آرائیوں سے فوائد زیادہ پہونچے یا نقصانات، اس سمینار میں جو مقالات پڑھے جائیں گے وہ دار المصنفین کی طرف سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوں گے۔

گذشتہ ایک سال کے اندر مراد آباد، بہار اور حیدر آباد میں ہندو مسلمان کے جو خونین اور ہولناک فسادات ہوئے ان پر انسانیت روئی، ہر محب وطن کی گردن شرم سے جھکی، بیرونی ممالک میں

واقع بھی ہوئی، اب نہ صرف ہماری حکومت بلکہ اس ملک کے ہر خیر خواہ شہری کو بڑی سنجیدگی سے غور کرنا ہے کہ آخر ان بلووں کے اسباب کیا ہیں خطا ہیں اور خطاکار لوگ تو ایک دوسرے پر الزام تراشی کرکے عہدہ برآ ہوتے آرہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، مگر خطا بینی یا خطا پوشی اس مسئلہ کا مستقل حل نہیں، پہلے برطانوی حکومت کے زمانہ میں ہر شخص کی زبان پر ہوتا کہ یہ انگریز لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کی خاطر ہندو مسلم فساد کراتے رہتے ہیں، اب تو وہ چلے گئے، مگر ان کے عہد سے زیادہ بلوے ہونے لگے ہیں، لندن کے ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ ان بلووں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر تیسرے دن یہاں بلوہ ہوتا ہے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تقسیم ہند کی وجہ سے ہندو مسلمان میں باہمی منافرت پیدا ہوئی اور یہی منافرت بلوے کی شکل میں نمودار ہوتی رہتی ہے، ہندوؤں میں اگر انتقامی جذبہ ہندوستان کی تقسیم سے پیدا ہوا تو انھوں نے اس تقسیم کا بدلہ پاکستان کے خلاف بنگلہ دیش کی حمایت کرکے فطری طور پر لے لیا جس کے بعد یہ انتقامی جذبہ کم ہونا چاہیے۔

برطانوی عہد کے بلووں کے اسباب کا تجزیہ اس زمانہ کے مشہور ہندو مسلمان دونوں رہنما برابر کرتے رہے گاندھی جی نے فروری ۱۹۲۴ء کے ینگ انڈیا میں لکھا کہ مسلمان ہندو اکثریت سے صرف اسلئے خائف ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے انکے ساتھ ہمیشہ غیر منصفانہ برتاؤ کیا، انکے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کیا، ہندو مسلمانوں سے اسلئے خوفزدہ ہیں کہ جب کبھی مسلمانوں کے ہاتھ میں قوت آئی تو انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن مٹھی بھر حملہ آوروں نے انکو مغلوب کر دیا، اس ملک میں اسی تجربہ کے دوبارہ پیش آنے کا خطرہ ہے، اور مسلمان لیڈروں کی سچائی اور خلوص کے باوجود مسلمان حملہ آوروں سے انکا مل جانا یقینی ہے، اسی بات کو گاندھی جی نے ۲۹ مئی ۱۹۲۴ء کے ینگ انڈیا میں یہ لکھ کر دہرایا کہ ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے پر ہنوز بے اعتمادی موجود ہے، بہت سے ہندوؤں کو مسلمانوں کی راست بازی پر بھروسہ نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سوراج کے معنے مسلمان راج کے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ برطانیہ کی عدم موجودگی میں

مسلمانانِ ہند بیرونی مسلم طاقتوں کی امداد کریں گے تاکہ وہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کریں، اس کے برعکس مسلمان خوفزدہ ہیں کہ ہندوؤں کی زبردست اکثریت ان کا گلا گھونٹ دیگی۔

اسی طرح لالہ لاجپت رائے کا ایک خط ۲ فروری ۱۹۲۰ء کے اخبار مرہٹہ میں شایع ہوا، جس میں انھوں نے اپنے اس شک کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے سرحدی مسلمانوں کے ساتھ افغانستان، وسط ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح غول ایسے ہونگے جن کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ رابندرناتھ ٹیگور کا ایک بیان ۸ اپریل ۱۹۲۴ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شایع ہوا جس میں انھوں نے اپنے شکوک کا اظہار کیا کہ کوئی مسلمان قوت ہندوستان پر حملہ کر بیٹھے تو یہاں کے مسلمان اس مشترکہ زمین میں اپنے ہندو ہمسایہ کے دوش بدوش نہیں ہونگے۔

ان بے بنیاد شکوک سے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بدگمانی پیدا ہوتی رہی مگر ۱۹۴۷ء کے بعد شیخ عبداللہ نے کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ بنا کر اس بدگمانی کو دور کرنے میں عملی ثبوت دیا، پھر پاکستان سے جو دو لڑائیاں ہوئیں ان میں بریگیڈیر عثمان اور عبدالحمید کی وطن دوستی، جانبازی اور پامردی کو حکومت ہند نے اچھال کر اسکا اعتراف کیا کہ مسلمان اپنے ملک کے کیسے وفادار ہوسکتے ہیں، اس زمانہ کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے میں آیا کہ پاکستان کے محاذ جنگ پر ایک بھائی اپنے سگے بھائی کے خلاف لڑتا رہا، بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے تو پاکستان کے خلاف ہندوستان ہی سے مل کر جنگ کی، پھر آج بھی افغانستان پاکستان کے بجائے ہندوستان کا عظیم ترین اور مخلص ترین حلیف اور دوست بنا ہوا ہے، اسلامی ممالک میں ہندوستان کا جو اثر و رسوخ ہے وہ پاکستان کا نہیں، پھر مسلمانوں کے خلاف برطانوی عہد میں جو بداعتمادی پھیلائی گئی تھی وہ ظاہر ہے کہ کیسی بے بنیاد بات ثابت ہوئی۔

اسی طرح کی بداعتمادی مسلمانوں میں بھی رہی، سر عبدالرحیم نے ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ میں مسلم لیگ کی صدارت کی تو اپنے خطبہ میں کہا کہ ہندو تاریخ کے صفحات کو مسخ کر رہے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی جستجو میں ہیں

اسلام سے ہندوستان کو کبھی کوئی نفع نہیں پہونچا اور یہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ مسلم قوم نہایت ناکارہ اور ایسے افراد سے مرکب ہے جو مبتذل ترین ہندوؤں کے بھی ہم پلہ نہیں ہیں۔ مولانا احمد سعید جمعیۃ العلماء ہند کے روح رواں ہیں کر برابر کانگریس کے ہمنوا رہے مگر دسمبر ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ صاف اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے معاندانہ اور مخاصمانہ طرزِ عمل سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ہندوؤں کی جانب سے مایوس ہوگیا ہے۔ ان چند برسوں میں ہندوؤں نے جو مظالم کئے اور جس بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہب کی توہین کی اور انکے جائز حقوق کو پامال کیا ہے پھر باوجود مسلمانوں کی انتہائی خوشامد اور رواداری کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مطالبات کو جس طرح ٹھکرایا ہے اور ہندو لیڈروں نے بجائے ان مظالم اور خونریزی کی جس طرح پردہ پوشی کی ہے بلکہ حمایت کی ہے، ان تمام باتوں نے ہندوؤں کے اعتماد کو کھو دیا ہے۔

مولانا حسین مدنی نے کانگریس کا ساتھ دینے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی مخالفت مول لی، انھوں نے ستمبر ۱۹۲۶ء میں اپنے ایک خط میں لکھا کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی، سیاسی اور وطنی نصب العین ہے، ہر حیثیت سے ہم کو اسکے لیے کوشش کرنی چاہئے، مگر اسی کے ساتھ ہم اپنے مذہب و قوم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ آزادی کو مذہب و قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں، اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہو جائے تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ، مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں، ان کی اکثریت غیر معمولی ہے تین اور ایک کی نسبت ہے، انکی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے یہی فرما رہے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی نہیں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا، جو مظالم آئے دن دفتروں، شہروں اور ریاستوں میں کئے جاتے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت دیا جاتا ہے اسکی بنا دیر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن سے متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے۔

اسی زمانہ میں مولانا محمد علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہندو سوراج کے جنگی نعرے سے لیس ہو کر آئے ہیں تو وہ مسلمان کو یہاں پناہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں تاوقتیکہ مسلمان اپنی انفرادیت کو خیرباد کہہ کر ہندو تمدن اختیار نہ کرلیں، ہندو مسلمان کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے، اس کے برخلاف مسلمان نیشنلزم کو سراب نہیں تو

دھوکا خود تصور کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود بڑے اہتمام سے اس مفروضہ کو قائم رکھا جاتا ہے کہ ہماری اغراض مشترک ہیں، ہندو پریس قومی اتحاد کے متعلق گمراہ کن اصطلاحات کا سہارا لینے میں پیش پیش ہے، گویا ہندو مسلمانوں میں تصورات، احساسات نقطہ ہائے نگاہ میں کسی بنیادی اختلاف کا وجود ہی نہیں۔ مولانا محمد علی نے لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنے آخری خط میں یہ بھی لکھا کہ آج کچھ ہندو کچھ سکھ کچھ مرہٹے اور کچھ راجپوت ایسے ہیں جو ہندوستان کے گذشتہ مسلمان حکمرانوں کا بدلہ ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں سے لینا چاہتے ہیں۔

ان مسلمان رہنماؤں کے بیانات صحیح تھے یا غلط لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں فرقوں میں بداعتمادی بڑھتی رہی جس کا نتیجہ تقسیم ہند میں نمودار ہوا، پھر پاکستان بھی تقسیم ہوا تاریخ کو جو فیصلہ کرنا تھا کر چکی، اب سوچنا یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر محب وطن کو کیا کرنا ہے،

اکبری عہد میں ابوالفضل نے بڑے دکھ اور درد کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو سامنے رکھ کر لکھا تھا کہ بنی نوع انسان کے مختلف طبقات میں بے رنگی اور مخالفت پائے جانے کے اسباب یہ ہیں کہ ایک دوسرے کے باہمی خیالات سے لاعلم ہوتے ہیں، اس لاعلمی نے دشمنی کا سنگ بنیاد رکھ کر دنیا کو شورش کی گرد سے غبار آلود کر دیا ہے، کوئی واسطہ ایسا پیدا نہیں کیا جاتا جو باہمی بے رنگی کو مٹائے، اس بے رنگی کی وجہ سے نفس پرست بندے، آنکھوں کے اندھے اور کانوں کے بہرے ہو گئے، وہ اصلی تحقیق و تفتیش کی تکلیف گوارا نہیں کرتے، دشمنی اور عداوت کی ہوا اتنی تیز ہے کہ دو تین افراد بھی ایسے نہیں جو ایک جگہ بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کریں، اور مہر و محبت کی فضا قائم کرنے میں معاون ہوں، خود بینی کا ایسا دور دورہ ہے کہ ہر فرد نے اپنی ہی جماعت کو مخلوق خدا خیال کر لیا ہے، اور دوسرے کو بندگی کے دائرہ سے خارج کر کے خونریزی، آبروریزی اور مردم آزاری کو مذہبی فریضے میں داخل کر لیا ہے، یہ مخلوق خدا کو دھوکا دینا ہے، اور خود نمائی سے اپنے کو حقیقی اور صادق رہنما سمجھنا بد طینت ہونے کی دلیل ہے،

یہ راقم بارہا لکھ چکا ہے کہ ابوالفضل نے چار سو برس پہلے جو کچھ لکھا تھا اس کا اطلاق اب بھی ہوتا ہے اور یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ہندوستان اپنی اخلاقی حالت میں جیسا پہلے تھا اب بھی وہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی مہم سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں میں رہی، جو اس اتحاد کی بنیاد اپنے سیاسی مفاد کی خاطر قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اگر اس کی مہم سچے محبان وطن، خیر خواہ مصلحین قوم، بے غرض اور بے لوث رہنمایان ملک کے ہاتھوں میں ہوتی تو وہ یقیناً اس سرزمین میں یہ فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوتے کہ یہاں کے رہنے والوں کا روشن اور زریں مستقبل باہمی رواداری، فراخ دلی، وسیع المشربی، محبت، یگانگت اور موانست میں ہے، نہ کہ باہمی خونریزی، خانہ جنگی، آبرو ریزی، مردم آزاری خود پروری، نفرت، عداوت اور حقارت میں ہے،

اس فضا کو قائم کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہندوؤں ہی پر آتی ہے کیونکہ وہ صاحب اقتدار و حکومت ہونے کے علاوہ متحدہ قومیت کے بھی مبلغ اور علم بردار ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے پارلیمنٹ میں فرمایا تھا، وہ خود قد آور بننا چاہتے ہیں تو ضرور بنیں، مگر دوسروں کو ٹھگنا بنا کر رکھنے کی تو کوشش نہ کریں۔ ہندوؤں کو اپنے ساتھ اپنے رقیبوں کو بھی قد آور بنانے کی فضا پیدا کرنی چاہئے، اور یہ فضا قائم نہ ہو سکی، تو پھر اندیشہ ہے کہ عظیم ترین ہمدرد اور دوست ابوریحان البیرونی کی یہ بات کہیں آج بھی صحیح ثابت نہ ہو جائے کہ "ہندوؤں کے تمام تر تعصب کا نشانہ وہ لوگ بنتے ہیں، جو ان میں نہیں یعنی جو نو وارد (مسلمان) ہیں ان انھیں ملیچھ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں گندے یا ناپاک، ان سے کسی قسم کا واسطہ نہیں رکھتے، نہ ان سے ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کا تعلق، نہ ان کے ساتھ مل بیٹھنے پر رضامند ہوتے ہیں، نہ کھانے اور پینے پر، کیونکہ ایسی صورت میں وہ سمجھتے ہیں کہ پلید ہو جائیں گے، ان کے نزدیک ہر شے پلید ہے جسے مسلمانوں کی آگ یا پانی نے چھوا ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی گھرانا دو

فطری عناصر کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، انھیں کسی غیر ہندو کو اپنے ہاں بلانے کی اجازت نہیں اگرچہ غیر ہندو اس دعوت کا کتنا ہی خواہش مند ہو یا ان کے مذہب کی طرف مائل ہی کیوں نہ ہو، ان حالات میں ان میں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا تعلق قائم ہو سکنا قطعی ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک ایسی خلیج ہے، جو عبور نہیں کی جا سکتی

آزاد ہندوستان میں یہ خلیج بڑی حد تک عبور ہو چکی ہے، کچھ اور عبور کرنے کی ضرورت ہے، مولانا محمد علی نے کوکناڈا کانگریس میں اپنے خطبۂ صدارت میں جو دعا مانگی تھی، وہ سچے دل سے اب بھی مانگنے کی ضرورت ہے کہ

" اے اتفاق تو ضرور آئے گا، ہندو مسلمان کو باہم ملا دے گا، ان کو متحد کر دیگا، لیکن آج ہمارے سامنے نہیں ہے جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں، تو آئے گا ضرور لیکن کب؟ ایک عرصہ کی مصیبتوں، صبر آزما التماسوں، اور ہمت شکن انکاروں کے بعد؟

مذہبی تعلیم سے کے حلقہ میں یہ خبر خوشی سے سنی جائے گی کہ اس ملک بلکہ عالم اسلام کے مشہور دینی عالم جناب ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی نگرانی میں مؤ ضلع اعظم گڑھ میں المعہد العالی کے نام سے ایک مخصوص نوعیت کی درسگاہ قائم کی گئی ہے، جس میں مدارس عربیہ کے لیے آسانی سے اساتذہ فراہم کرنے کی خاطر ان کو اعلیٰ تربیت دی جائے گی، اس میں تین شعبے رکھے گئے ہیں، تخصص فی علوم القرآن، تخصص فی علوم الحدیث، تخصص فی الفقہ الاسلامی، اس کی ابتدا، تخصص فی الفقہ الاسلامی میں آٹھ فضلاء کے داخلے سے کر دی گئی ہے، اسی کے ساتھ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے مرقاۃ العلوم اور حفظ قرآن اور تجوید کیلئے دار تحفیظ القرآن کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، امید ہے کہ ان مفید درسگاہوں کی طرف دینی درد رکھنے والے ارباب حل پوری توجہ کریں گے، تاکہ یہ اپنے بلند مقاصد میں ہر طرح کامیاب ہوں۔

مقالات

جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۵)

دار المصنفین کی حاضری ۱۹۳۳ء میں میرا داخلہ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں حضرت سید صاحبؒ کی سفارش سے ہوا تھا، اس لیے وہاں جاتے ہوئے اعظم گڈھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، دار المصنفین کے احاطہ میں داخل ہوتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ذرہ ذرہ مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، آم اور امرود کے درخت ہرے بھرے لگے ہوئے تھے، ان کی ہریالی میں کشش محسوس کی، اس کی مسجد اور اس کی ہر عمارت مجھ کو بہت ہی بھلی نظر آئی، اس کے احاطہ کی صفائی اور ستھرائی سے بھی متاثر ہوا، شام کو پہونچا، سید صاحبؒ کا ذاتی مہمان تھا، اس لیے ان کی خدمت میں حاضری دی، ان کے زنانخانہ کے بیرونی کمرہ میں داخل ہوا تو اس کو سادگی لیکن پرکاری کا نمونہ پایا، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، اس پر ایک عمدہ دبیز پھولدار قالین پڑا ہوا تھا، جس سے کمرہ کی زینت بڑھ گئی تھی، اس میں ایک مسہری بچھی تھی جس کا بستر بہت ہی صاف تھا، اس پر سید صاحبؒ رات کو آرام فرماتے، اسی کے پاس ایک بہت بڑا اگالدان رکھا ہوا تھا، کمرہ کی دیواروں پر چوکھٹوں میں امجد حیدرآبادی کی کچھ رباعیاں آویزاں تھیں، کمرہ کے بغل میں غسل خانہ تھا، جو صفائی میں

چمکتا دمکتا نظر آیا، وہاں ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی، عشاء کی نماز کے بعد احاطہ کے تمام لوگ ایک دسترخوان پر اکٹھے ہوئے، سید صاحبؒ کے علاوہ مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، جناب محمد عزیر صاحب، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی، جناب سید ریاست علی ندوی، مولوی محمد یوسف کوکن عمری اور جناب نیاز احمد صدیقی صاحب تھے، سید صاحب کے مکان کے سامنے ایک چبوترے پر صحن میں دسترخوان بچھا ہوا تھا، سب کے گھروں سے الگ الگ کھانا آیا، جس میں بڑا تنوع تھا، دسترخوان کے پاس آدھے درجن ملازم خدمت کے لیے خاموش کھڑے ہوئے تھے، میں نے سید صاحبؒ کے علاوہ ان میں ہر شخص کو پہلی دفعہ دیکھا، سید صاحب کی سفید داڑھی میں خضاب لگا ہوا تھا، وہ سنجیدگی اور متانت کے پیکر نظر آئے، بڑے وقار کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تو وہ میری نظر میں اس وقت علم کے پہاڑ معلوم ہوئے، مولانا مسعود علی ندوی کا جسم بہت ہی بھاری تھا، مگر توانا اور چست دکھائی دیے' وہ دسترخوان کے پاس پہونچے تو تمام لوگ اظہار تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے، انھوں نے ملازموں کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ سب بھی باادب ہوگئے، وہ دسترخوان پر سید صاحبؒ کے بغل میں آکر بیٹھے، ان کے سامنے سید ریاست علی ندوی صاحب نے جگہ لی، اور ان کے پاس ہی مولانا عبدالسلام ندوی تھے، جو مجھ کو بہت ہی سیدھے سادے' اور تمام آداب سے بے نیاز معلوم ہوئے، ان کے سامنے جناب محمد عزیر صاحب آکر بیٹھے، جو علی گڑھ کے ایم۔ اے، ال ال بی وکیل تھے، اعظم گڈھ میں وکالت شروع کی تھی، جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی دارالمصنفین سے چلے گئے تو وہ ان کی جگہ پر یہاں آگئے تھے، ان کی وضع قطع سے ظاہر ہوا کہ بہت ہی صفائی پسند ہیں، چہرہ منور تھا، جس پر تھوڑی تھوڑی داڑھی تھی، ان ہی کے پاس جناب **شاہ معین الدین احمد ندوی** تھے، جن کی عمر اس وقت اکتیس برس کی تھی، شکیل اور وجیہ نظر آئے، ان کے چہرے پر بھی تھوڑی تھوڑی داڑھی تھی بالکل ہی سیاہ، چہرہ کا رنگ بہت ہی صاف بلکہ گورا تھا، جس پر ان کی سیاہ داڑھی بہت ہی اچھی معلوم ہوتی، جسم

بھاری تو نہیں لیکن بھرا ہوا ضرور تھا، تہذیب کا کرتہ زیب تن کیے ہوئے تھے، جو ان کے جسم پر خوب کھلتا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، دسترخوان پر سید صاحبؒ اور مولانا مسعود علی کے بعد وہی نمایاں نظر آئے،
جناب یوسف کوکن صاحب مدراس کے مدرسۂ دارالسلام عمرآباد سے یہاں تصنیف و تالیف کا سلیقہ سیکھنے کے لیے بھیجے گئے تھے، ابن تیمیہؒ پر کام کر رہے تھے، یہاں رہ کر کلام پاک بھی حفظ کیا، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے بھی پاس ہوئے، یہاں سے واپس گئے تو مدراس یونیورسٹی میں لکچرر ہوگئے، پھر وہاں کے شعبۂ عربی و فارسی و اردو کے صدر بھی ہوئے، وہ اس وقت بہت ہی کمسن تھے، نیاز احمد صدیقی صاحب ایم اے ال ال بی، ال ٹی پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چھوٹے بھائی ہیں، وہ شبلی اسکول میں انگریزی پڑھاتے تھے، شبلی منزل ہی کے احاطہ میں رہتے تھے، بڑے متواضع اور خاکسار نظر آئے،
کھانا پورے آداب کے ساتھ شروع ہوا، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی بہت ہی جلد کھا کر فارغ ہوگئے اور منھ میں پان ڈال لیا، کھانے کے درمیان کچھ نہ کچھ گفتگو ہوتی رہی، لیکن اصل گفتگو کھانے کے بعد شروع ہوئی، مولانا مسعود علی ندوی پان کے کئی بیڑے کھاتے رہے، جیسے جیسے ان کے منھ میں پان کی لذت بڑھتی گئی، ویسے ہی ان کی باتوں میں آب و رنگ پیدا ہوتا گیا، مجھ کو پہلی دفعہ ان کی گفتگو سننے کا موقع ملا تھا، سید صاحب ان کے سامنے ساکت و صامت بیٹھے رہے، مولانا مسعود علی ندوی بلبل ہزار داستان بنے ہوئے تھے، مولانا عبدالسلام ندوی اس طرح بیٹھے نظر آئے جیسے وہ کہیں دور ہیں، وہاں موجود نہیں ہیں، سید ریاست علی صاحب بھی خاموش تھے، صرف کبھی کبھی زور سے ہنس دیتے، محمد عزیر صاحب مولانا مسعود علی ندوی کی باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے، مولانا کا سارا روئے سخن ان ہی کی طرف تھا، البتہ شاہ صاحبؒ بیچ بیچ میں کوئی اچھا فقرہ یا جملہ کہہ کر خود ہی قہقہہ لگا دیتے، میں پہلے سن چکا تھا کہ مولانا مسعود علی ندوی بڑی اچھی گفتگو کرتے ہیں، جس مجلس میں ہوتے ہیں کسی اور کو بولنے نہیں دیتے، جو کچھ سنا تھا، صحیح پایا، ان کی باتوں میں بڑا تنوع تھا، شام کو ٹینس

کمیں کرواسہ تے تھے، اپنے کمیں کا ذکر کیا، شہر کی خبریں سنائیں، ملک کی سیاست پر تبصرہ کیا، ان کی باتوں میں بجائے ظریفانہ رنگ تھا، اس لیے وہ قہقہوں میں سنی گئیں، جب ان کے پان کے بیڑے ختم ہو گئے تو وہ اٹھ گئے، پھر سب ہی رخصت ہونے کے لیے تیار ہو گئے، ان سے پہلے کوئی نہیں اٹھا، دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد صبح کے ناشتہ کے لیے دسترخوان پر اسی طرح جمع ہوئے، مولانا مسعود علی ندوی صبح کو ایک میل تک ٹہلنے کے لیے گئے تھے، ان کا انتظار رہا، ناشتہ کے بعد پھر ان کی گفتگو شروع ہو گئی، وہی ظریفانہ رنگ تھا، جس کے درمیان صرف شاہ صاحب کچھ بولتے، ناشتہ کے بعد سب کتب خانہ میں جا کر اپنے کمروں میں مشغول ہو گئے، بارہ بجے دن کو دوپہر کے کھانے کے لیے پھر سب اکٹھے ہوئے اور کھانے کے بعد مولانا مسعود علی ندوی کی گفتگو کے لیے ہمہ تن گوش ہوئے، قیلولہ کے لیے سب ہی اپنی قیام گاہوں میں چلے گئے، سید صاحبؒ، مولانا مسعود علی ندوی اور سید ریاست علی ندوی صاحب کے لیے علیحدہ علیحدہ تنا نخانے بنے ہوئے تھے، شاہ صاحبؒ بیوی بچوں کے ساتھ نہیں رہتے تھے، اس لیے ان کا کوئی زنانخانہ نہ تھا، ایک کمرہ میں ضروری ساز و سامان کے ساتھ رہتے تھے، ان کی چارپائی کے پاس ایک میز تھی جس پر ان کا پاندان رکھا رہتا، جو ان کی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی مشترکہ ملکیت تھی، دونوں اسی سے پان کے بیڑے خود بناتے، اس زمانہ میں شاہ صاحبؒ ترکی ٹوپی پہنتے، وہ میز ہی پر رکھی رہتی، دیوار پر ان کی ایک شیروانی لٹکی ہوئی تھی، اسی کے نیچے ایک ٹرنک اور ایک سوٹ کیس رکھا تھا جس میں ان کے کپڑے اور کچھ ضروری سامان ہوتا، ان ہی کے کمرہ سے ملا ہوا جناب نیاز احمد صدیقی کا کمرہ تھا، دونوں ایک جان دو قالب بنے ہوئے تھے، اور دوسرے حضرات کے لیے الگ الگ کمرے تھے، ظہر کی نماز کے لیے سب مسجد میں جمع ہوئے، کوئی باضابطہ موذن اور امام نہ تھا، جو پہلے پہونچ جاتا وہی اذان دے دیتا، سری نمازوں کی امامت زیادہ تر سید صاحب کرتے، جہری نمازوں کے لیے مولوی محمد یوسف کوکن کو بڑھا دیا جاتا، ظہر کی نماز کے بعد سب کتب خانہ میں اپنے کمروں میں جا کر مشغول ہو گئے، عصر کی

اذان سن کر سب مسجد میں آگئے، نماز کے بعد سید صاحب کے یہاں چائے پینے کے لیے جمع ہوئے، جب تک مولانا مسعود علی وہاں بیٹھے رہے، کوئی اور کچھ نہ بولا، وہ ٹینس کا بلا لے کر چلے گئے تو سید صاحب کی گفتگو شروع ہوگئی، یہ زیادہ تر علمی تھی، رفقاء سے ان کے کام کی تفصیل پوچھی، ان کو اپنے مشوروں سے مستفید کیا، اس موقع پر زیادہ تر شاہ صاحبؒ ہی بولتے رہے، مغرب سے پہلے یہ نشست ختم ہوگئی، پھر کچھ دیر کے بعد سب مسجد میں جمع ہوگئے، عشاء کی نماز کے بعد پھر رات کے کھانے کے لیے دسترخوان پر جمع ہوئے۔

دارالمصنفین کا شباب | دو روز دارالمصنفین میں رہ کر علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگیا، دارالمصنفین کی زندگی سے بے حد متاثر ہوا، اور یہ خیال ذہن پر چھا گیا کہ میں بھی اس بزم میں شریک ہو جاتا تو میں اپنے کو بہت خوش قسمت سمجھتا۔

میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ زمانہ دارالمصنفین کے پورے شباب کا تھا، سید صاحب کی دروس الادب، سیرت عائشہؓ، ارض القرآن، سیرۃ النبیؐ کی چار جلدیں، خلافت، خلافت اور ہندوستان، عرب و ہند کے تعلقات، خطبات مدراس، خیام اور عربوں کی جہاز رانی وغیرہ شائع ہو چکی تھیں، دروس الادب عربی کی ریڈریں ہیں، مگر وہ اتنی مقبول ہوئیں کہ اس کے ہر سال کئی کئی اڈیشن نکلے، سیرت عائشہؓ سے بہتر اب تک حضرت عائشہؓ پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، ڈاکٹر اقبالؒ نے اس کو پہلی دفعہ پڑھا تو سید صاحبؒ کو لکھ بھیجا کہ یہ ہدیۂ سلیمانی ثابت ہوئی، ارض القرآن میں عرب سے متعلق جو جغرافیائی معلومات فراہم کر دیے گئے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہے، اسی کی معلومات کو لے کر دوسرے اسکالر بہت کچھ لکھ رہے ہیں، سیرۃ النبیؐ کی جو جلدیں دارالمصنفین سے شائع ہوئی ہیں وہ تو سیرت پاک کی شاہکار ہیں، شاید صبح قیامت تک اس سے زیادہ جامع مفصل اور محققانہ سیرت کوئی اور کسی زبان میں نہ لکھ سکے گا، ۱۹۱۹ء میں خلافت کی ہنگامہ پرور تحریک چلی تو اس میں سید صاحبؒ کے دو رسالے خلافت اور خلافت اور

ہندوستانیت کی وجہ سے اس میں علمی رنگ پیدا ہو گیا، "عرب و ہند کے تعلقات" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے خطبے ہیں، مگر یہ ایسے مقبول ہوئے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان خطبوں کو سن کر کہا تھا کہ یہ دنیا کی کسی قوم کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں، خطبات مدراس میں سید صاحب نے آستانۂ رسالت میں اپنی عقیدت کے جو پھول چڑھائے ہیں، ان کی شادابی اور رعنائی ہمیشہ باقی رہے گی، یہ ان کی انشاپردازی کے شاہکار بھی ہیں، ان کی خیام پڑھ کر ڈاکٹر اقبال نے بجا طور پر کہا تھا کہ اس میں جو تحقیقات ہیں ان پر کوئی مستشرق کوئی اضافہ نہ کر سکے گا، ان کی "عربوں کی جہاز رانی" بھی ان کی تحقیق و دیدہ وری کی ایک عمدہ مثال ہے، ان کتابوں کے علاوہ وہ معارف میں جو مضامین لکھتے تھے، ان میں ان کی تحقیقی کاوش بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی، ان کے شذرات تو واقعی سونے کے ٹکڑے سمجھے جاتے۔

اس وقت تک مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند حصہ اول و دوم، اسوۂ صحابہ حصہ اول و دوم، سیرت عمر بن عبد العزیزؒ، اسوۂ صحابیات اور انقلاب الامم وغیرہ بھی نکل چکی تھیں، شعر الہند اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جن کے مطالعہ سے ادبی ذوق کی نشو و نما ہوئی، اردو شاعری اور شعراء کو سمجھنے کے لیے اس کے دونوں حصوں کا پڑھنا ناگزیر ہے، جس وقت نظر سے یہ دونوں جلدیں لکھی گئی ہیں وہ اب کسی ادیب یا مصنف کی تحریروں میں مشکل سے نظر آتی ہے، ان کی اسوۂ صحابہ کی ۲ جلدوں میں اسلام کی وہ سچی تعلیمات ملیں گی جن سے ایمان میں تازگی اور جلا پیدا ہوتی ہے، ان کی سیرت عمر بن عبد العزیزؒ میں بنو امیہ کے اس فرماں روا کے اعلیٰ کردار کا جو مرقع سامنے آتا ہے وہ موجودہ دور کے حکمرانوں کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے، اسوۂ صحابیاتؓ گو مختصر سی کتاب ہے مگر اس میں اسوۂ صحابہ ہی کا رنگ ہے، انقلاب الامم فرانسیسی مصنف موسیو لیبان کی کتاب کا ترجمہ ہے، جس کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اصل بہتر ہے یا اس کا ترجمہ، مولانا عبد السلام ندوی کے مضامین معارف میں بکثرت شائع ہو چکے تھے اور وہ شوق سے پڑھے جاتے۔

حاجی معین الدین ندوی کی دو کتابیں "خلفائے راشدین" اور "سیر المہاجرین" مکمل ہوچکی تھیں، "خلفائے راشدین" تو دار المصنفین کی بڑی مقبول تصنیف سمجھی جاتی ہے، چاروں خلفاء کے حالات ایک جگہ مطالعہ کرنے سے اس عہد کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، اسی طرح صحابۂ کرام کے حالات میں اور جلدیں ہیں، یہ دار المصنفین کا بڑا اہم سلسلہ ہے، جس کی تکمیل میں یہاں کے ایک سابق رفیق مولانا سعید انصاری نے بھی حصہ لیا، اور انھوں نے سیر انصار دو جلدوں میں اور سیر الصحابیات لکھی، جناب شاہ معین الدین ندوی نے تین مزید جلدیں لکھ کر اس سلسلہ کو مکمل کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، مولانا ابو الحسنات ندوی نے "ہندوستان میں اسلامی درسگاہیں" لکھی، اور ابھی صرف یہی کتاب لکھنے پائے تھے کہ عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہوگئے، مگر اس کتاب کی بدولت ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

یہاں سے مولانا محمد یونس فرنگی محلی کی "فہم انسانی"، "سوانح ابن رشد" مولانا عبد الباری ندوی کی "برکلے" اور "مبادی علم انسانی" اور مولانا عبد الماجد دریابادی کی "مکالمات برکلے" شایع ہوئیں تو ملک پر یہ اثر پڑا کہ دار المصنفین ٹھیٹھ مولویوں ہی کا ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ زمانے کے ساتھ ساتھ بھی چلنے کو تیار ہے، اسی طرح یہاں حکیم عبد الحئی کی "گل رعنا" نکلی تو "شعر الہند" کے ساتھ اس کتاب کی وجہ سے یہ شہرت قائم ہوئی کہ مولانا شبلی کی "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" کی روایت بھی اس ادارہ میں باقی ہے، جناب سید نجیب اشرف ندوی کی "رقعات عالمگیر" اور "مقدمۂ رقعات عالمگیر" کی وجہ سے عالمگیر کی ذات سے مسلمانوں کو جو عقیدت تھی اس میں مزید اضافہ ہوا، مقدمۂ رقعات عالمگیر دار المصنفین کی اہم ترین مطبوعات میں شمار کی جاتی ہے۔

ان کتابوں میں مولانا شبلیؒ کے انداز بیان اور اسلوب تحریر کو حتی الامکان باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اردو زبان کی یہ ساری مطبوعات نئی تھیں، اس لیے شوق سے پڑھی گئیں، جس سے دار المصنفین کا علمی، ادبی اور تحقیقی وقار تیزی سے بڑھ گیا تھا۔

رسالہ معارف کو بھی اس وقت تک بڑی شہرت حاصل ہو چکی تھی، کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر نکلسن نے اس کے مضامین سے متاثر ہو کر اس کے ناقدانہ علمی مباحث، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و معارف کی آمیزش کی داد دی اور ہندوستان کی علمی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر اقبال بھی معارف کو بہت پسند کرتے تھے، سید صاحب کو ایک خط لکھ کر یہ تحریر فرمایا:

"یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے"

مولانا محمد علی نے اس کے متعلق اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۱۹ء میں لکھا:

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، اور ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب ان میں سے اکثر پر قبضہ کر بیٹھے ہوں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرالی جائیں گی"

مولانا ابو الکلام آزاد بھی ایک خط میں سید صاحبؒ کو تحریر فرماتے ہیں:

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے اور جو ہر طرف سناٹا ہے، بحمد اللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائگاں نہیں گئیں، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی ہے کہ جو صرف خدمت علم تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے"

معارف پریس کی عمدہ طباعت و کتابت کی بہت شہرت تھی، مولانا مسعود علی ندوی کی کوشش سے اچھے اچھے کاتب اور مصحح سنگ جمع ہو گئے تھے، منشی محمد اشتیاق و منشی محمد حسن، منشی عبدالحکیم، منشی [illegible] اور منشی عطاء اللہ کی وجہ سے لکھائی چھپائی بہت اچھی ہونے لگی تھی، منشی اشتیاق کے شاگردوں میں

منشی عبدالقادر، منشی محمد اقبال اور منشی محمد صدیق بھی بہت اچھے کاتب ہوئے، مولوی عبدالباری کو پروف پڑھنے کی تربیت دی گئی تو وہ اچھے پروف ریڈر ہوئے، دفتر میں اس وقت جناب محمد ادریس وارثی صاحب تھے، جو حساب کتاب میں بڑے ماہر تھے، نہ صرف دارالمصنفین بلکہ شہر میں بھی بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، دارالمصنفین کی ہر کتاب میں طابع و ناشر کی حیثیت سے ان ہی کا نام ہوتا، دفتر میں ان کے معاون جناب یحییٰ اعظمی تھے، جو اردو کے بڑے اچھے شاعر بھی تھے، سید صاحب معارف میں ان کا کلام برابر شایع کرتے رہتے، مولوی مسعود علی ندوی کے اہتمام میں سیرۃ النبیؐ آرٹ پیپر پر بہت ہی دیدہ زیب کتابت کے ساتھ چھاپی گئی، تو سارے ملک میں اس کی طباعت کے اعلیٰ معیار کو تسلیم کیا گیا، اس کی مطبوعات کا سائز ۲۰ × ۲۶ مخصوص رکھا گیا، ان کی نہ جلد بندی ہوتی، نہ ڈسٹ کور لگتا، پھر بھی کتابت و طباعت کے مخصوص انداز و معیار کی وجہ سے بہت پسند کی جاتیں، اور دور سے دیکھ کر لوگ سمجھ جاتے کہ یہ دارالمصنفین کی مطبوعات ہیں۔

دارالمصنفین اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی ایک اہم مرکز بن گیا تھا، سید صاحبؒ نے ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں میں پورا حصہ لیا تھا، 'خلافت' 'خلافت' اور 'ہندوستان' جیسے دو رسالے لکھ کر خلافت کی تحریک میں علمی اور تاریخی رنگ پیدا کر دیا تھا، مولانا محمد علی کے ساتھ وفد خلافت میں لندن بھی گئے، وہاں سے جو خطوط لکھتے وہ اخباروں میں چھپتے، تو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے، خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت بھی کی، ابن سعود کے زمانہ میں حجاز میں جو مسائل اٹھے اس سلسلہ میں وفد خلافت کے سربراہ ہو کر حجاز بھی گئے، ان سب کی تفصیل حیات سلیمان میں ملے گی، جو شاہ صاحب نے مرتب کی ہے، ان سیاسی سرگرمیوں کو مولانا مسعود علی کی تنظیمی صلاحیتوں سے بڑی مدد ملی، اعظم گڈھ میں جب کوئی سیاسی رہنما آ جاتا تو اس کے شایان شان جلسہ کا اہتمام وہی بڑے سلیقہ سے کرتے، پھر چندوں کی فراہمی میں ان کو غیر معمولی مہارت تھی، انھوں نے خلافت کی تحریک میں ضلع اعظم گڈھ سے ایک لاکھ روپیہ جمع کیے تھے،

پورے ہندوستان میں اتنی بڑی رقم چندے میں شاید کوئی اور جمع نہ کر سکا تھا، سید صاحبؒ اور مولانا مسعود علی ندوی کے اثرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ اس زمانہ کے تمام قابل ذکر سیاسی رہنما دارالمصنفین ضرور آتے، ان میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، تصدق احمد خاں شروانی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، ان کی والدہ محترمہ بی اماں، مولانا آزاد سبحانی، چودھری خلیق الزماں، رفیع احمد قدوائی، مولانا عبدالماجد بدایونی، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ سب ہی تھے، یہ تمام حضرات دارالمصنفین آکر خوش ہوتے، اور یہاں کی علمی صحبتوں سے لطف اٹھاتے، مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مصروفیتوں کی بنا پر یہاں نہ آسکے، حالانکہ انھوں نے دارالمصنفین کی تاسیس کے موقع پر اپنے ایک مکتوب میں سید صاحبؒ کو تحریر فرمایا تھا:

"دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہونچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، آخری فیصلہ تو ایک حد بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں، بشرطیکہ کام ہو اور صحیح و خالص ہو۔"

اس کی مجلس انتظامیہ کے پہلے صدر نواب عماد الملک تھے، جو بلگرام کے رہنے والے تھے، مگر اپنے زمانے میں اپنی غیر معمولی قابلیت اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے اتنے مشہور ہوئے کہ نظام حیدرآباد نے اپنے یہاں بلاکران کو ریاست کا مدارالمہام یعنی وزیر اعظم بنایا، انھوں نے یہاں کی مجلس انتظامیہ کی صدارت قبول کی تو اس ادارہ کی عزت بڑھی، مگر ان کو بھی اس اعزاز کا اعتراف رہا، وہ اس ادارہ کو مختلف صورتوں سے حیدرآباد کی ریاست سے فائدے بھی پہونچاتے رہے، جب ان کی وفات ہوئی تو سید صاحبؒ نے بہت ہی رنج و غم سے معارف میں یہ لکھ کر نوحہ کیا:

"نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، مولانا حالی کو رخصت کرتے وقت ہم نے [illegible] پر ماتم کیا، لیکن نواب عماد الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں"

اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ ہستی گرامی جس نے ۱۳ر جنوری ۱۹۱۴ء میں الوداع کہا، ہمارے کارواں قافلہ کا آخری مسافر تھا، اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہوگیا، وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ یونیورسٹی مدارس کا نتیجہ تھی، گذر گیا، وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہوگیا، یعنی آیندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے تعلیم یافتہ نہ ہوں گے، بلکہ انگریزی درسگاہوں کے بیٹے ہوں گے، اب شرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا بلکہ مغرب، اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لیے جوشِ دل اور اخلاصِ عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ،

فیا ویلاہ علی فقید الاسلام ویا خیبۃ للمسلمین۔

ان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ بہادر اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہوئے، جو حیدرآباد کے وزیر امور مذہبی تھے، وہ ادیب بھی تھے، شاعر بھی، عالم بھی، رئیس بھی، حسن، جمال، وقار، متانت اور سنجیدگی کے پیکر بھی تھے، اس لیے ان کی صدارت دارالمصنفین کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑ گئی، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ساتھ ایک مجلس عاملہ بھی ہے، مجلس عاملہ کے پہلے صدر مولانا حمیدالدین فراہیؒ ہوئے، جو علم تفسیر میں پورے ہندوستان میں کیا، بلکہ شاید تمام اسلامی ممالک میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے، وہ مولانا شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے، ان کی وجہ سے بھی دارالمصنفین کا علمی وقار بڑھتا رہا۔

ان کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی مجلس ارکان کے صدر ہوتے رہے، وہ مستند عالم تو نہیں لیکن علماء کی صف میں ان کا نمایاں مقام تھا، پھر شعر و ادب کے میدان کے تو یکہ تاز رہے، تو مفسر قرآن بھی ہوئے، فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، مکالمات برکلے، اسلام اور تصوف، محمد علی کی ذاتی ڈائری، حکیم الامت، سفر حجاز، بشریت انبیاء، قرآنی سیرت وغیرہ کے مصنف بھی ہیں۔

۳۳ء تک دار المصنفین کا دور ہر لحاظ سے زریں بن چکا تھا، میں پہلی دفعہ یہاں حاضر ہوا تو اس سے میرا متاثر ہونا لازمی تھا اسی پُر کیف اور با وقار ماحول میں شاہ صاحب کی علمی زندگی پروان چڑھ رہی تھی،

خمستان پر شاہ صاحب کا ایک تبصرہ

فروری ۱۹۳۴ء کے معارف میں شاہ صاحب کا ایک تبصرہ پنجاب کے مشہور شاعر جناب اثر صہبائی کے مجموعۂ کلام خمستان پر شایع ہوا، اس زمانہ میں جناب اثر صہبائی ایک تیس برس کے جوان شاعر تھے، لیکن ادبی حلقوں میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی، ان کا یہ مجموعۂ کلام دو سو چھہتر (۲۷۶) صفحے پر مشتمل تھا، اس کے پانچ حصوں کے نام خود انھوں نے یہ رکھے تھے: تخیلات سمن زار، جام صہبائی، راحت کدہ اور ستارے، پہلے میں غزلیں تھیں، دوسرے میں مختلف کیفیات، جذبات اور مناظر وغیرہ پر مسلسل نظمیں تھیں تیسرے میں وہ تاثرات تھے جو شاعر کے دل سے اپنی مرحومہ رفیقۂ حیات کے غم و الم میں نالے بن کر نکلے تھے، چوتھے میں رباعیات اور پانچویں میں متفرق اشعار تھے، اس مجموعہ کے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مشہور شاعر جناب پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی دہلوی کی تعریفی تحریریں بھی تھیں، حضرت سید صاحبؒ نے اپنے تبصرہ کا عنوان 'جرعۂ' رکھا تھا، مگر جب اپنی اس تحریر کو اپنے مجموعۂ مضامین نقوش سلیمانی میں شایع کیا تو اس کی سُرخی خمستان ہی رکھی، اس کی ابتداء جس طرح کی اس کو ہم یہاں پر اس خیال سے نقل کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو کہ شاہ صاحب جس ادبی فضا میں زندگی گذار رہے تھے اس کا کیا رنگ تھا اور اس سے ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، ان میں فطری صلاحیت پہلے سے موجود تھی، حضرت سید صاحبؒ کی شاگردی میں یہ دبی ہوئی صلاحیت برابر ابھرتی رہی، تو سید صاحبؒ خمستان کے مقدمہ میں اثر صہبائی کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

> "کشمیر کے دست فیض نے نہ صرف خطۂ کشمیر کو رشک گلزار بنایا ہے، بلکہ جہاں جہاں بہار و خزاں کے انقلابات نے اس کی شاخوں اور ڈالیوں کو اڑا کر پہونچا دیا، ہر جگہ ایک نیا چمن لگا دیا اور نیا گلشن کھلا دیا، پنجاب کی سرزمین قدرۃً اس کا حق زیادہ رکھتی تھی اس لیے وہیں کے سرسبز و شاداب قطعوں نے

سب سے زیادہ ان خانہ برانداز انِ چمن کو اپنی آغوش میں لیکر ان کی آبیاری کی اور پوسے پنجاب کو اپنی نکہت بیزیوں سے گلکدہ بنادیا، پنجاب میں سیالکوٹ کشمیر سے قریب تر ہے اور یوں بھی علم وادب اور فضل وکمال کا ہمیشہ سے گہوارہ ہے، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کو دو دفعہ شاہجہاں کی قدردانیوں نے چاندی میں تلوادیا اور ہند سے لیکر روم تک ان کی تصنیفات نے اپنا سکہ بٹھادیا، وہ اسی خوش سواد شہر کی خاک سے اٹھے تھے اور اس عصر جدید میں اقبال سا فلسفی اور شاعر پیدا کرنے پر اس کو بجا طور سے فخر وناز ہے، اور یہ مرغ خوش خوان بھی اسی ملک جنت نظیر کے باغوں سے اڑکر یہاں تک پہونچا ہے، اس خمستان کا ساقی بھی اسی میکدہ کا صہبائی ہے"۔

پھر صہبائی کی تعریف یہ کہہ کر بھی کرتے ہیں کہ ان کے فطری شاعر ہونے میں کلام نہیں، ان کا دل عشق ومحبت سے لبریز اور نالہ وشیون سے معمور ہے، چند سال ہوئے کہ ان کی رفیقۂ حیات نے ان کو دائمی الوداع کہا، اس حادثہ نے ان کو اور نازک دل شاعر بنادیا ہے، جہاں ذرا ٹھیس لگی اور بلبلا اٹھے، اسی لیے ان کی شاعری میں سرور وشادمانی نہیں بلکہ حزن وملال ہے، اور اس پر مزید یہ کہ ان کے غم و افسوس کی آنکھوں میں آنسو نہیں بلکہ صبر وسکون اور تسلی وتعزیت کے غمگین فلسفیانہ اشارات ہیں، ان کی غزلوں میں محبت کے اثرات اور عشق کے جذبات کے بجائے عشق ومحبت کے حکیمانہ رموز واسرار فاش ہوتے ہیں۔

ان کی مزید تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بچپن سے شعر کہتے ہیں اور اپنے ہموطن شاعر اقبال کے کلام کو ہمیشہ غور سے پڑھتے رہے ہیں، خیام وحافظ کا کلام بھی ان کے مطالعہ میں رہا ہے، میر و غالب کی زبان اور طرز بیان سے بھی متاثر ہوئے، میری رائے میں صہبائی میں استاد شاعر ہونے کے بجائے حکیم شاعر ہونے کی صلاحیت زیادہ موجود ہے، ان کے الفاظ میں شیرینی اور ترکیبوں میں فارسیت کی پوری چاشنی اور ساتھ ہی ان کے خیالات کے بازوؤں میں معانی بلند تک پرواز کی

پوری قوت، ان کے تخیل کے پردہ میں فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں سے ان کی رباعیوں اور قطعات زیادہ بکیف، زیادہ پُر مغز اور زیادہ موثر ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ رباعی گوئی کے لیے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو، ترکیبیں چست ہوں اور رواں ہوں، اور پہلے مصرع سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرع میں پورا زور نمایاں ہو، یہ تو لفظی خوبیاں ہیں، معنوی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلند حقایق اور معانی ادا ہوں، صہبائی کی رباعیات میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔

سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صہبائی کہیں کہیں خوب کہہ جاتے ہیں، لیکن ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جو گو فصیح ہیں مگر ذرا سی الٹ پھیر سے فصیح تر ہو سکتے ہیں، مثلاً صہبائی کا ایک مصرع یہ ہے

ع گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں، رحمت بن بن کر چھائی ہیں

سید صاحبؒ اس میں خفیف سی ترمیم اس طرح چاہتے ہیں:

ع گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں اور رحمت بن کر چھائی ہیں

صہبائی کا ایک حسب ذیل مصرعہ تھا:

ع کعبہ میں بت خانے میں یہ بات کہاں میخانے کی

سید صاحبؒ اس میں بھی خفیف سی ترمیم کے خواہاں ہوئے:

ع کعبہ اور بت خانے میں یہ بات کہاں میخانے کی

صہبائی کا ایک شعر یہ ہے

یوں راہِ وفا کی ہوتی ہے، یوں مرنے والے مرتے ہیں
اک داغ سی شمع کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے

صہبائی کا ایک اور شعر یہ ہے

برسات کی چاندنی راتوں میں دیکھے تو کوئی صہبائی کو

لب پر ہیں مناجاتیں لاکھوں، ہاتھوں میں بھی پیمانہ ہے

سید صاحبؒ نے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں یہ تغیر کرنا پسند کیا:

لب پر ہیں مناجاتیں لاکھوں اور ہاتھوں میں پیمانہ ہے

سید صاحبؒ نے صہبائی صاحب کو یہ بزرگانہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے کلام کی اشاعت میں اُس وقت تک تاخیر کریں جب تک اس کی صحت کا ہر طرح یقین نہ ہو، شراب جس قدر پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پرجوش اور باکیف ہوتی ہے۔

یہ مجموعہ معارف میں ریویو کے لیے آیا تو سید صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کے ادبی ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان ہی کو اس پر ریویو لکھنے کو فرمایا، وہ جو کچھ لکھ چکے تھے اس سے زیادہ شاہ صاحبؒ کیلئے لکھنے کی گنجائش نہ تھی، لیکن وہی ساری باتیں اپنے انداز میں کہیں، پہلے تو ان کے کلام کی تعریف یہ لکھ کر کی:

"جناب اثر اپنے اکثر معاصر شعرار کی طرح محض قافیہ پیما نہیں، بلکہ فطری شاعر ہیں، جس کی جھلک ان کے کلام کی ہر صنف میں نظر آتی ہے، لیکن میرے خیال میں وہ غزل گوئی کے بہ نسبت رباعی گوئی میں زیادہ کامیاب ہیں، اگر وہ اپنی شاعری کو رباعی گوئی تک جو اور اصناف سخن سے زیادہ مشکل ہے، محدود کر دیتے تو زیادہ کامیاب شاعر ہوتے، ان کی بیشتر رباعیاں نہایت خوب ہیں، ان میں خیام کی طرح رندانہ اور حکیمانہ ہر قسم کے خیالات ہیں۔"

ان کی غزل گوئی کے بارہ میں یہ لکھا:

"تغزل میں جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، ان کی شاعری نہایت پرکیف ہے اور ان کے سرود تغزل میں سوز و گداز، معرفت و حقیقت، شوخی و رنگینی، رندی و سرمستی اور اخلاق و حکمت

وغیرہ ہر قسم کے نغمے موجود ہیں۔"

اس کے بعد اپنے فاضل استاذ کی تقلید میں ان کی شاعری سے متعلق اپنے ادبی ذوق کی بنا پر مفید مشورے بھی دیے، لکھتے ہیں:

"جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، جناب اثر کی شاعری نہایت کامیاب ہے، لیکن ابھی کلام میں پوری مشق اور پختگی نہیں ہے، اسی لیے وہ الفاظ اور طرز ادا کو خیالات کا ہم آہنگ نہیں بنا سکتے، اور طرز ادا اور زبان کی خامیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔"

ان خامیوں کی نشاندہی اپنے استاذ ہی کی طرح کی، لیکن انداز ان کا اپنا تھا، اثر صاحب کا ایک مصرعہ یہ تھا:

بجلیاں تھیں بھری ہوئی زمزمۂ رباب میں

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وزن کے لحاظ سے بجلیاں کا تلفظ صحیح نہیں ادا ہوتا، اگر اسے "برق تھی کون سی بھری" سے بدل دیا جائے تو یہ نقص دور ہو جائے گا۔

ان کے اس مصرعہ پر

سو سو تبسمات ہیں ان کی نگاہ میں

شاہ صاحب یہ توجہ دلاتے ہیں کہ اردو میں تبسمات الف ت کے ساتھ جمع غیر مستعمل یا کم از کم غیر فصیح ہے، تبسم ہی جمع اور کثرت دونوں مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

ایک مصرعہ یہ بھی تھا:

ٹوٹ کر دل میں رہ گئے آنسو

شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ آنسوؤں کا ٹوٹ کر دل میں رہ جانا کوئی محاورہ نہیں۔

ایک اور مصرعہ یہ تھا:

فضائیں عاشقی کی جھومتی ہیں

شاہ صاحبؒ نے اس پر یہ رائے دی کہ اولاً عاشقی کی فضاؤں کا جھومنا خود قابلِ غور ہے، اور اس مفہوم کو صحیح بھی مان لیا جائے تو جھومنے کے بجائے "وجد میں ہیں" ہونا چاہیے۔

اثر صاحب کے حسب ذیل دو شعروں پر بھی شاہ صاحبؒ کی نظر گئی ؂

یہ دل اک داغ ہے کتنا طلسم انگیز ہے بیکن کبھی صحنِ گلستاں ہے کبھی صحرائے ویراں ہے
کبھی اے شیخ رندوں کی کرامت تو نے دیکھی ہے اٹھے دستِ دعا، اور جھوم کر ابرِ بہار آئے

شاہ صاحب کا خیال ہوا کہ ان اشعار میں تھوڑی سی تبدیلی اور تقدیم و تاخیر سے بندش زیادہ چست اور فصیح ہو سکتی ہے اور شاعر کے خیال میں زیادہ زور پیدا ہو سکتا ہے، اس لیے پہلے شعر کے پہلے مصرع میں یہ ترمیم کی:

یہ دل گو داغ ہے لیکن طلسم انگیز ہے کتنا

اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں یہ تبدیلی چاہی:

اِدھر دستِ دعا اٹھے اُدھر ابرِ بہار آئے

اثر صاحب کا ایک مصرع یہ بھی تھا:

جو ناداں ہر بلا کو اک بلائے آسماں سمجھے

شاہ صاحبؒ نے اس میں یہ تبدیلی کی:

جو ناداں ہر مصیبت کو بلائے آسماں سمجھے

اور لکھا کہ اک کا حشو بھی حذف ہو جاتا ہے اور بلا کی بے ضرورت تکرار کا نقص بھی جاتا رہتا ہے۔

اثر صاحب کے ان دو اشعار پر بھی ان کی نظر گئی ؂

خضرِ رہ بحرِ عقیدت میں ہے دربان تیرا ڈھونڈنے آیا ہے یاں سایۂ داماں تیرا

صبحِ خنداں ہے موسمِ گل ہے　　　　نغمہ زن اپنی لے میں بلبل ہے

شاہ صاحب اپنے ذوق سے ان اشعار کی بندش کو زیادہ چست اور فصیح بنانے کے خیال سے پہلے اور دوسرے شعر کے آخری مصرعوں میں یہ تبدیلی چاہتے ہیں:

ع ڈھونڈنے در پہ تیرے آیا ہے داماں تیرا

ع نغمہ پیرا چمن میں بلبل ہے

شاہ صاحب کو شاعری میں صحت زبان، انتخاب الفاظ اور بلاغت ادا کا بڑا خیال رہتا، اور ان کی دلیل یہ تھی کہ گو حسن ہر لباس میں حسن ہے، لیکن ظاہری لباس کی خوبی حسن کو اور دوبالا کر دیتی ہے، ہمارے خیال میں کوئی صاحبِ مذاق حسن کو گدڑی میں دیکھنا اور شرابِ انگور کو بلوریں ساغر کے بجائے جامِ سفال میں پینا پسند نہ کرے گا،

ان کی اس مختصر سی تقریظ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ان کو اپنے استاد کی شاگردی میں ان کے ذوق کی جلا کس طرح ہو رہی تھی۔

مستشرقین پر شاہ صاحب کے خیالات

اسی زمانہ میں ہندوستان اور مصر میں یہ بحث چل رہی تھی کہ مستشرقین کی علمی سرگرمیوں سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے یا نقصان، ایک گروہ کہتا کہ ان کی زہر چکانیوں سے شدید نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے، دوسرا گروہ ان کی علمی سرگرمیوں سے مرعوب تھا، وہ کہتا کہ ان سے نقصان کم، فائدہ زیادہ پہونچا، مصر میں ان متضاد خیالات پر دو اہم مضامین نکلے، ایک تو ڈاکٹر حسین ہرادی اور ایک ڈاکٹر ذکی مبارک کا تھا، اول الذکر نے ان لوگوں کی ترجمانی کی جو اس خیال کے تھے کہ مستشرقین کی ساری سرگرمیاں مسلمانوں کے لیے سراسر مضر ثابت ہو رہی ہیں، ان کے دلائل یہ تھے:

ان مستشرقین کے مباحث میں بہت سی خلاف عقل و قیاس باتیں نظر آتی ہیں خصوصاً جو مذہب اسلام پر ہیں ان میں اسلام کی ایسی عجیب و غریب تصویر پیش کی جاتی ہے جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا،

مثلاً مارشل اپنی کتاب شادی میں لکھتا ہے کہ مصر میں اسلامی پردہ کا یہ اثر ہے کہ وہاں چودہ ۱۴ سال کی عمر کے بعد ماں بھی اپنی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، مگر اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر یہ بھی ہے کہ مصر کی لڑکی اپنے چہرے کے علاوہ باقی جسم کے تمام حصوں کو مردوں کے سامنے عریاں کر سکتی ہے، اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) محض ایک زن پرست آدمی تھے، یہ مستشرقین مسلمانوں کے کسی ملک کی قدیم یا جدید تاریخ لکھتے ہیں تو محقق بن جاتے ہیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ نہایت لغو، مہمل، ذلیل، رکیک بلکہ جھوٹ باتیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً ایک مستشرق کا خیال ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ ایک جنگی مذہب کے بانی تھے جس کو انسانی فضائل سے کوئی تعلق نہیں، مشہور پروفیسر مارگولیتھ نے اپنی کتاب "تاریخ العالم" میں یہ نادر تحقیق پیش کی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عبداللہ کے بیٹے ہیں، اور عبداللہ عرب میں اس لڑکے کو کہا جاتا تھا جس کا باپ لامعلوم ہو، بہت ممکن ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باپ کا نام عبداللہ بھی اسی وجہ سے پڑا ہو، اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دل شکن اور تکلیف دہ باتیں درج ہیں، لجنۃ العمل المغربی اسلام کے متعلق خرافات کا ایک زہر چکاں مجموعہ ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ شمالی افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں کی مادری زبان عربی ہے، عربی کی اہمیت گھٹا کر وہاں کے باشندوں کو مقامی زبانوں کے زندہ کرنے کے دام میں پھنسایا جائے تاکہ وہ عربی زبان کو بھول کر قرآن کو نہ سمجھ سکیں، یورپ کی یونیورسٹیوں میں طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تعلیم اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ استعماری مشن اچھی طرح چلائیں، ان ہی میں سے کچھ مستشرقین بن جاتے ہیں جن کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے ذہن میں ایک نظریہ یا ایک خیال فرض کر لیتے ہیں، اس کے بعد اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں، اگر قرآن میں ان کو کوئی ایسی شے مل جاتی ہے جو ان کے مفید مطلب ہے یا اسے کھینچ تان کر اپنے مقصد کے مطابق بنا سکتے ہیں تو فوراً اسے لے لیتے ہیں اور اگر قرآن ان کے

مقصد کو پورا نہیں کرتا تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے ہی نہیں، مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے چیف ایڈیٹر موسیو ونسنک نے اپنی غیر معمولی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کی مکی سورتوں میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ ابراہیمؑ کعبہ کے معمار یا پہلے مسلمان تھے، ان میں ابراہیمؑ کی حیثیت محض ایک رسول کی ہے جو دوسرے انبیاءؑ کی طرح اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، ان سورتوں میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ ابراہیمؑ کے کسی تعلق کا بھی ذکر نہیں، موسیو ونسنک لکھتا ہے کہ مدنی سورتوں میں یہ حالت بدل جاتی ہے، ابراہیمؑ حنیف مسلم اور ملت ابراہیمی کے بانی بتا دیے جاتے ہیں، جنھوں نے اسمٰعیلؑ کے ساتھ خانہ کعبہ کو بنایا، ان مفروضات سے یہ نتیجہ نکال کر گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ میں یہودیوں پر اعتماد کیا، لیکن جب وہ ان کے دشمن ہوگئے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی ذکاوت اور عقل سلیم سے ابو العرب ابراہیمؑ کی ایک نئی شان پیدا کر دی، اس طرح اس زمانہ کی یہودیت سے گلو خلاصی حاصل کرکے ابراہیمؑ کی یہودیت سے جو اسلام کا منبع اور مولد ہے رشتہ جوڑنا آسان ہوگیا، اور جب مکہ والوں نے ان کے پیغمبرانہ خیالات کو قبول کرنا شروع کر دیا تو اس وقت ابراہیمؑ اس مقدس شہر کے مقدس گھر کے بانی ہوگئے، ونسنک نے اپنی اس تحقیق میں بظاہر قرآن کی ایک ایک آیت کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے، لیکن اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس نے اپنی اس تحقیق میں انتہائی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے اور اس کذب صریح سے اس کا مقصد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب ہے، وہ نہایت بے باکی سے دعویٰ کرتا ہے کہ مکی سورتوں میں ابراہیمؑ کا ذکر معمار کعبہ کی حیثیت اور اسمٰعیلؑ کے ساتھ ان کے کسی تعلق کا ذکر نہیں ہے اور مدنی سورتوں سے ملت ابراہیم کا ذکر شروع ہوتا ہے، لیکن یہ تینوں دعوے سراسر جھوٹ ہیں، سورۂ ابراہیم خود مکی ہے، جس میں نہایت واضح طور پر کعبہ اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے تعلق کا تذکرہ موجود ہے ابراہیم رکوع ۶ میں حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ہے: "خدا کا شکر ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل

ور انحق دیے، میرا رب دعا کا سننے والا ہے"۔ سورۂ انعام بھی مکی سورہ ہے، اس کے رکوع ۲۰ میں
ملت ابراہیمی کا ذکر اس طرح ہے کہ "وہی ٹھیک دین ہے جو ابراہیم کا دین ہے، جو ایک خدا کے ہوگئے
تھے، اور مشرکین میں نہ تھے" اور پھر سورۂ نحل کی مکی سورہ میں ہے کہ "ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی
کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو، جو ایک خدا کے ہو رہے تھے اور مشرکین میں نہ تھے (انعام ع ۲۰)
ان صریح آیات کے بعد ونسنک نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سراسر بددیانتی اور خیانت ہی پر مبنی ہے،
یہ مستشرقین اسلام یعنی ملت ابراہیمی کو یہودیت سے ماخوذ بتاتے ہیں جو یہوداہ کی جانب منسوب ہے
لیکن یہوداہ ایک شخص تھا جو حضرت ابراہیمؑ سے سینکڑوں برس بعد ہوا ہے، پھر ظاہر ہے کہ ملت ابراہیمی
یہودیت سے کیسے ماخوذ ہو سکتی ہے، مستشرقین کے اس قسم کے خرافات اور غلط بیانات کی داد
لوگوں سے ملتی ہے۔

یہ تو ان لوگوں کی ترجمانی ہوئی جو مستشرقین سے بدظن ہیں، اب ان لوگوں کے خیالات بھی
سامنے آجائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مستشرقین سے نقصان سے زیادہ فائدہ پہونچا ہے، اس کی ترجمانی
مصر کے ڈاکٹر زکی مبارک نے کی ہے،

وہ لکھتے ہیں کہ اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین مستعمرین کی فوج کا طلیعہ ہیں اگر بالفرض وہ یہی
تو یہ طریقہ صحیح نہیں کہ ہم ان مستعمرین کے دشمن بن جائیں اور ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیں،
اس کے بجائے ہم کو ان کے استعمار کے تدارک کے لیے ان کے علوم و فنون اور ان کے اسرار کا پتہ
لگانا چاہیے، اور جس طرح وہ ہم پر وار کرتے ہیں ہم بھی ان پر وار کریں، یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سارے
مستشرقین دام استعمار کے حلقہ میں بعض ایسے مستشرقین بھی ہیں جو صحیح معنوں میں عالم کہلانے کے
مستحق ہوتے ہیں، ان میں اگر استعمار کا جذبہ ہوتا بھی ہے تو ان کے علمی ذوق کی وجہ سے دب جاتا ہے
اور وہ مشرق کے شرف و عظمت کے بڑے نقیب اور اس کی تہذیب و معاشرت بلکہ اس کے مذہب

بڑے حامی بن جاتے ہیں، مثلاً بہت سے مستشرقین بصریوں اور کوفیوں کے صرفی و نحوی در بر مشغول رہے ہیں، مصادر کے جمع اور ان کے نصوص و شواہد اور علمائے فن کے فیصلوں کی طبع، میں برسوں گذار دیے ہیں، مختلف قبائل کی بولیوں اور ان کے لہجوں کے اختلاف کی تحقیق مدتیں صرف کی ہیں، بعض مستشرقین غلطیاں ضرور کرتے ہیں جو عموماً کسی متن کی شرح کے سلس ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی باریکیوں اور اداؤں سے ناواقف ہوتے ہیں ایسی غلطیاں موسیو ڈوزی نے نفح الطیب اور مار گولیتھ نے معجم الادبا کی تصحیح میں ضرور کی ہیں لیکن ان دونوں نے ان دو اہم کتابوں کو شایع کرکے عربی زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے یہ صحیح ہے کہ بہت سے مستشرقین اسلام کے متعلق ایسے خرافات لکھتے ہیں کہ کسی طرح علما اور محققین کے شایان شان نہیں لیکن ان اعتراضات سے بعض مذہبی پہلوؤں کی خدمت بھی ہو جاتی ہے انھوں نے اپنی اسلام دشمنی کے باوجود قرآن اور حدیث کے متعلقات پر نہایت عمدہ تالیفیں طبع کیں، ان کی بنائیں، ان کی بہتر سے بہتر ترتیب اور تبویب کی، موسیو ونسنک پر چاہے جتنے اعتراضات کیے جائیں اس نے حدیث نبوی پر اپنی تالیف سے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں حسن نیت شامل نہ تھا، پھر بھی غیر ارادی طریقہ سے اسلام کی خدمت ہو گئی امریکہ اور یورپ میں آثار اسلامیہ کی اشاعت پر جتنا کام ہو رہا ہے مسلمانوں کے ملکوں میں نہیں

افکار کی زندگی ان پر بحث و تنقید ہی میں ہے، مسلمان مخالف تنقید نگاروں کے شر سے خیر کے لیے استفادہ کر سکتے ہیں، اس بات کو کوئی کیسے نظر انداز کر سکتا ہے کہ مستشرقین نے ہم سے تین صدی پہلے اسلامیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا، جس سے ان کی علمی تحقیقات ہر شعبہ میں پھیل ہوئی ہیں، کس قدر شرم کی بات ہے کہ جامع ازہر کے اساتذہ کو چند برسوں پہلے تک اسلامی تاریخ پڑھانے کا ڈھنگ نہیں معلوم تھا، جامع ازہر کے ادبی کالج میں عربی زبان کے طلبہ کی تعدا

بں ہے حتٰی سار بن یونیورسٹی میں ہے، پیرس کی السنۂ مشرقیہ کی درسگاہ میں عربی کے استے
ہ آخذ ہیں کہ مصری دارالکتب میں ان کا نام بھی نہیں، یہ ضرور ہے کہ مستشرقین کے سامنے
، اپنے اغراض ومقاصد ہوتے ہیں، لیکن کون کہتا ہے کہ بے دیکھے بوجھے ان کی پیروی کی جائے
نیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی کوششوں سے لغوی اور اسلامی درس میں زندگی پیدا
دنیا میں کوئی چیز خالص خیر اور خالص شر نہیں ہوتی، لیکن مستشرقین کے کاموں میں نفع کا پہلو
ہا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حضرت سید صاحبؒ کی فرمایش پر مصر کے دونوں مذکورۂ بالا فضلاء کے
ن کی تلخیص کی، جو اپریل ۱۹۳۴ء کے معارف میں شایع ہوئی، اس کے شروع میں انھوں نے
لمانہ رائے لکھی ہے، وہ ان دونوں مضامین سے کم نہیں، بلکہ بعض حیثیت سے ان سے
ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس سیاسی دور میں جب کہ ہر کام اور ہر عمل کی تہہ میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے، مشرقیات اور اسلامیات کے متعلق مستشرقین کی تحقیقات کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انھوں نے ساری ساری عمریں اسلامیات کی تحقیق میں صرف کر دیں، اور بڑی جانکاہ محنت اور روحانی ومالی قربانی برداشت کرکے مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی گذشتہ عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کی نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلایا، اور بڑی مشقت اور بڑے اخراجات برداشت کر کے انھیں حاصل کیا اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشی لکھے، ان کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کیے، اسلامی موضوع پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں اور اسلامی علوم وفنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع لٹریچر فراہم کر دیا جو مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا،

> ان کی ان اسلامی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کی محنت و جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہے، لیکن اسی کے ساتھ جہاں اسلام کے متعلق ان کے افکار، خیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس لیے کہ اسلامی مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات میں انھوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے، یا تو وہ مشرقی روایات، مشرقی مذاق اور اسلامی ذوق و نظر سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے اسلامیات کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں، یا عمداً وہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں، بہرحال جو صورت بھی ہو، ان کی غلطیاں علم و فن کی خدمت اور تحقیق اور ریسرچ کے پردہ میں ہوتی ہیں، یہ نمایاں تحقیق اور ریسرچ کا ہے اس لیے ان سے مسلمانوں اور غیر قوموں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلتی ہیں، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فلسفہ، عجمی دہریت اور ہندی خرافات، کسی سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہونچا ہے، جس کے مظاہر آئے دن آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں، اس لیے مذہب اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔"

شاہ صاحبؒ نے یہ ساری باتیں اب سے تقریباً پچاس سال پہلے لکھی تھیں لیکن اس وقت سے اب تک بہت سے اور ایسے مستشرقین پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں جو اپنی مناظرانہ تحریروں، مجادلانہ استدلالوں، گمراہ کن منطقیانہ مغالطوں، پھر تحریفات، تلبیسات، دور از کار قیاسات اور احتمالات سے معلومات کا سلسلہ پیدا کر کے اپنے تعصب کی چنگاریوں سے مستند معلومات اور واقعات کو جلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، طامس کارلائل نے اپنے زمانہ کے ایسے مصنفین کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کی تحریریں قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں، گر اپنی روسیاہی کا خیال کیے بغیر وہ کذب و افترا سے

بھری ہوئی ایسی اشتعال انگیز تحریریں لکھنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے لیے جہاد بالقلم کے بجائے جہاد بالسیف کا حکم جاری ہو تو کوئی تعجب کی بات نہ ہونی چاہیے، لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان کی ایسی تحریریں ان کے احساسِ کمتری کا بھی نتیجہ ہیں، وہ اپنی عیسائیت کی فرسودگی اور کہنگی سے روز بروز کچھ ایسے مایوس ہوتے چلے جاتے ہیں کہ اسلام اپنی جاندار تعلیمات کی وجہ سے ان کے جسم میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے، ان کو غیر شعوری طور پر احساس ہے کہ اسلام میں توحید، رسالت، ایمان پروری اور اخلاق کی اعلیٰ تعلیمات ہیں، وہ پھیلتی رہیں تو رسالِ مصطفویؐ افتراقِ بولہبی ہے اور کہیں یہ ہلال قسمتِ عالم کا کوکبِ تابندہ نہ بن جائے، اور اس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ نہ ہوتی رہے، ان کا ہر فرد اپنی زبانِ حال سے یہ کہتا نظر آتا ہے کہ

ع ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

اس بیداری کو روکنے کے لیے جہاں یورپ کے اربابِ سیاست نے اپنا سیاسی اور جنگی محاذ قائم کر رکھا ہے، وہاں مستشرقین نے اپنا علمی محاذ بھی کھول رکھا ہے جس میں تحقیقات کے نام پر ان کا حیلۂ افرنگی اور ان کی عقل کی روباہی زیادہ کام کرتی ہے، ان کے جوابی حملہ کے لیے ضرورت تو اس کی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد و افکار پر اسی طرح جارحانہ حملہ بولا جائے، مگر ان کو ہم پر یہ برتری اس لحاظ سے حاصل ہے کہ وہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، مگر ہم ان کے پیغمبر علیہ السلام کے خلاف کچھ کہیں تو ہمارے ایمان اور اسلام کے اذعان میں خلل پڑتا ہے، اس کے علاوہ ان کی افترا پردازی کا آرٹ اور اس کے ابلاغ کے وسائل و ذرائع اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہم ان کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے، مگر ان کا مقابلہ موثر طریقہ پر اس طرح ہو سکتا ہے کہ پوری ملتِ اسلامیہ کو اپنے اس بلند ذہنی تخیل پر جس کو ہماری اصطلاح میں

ایمان کہا جاتا ہے غیر متزلزل یقین اور اذعان پیدا ہو جائے، وحدت ایمان اور وحدت عمل کی ناقابل شکست قوت ہم میں برابر پیدا ہوتی رہے تو غیروں اور مستشرقوں کی زہر چکانی اور اسلام دشمنی ہم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی، ہمارے لیے یہ بشارت ہے، سہ

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

(باقی)۔

حیات سلیمان

"حیات سلیمان" بحمداللہ چھپ کر شایع ہو گئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی محض سادہ سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات، واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس میں ان کے دور کی تمام ملی و قومی وسیاسی وعلمی وادبی ولسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز، واردھا اسکیم، تحریک جنگ آزادی وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین کی تاسیس اور سال بسال اس کی ترقی کی روداد اور سید صاحب کا سفر بھوپال، ترک قیام دارالمصنفین، ہجرت پاکستان، پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران ان کی علمی خدمات، اور پھر خلافت کے مختلف وفود کے رکن وصدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی خود سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب ہر لحاظ سے بالکل "حیات شبلی" کا مثنیٰ ہے۔ مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: ۲۲ روپیے ۵۰ پیسے

"منیجر"

کلامِ اقبال میں رومی کی شعری تلمیحات و اقتباسات

از پروفیسر خواجہ عبدالحمید یزدانی گورنمنٹ کالج لاہور

(۲)

زبورِ عجم کے آخری حصے میں علامہ نے فنونِ لطیفۂ غلاماں سے بحث کی ہے، جس میں غلاموں کی موسیقی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس پر گویا موت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، اور یہ سوز و امید سے عاری اور ذوقِ فردا و لذتِ امروز سے خالی ہے، البتہ اس میں بیزاری کا پیغام اور مریضانہ غم کا احساس ضرور پوشیدہ ہے ..... اس حصے میں حکیم الامت نے رومی کے ان دو شعروں سے کام لیا ہے:

معنی آں باشد کہ بستاند ترا　　بے نیاز از نقش گرداند ترا

معنی آں نبود کہ کور و کر کند　　مرد را بر نقش عاشق تر کند

یہ اشعار مثنوی رومی کے دفترِ دوم میں "فی المناجات" کے تحت آئے ہیں، اس میں مولانا نے خدائے بزرگ و برتر کے حضور نذرانۂ عجز پیش کرتے ہوئے گناہوں سے درگذر کرنے اور "سخنہائے رنگا رنگ" سکھانے کی التجا کی ہے، فرماتے ہیں کہ دعا اور اجابت، امن اور خوف سب تیری ہی طرف سے ہے۔ اس کے بعد اپنی خطاؤں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی گئی ہے کہ وہی مصلح اور وہی سلطانِ سخن ہے پھر کائنات میں قدرت کی نقاشی و مینا گری، آب و گِل سے نقشِ آدم کے سنوارنے اور اس کی مختلف نسبتوں خال و عم اور ان سے متعلق شادی و غم کا تذکرہ ہے۔ یہاں مولانا کہتے ہیں کہ کچھ ایسے بھی انسان ہیں جنھیں تو نے ان بکھیڑوں سے آزاد رکھا ہے، وہ اپنے آپ سے بے خبر، تمام محسوسات کو ردکرتے ہوئے ایک دیدۂ

معشوق کے عشق میں کھوئے ہوئے ہیں، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعا، جس کا آغاز شعر ذیل سے ہوتا ہے، کوئی بارہ ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے:

اے خدائے پاک بے انباز و یار   دست گیر و جرم ما را در گذار

اس دعا کے آخر میں لفظ "عشق" آگیا ہے، چنانچہ مولانا حسبِ عادت اب اس کلمہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں، اور اپنے مخاطب کو محسوس، ظاہری اور نظر آنے والی صورتوں کے عشق سے دور رہنے اور معشوقِ پنہانی کا عشق اختیار کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، عشقِ صورت کو زوال ہے، جب جسم سے روح پرواز کر جاتی ہے تو صورت برقرار رہتے ہوئے بھی عاشق اس کی طرف مائل نہیں ہوتا، وفا کے سبب ایسے عشق میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے پھر بھی "صورت" میں وہ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا، اپنے اس مطلب کی وضاحت کے لیے مولانا نے بڑی اچھوتی مثال دی ہے، سورج کی روشنی دیوار پر پڑتی ہے تو وہ بھی چمکنے لگتی ہے، لیکن اس کی یہ تابش عاریتی و عارضی ہوتی ہے، "عشقِ صورت" گویا مٹی کے ڈھیلے سے دل لگانا ہے، لہٰذا "عشقِ اصل" کا طالب ہونا چاہیے، کہ اسی کو بقا ہے، مولانا اسی طرح مختلف امثال سے عشقِ ظاہری و فانی کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے صاحبِ دل یا دوسرے لفظوں میں جمالِ حقیقی و باقی کا عاشق بننے کا درس دیتے اور کہتے ہیں کہ "حسنِ معنا" کی طرف تو متوجہ ہے، وہ ظاہری اور فانی ہے، معنا درحقیقت وہ ہے جو اپنی طرف متوجہ کر کے ظاہری نقش سے بے نیاز کر دے، وہ معنا بھی کیا ہوا جس سے انسان کے حواس ہی بجا نہ رہیں، اور جو اسے عارضی و فانی حسن پر عاشق تر کر دے، مولانا کے نزدیک صورتِ ظاہری کا عاشق نابینا اور بہرا ہے:

اے کہ تو ہم عاشقی بر اصلِ خویش   خویش از صورت پرستاں دیدہ بیش

پرتوِ عقل است آں بر حسِّ تو   عاریت می داں ذہب بر مسِّ تو

چوں زر اندود است خوبی در بشر   ورنہ چوں شد شاہدِ تو پیر خر

چوں فرشتہ بود ہمچوں دیو شد — کاں ملاحت اندرو عاریہ بُد
اندک اندک می ستاند زاں جمال — اندک اندک خشک می گردد نہال
رو نُعَمِّرہُ نُنَکِّسْہُ[1] بخواں — دل طلب کن دل منہ بر استخواں
کاں جمال دل جمال باقی است — دولبش از آبِ حیواں ساقی است
خود ہم او آب و ہم او ساقی و مست — ہرسہ یک شد چوں طلسمِ تو شکست
آں یکے را تو ندانی از قیاس — بندگی کن ژاژ کم خا ناشناس
معنیٔ تو صورت است و عاریت — بر مناسب شادی و بر قافیت
معنی آں باشد کہ بستاند ترا — بے نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آں نبود کہ کور و کر کند — مرترا بر نقشِ عاشق تر کند
کور را قسمت خیالِ غم فزا ست — بہرۂ چشم ایں خیالاتِ فنا ست
حرفِ قرآں را ضریراں معدنند — خر نہ بینند و بپالاں برزنند

جاوید نامہ میں "تمہید آسمانی ..." کے ذیل میں یہ شعر کسی شاعر کے حوالے کے بغیر آیا ہے

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را — اوست سید جملہ موجودات را

یہ شعر مثنوی رومی ہی کی بحر میں اور مولانا ہی کے رنگ میں ہے۔ نیز منسوب بھی ان ہی سے ہے
یہ بات یقیناً باعث تعجب ہوگی کہ مثنوی رومی کے ایرانی اور کانپوری نسخوں میں جو راقم کے مطالعے میں
یہ شعر کہیں نظر نہیں آیا، ہرچند پوری مثنوی کا ایک ایک شعر دیکھا گیا۔ لہٰذا مجبوراً اس سے صرفِ نظر کیا
جاتا ہے۔

---

[1] نُنَکِّسْہُ، آیۃ ۶۸ اور ہم جس کی عمر زیادہ کر دیتے ہیں اس کو طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں (یعنی اس کے قوت
و جمال، رنگ وغیرہ میں تغیر آ جاتا ہے اور وہ بگڑ جاتے ہیں) سو کیا وہ لوگ نہیں سمجھتے۔

جاوید نامہ ہی میں علامہ نے "تمہید زمینی" کے باب میں مولانا رومی کی زبان سے اسرار معراج کی شرح بیان کی ہے، اور پھر مولانا کا مطلع ذیل والی غزل کے نو شعر درج کیے ہیں:

بگشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست　　بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

مولانا کی اس غزل پر اس سے قبل "اسرار خودی" کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

مذکورہ غزل کے بعد علامہ نے روح رومی سے موجود و ناموجود اور خوب و بد کی حقیقت پوچھی ہے، جس کے جواب میں روحِ رومی انھیں شعور کے مدارج و مقامات کے بارے میں بتاتی ہے، اور یہ کہ انسان کس طرح اپنے نور، دوسروں کے نور اور آخر کار نورِ حق سے آشنا ہوتا ہے .... یہ فلسفۂ معراج بیان ہوا ہے، اس کے بعد روحِ رومی عقل و عشق کا موازنہ کرکے موخر الذکر کو افضل و برتر قرار دیتی ہے، اس حصے میں رومی کے ان دو اشعار سے استفادہ کیا گیا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دید دوست است

جملہ تن را درگداز اندر بصر　　در نظر رو در نظر رو در نظر

مثنوی رومی کے دفتر اول میں قیصر روم کے ایلچی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان ہوا ہے، مذکورۂ بالا پہلا شعر اسی حصے میں ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قیصر روم کا ایک ایلچی مدینہ پہونچا اور لوگوں سے پوچھتا ہے کہ تمھارے خلیفہ کا محل کس طرف ہے؟ لوگ اسے بتاتے ہیں کہ ان کا قصر و محل کوئی نہیں ہے، وہ تو درویشانہ زندگی بسر کررہے ہیں، یہاں مولانا قصر کی بحث چھیڑتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کی چشم دل میں خرابی ہو وہ قصر سرمدی کیونکر دیکھ سکتے ہیں، پہلے چشم دل کی بیماری دور کرنا شرط ہے، پھر اس قصر کو تو دیکھنا چاہیے، اگر جان ہوا و ہوس اور دنیوی آلایشوں سے پاک ہے تو جلد ہی اسے دربار و ایوان پاک کا دیدار ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش کی گئی ہے کہ چونکہ آپ صلعم ہر قسم کی آلایش اور ہوس سے دور تھے، اس لیے جب طرف بھی سرکار دو عالمؐ توجہ فرماتے اسی طرف "وجہ اللہ"

اس کے بعد مولانا اپنے مخاطب سے کہتے ہیں کہ تم تو وسوسوں کا شکار ہو، تمھیں "وجہ اللہ[1]" کا
کیونکر نصیب ہو سکتا ہے ..... حق دوسروں کے درمیان اسی طرح نمایاں ہے جس طرح چاند ستاروں
اس نکتہ کو مزید روشن کرنے کے لیے مولانا فرماتے ہیں کہ تم ذرا اپنی دونوں آنکھوں پر انگلیاں رکھ لو،
ماؤ کہ یہ دنیا تمھیں نظر آتی ہے؟ ظاہر ہے نظر نہیں آتی، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ ہوگا کہ دنیا ہی معدوم
ہے، دنیا تو اپنی جگہ برقرار ہے، البتہ یہ قصور انگلیوں کا ہے کہ وہ بینائی میں حائل ہوئیں، طالبِ دیدار
کے لیے لازم ہے کہ اس کی چشمِ بصیرت پر جو آلائش و ہوس کی انگشت رکھی ہوئی ہے اسے ہٹالے یہاں
ت نوح علیہ السلام اور ان کی امت کا ذکر آگیا ہے، آپؑ کی امت نے جب آپ سے پوچھا کہ ثواب
ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: "وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَ[2]" کے اس جانب" جب کسی نے چہرہ اور سر کپڑے سے
پ رکھا ہو تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اسے کچھ نظر نہ آئے گا، یہی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے
یرت و معنویت سے عاری اور حرص و ہوس اور دنیا کے غلام اور خود بینی میں مستور ہیں، ایسے
"ہر رکھنے والے دیدارِ حق سے بے بہرہ ہی رہتے ہیں، یہاں مولانا فرماتے ہیں کہ آدمی نام ہی "دید"
، بصورتِ دیگر وہ بیکار شے ہے، اور "دید" بھی وہ جو "دیدِ دوست" ہو، اگر نظروں کو دیدارِ دوست
ئی سروکار نہیں تو ان کا اندھا ہو جانا بہتر، اور دوست وہ جو ہمیشہ قائم و باقی رہنے والا ہے،
بے ثبات دوست سے دوری اچھی ....

جہ اللہ، سورۃ البقرہ، آیۃ ۱۱۲: جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو
تو اس کو اس کا عوض ملتا ہے اس کے پروردگار کے پاس پہونچ کر، اور نہ ایسے لوگوں پر قیامت میں، کوئی اندیشہ ہے اور نہ
دل اس روز مغموم ہونے والے ہیں۔ [2] سورۂ نوح، آیۃ ۷: اور میں (یعنی نوحؑ) نے جب کبھی ان کو (دین حق کی طرف)
کہ آپ ان کو بخش دیں تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور (نیز زیادتی کراہت سے) اپنے کپڑے (اپنے اوپر)
لپیٹ اور اصرار کیا اور (میری اطاعت سے) غایت درجہ کا تکبر کیا۔

یہ تمام باتیں گویا اہل مدینہ نے قیصر کے ایلچی سے کہی تھیں چنانچہ جب اس نے یہ الفاظ سنے تو اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، وہ حضرت عمرؓ کے دیدار کا کچھ زیادہ ہی مشتاق ہوا، اس نے سب ساز و سامان ایک طرف پھینکا، گھوڑے کو ایک جانب چھوڑا اور دیوانہ وار اس مردِ خدا (عمرؓ) کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا کہ اس دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی ہے جو اس میں رہتے ہوئے بھی جسم میں روح کی مانند پوشیدہ و پنہاں ہے۔ اس نے حضرت عمرؓ کی تلاش و جستجو جاری رکھی تاکہ دل و جان سے ان کا غلام ہو جائے، اور آخر اس نے انہیں کھجور کے ایک درخت کے نیچے لیٹے ہوئے پایا ...... اتنی داستان بیان کرنے کے بعد مولانا نے حضرت عمرؓ اور ایلچی کے درمیان گفتگو کا تذکرہ کیا جس میں مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے:

هر کرا هست از هوسها جان پاک		زود بیند حضرت و ایوان پاک
چون محمدؐ پاک شد از نار و دود		هر کجا رو کرد وجه الله بود
چون رفیقی وسوسهٔ بدخواه را		کے ببینی ثَمَّ وَجْهُ الله را
هر کرا باشد ز سینه فتح باب		او ز هر ذره ببیند آفتاب
حق پدید است از میانِ دیگران		همچو ماه اندر میانِ اختران
دو سرِ انگشت بر دو چشم نہ		هیچ بینی از جهان؟ انصاف ده
ور نه بینی، این جهان معدوم نیست		عیب جز ز انگشت نفس شوم نیست
تو ز چشم انگشت را بردار هین		وآن گهانی هر چه می‌خواهی ببین
نوح را گفتند امت کو ثواب؟		گفت او، زان سوی وَاسْتَغْشَوْا ثِیَاب
رو و سر در جامه‌ها پیچیده اند		لاجرم با دیده و بے دیده اند
آدمی دیده است باقی پوست است		دیده آن است آنکه دید دوست است
چونکه دید دوست نبود کور بہ		دوست کو باقی نباشد دور بہ[1]

(حاشیہ ص ۱۴۱ پر)[1]

چون رسولِ روم ایں الفاظ تر | در سماع آورد شد مشتاق تر
دیدہ را بر جستنِ عمر گماشت | رخت را و اسپ را ضایع گذاشت
ہر طرف اندر پئے آں مرد کار | می شدی پرسان او دیوانہ وار
کایں چنیں مردے بود اندر جہاں | وز جہاں مانند جاں باشد نہاں
جُست او را تا ز جاں بندہ شود | لاجرم جویندہ یابندہ بود

دوسرا شعر "جملہ تن را در گداز ۔۔۔ الخ" مثنوی رومی کے چھٹے دفتر میں بہ تغیرِ مصرعِ اول آیا ہے[1]،
ب دفتر میں ایک جگہ حضور فخرِ انبیا، سرورِ کائنات صلعم کی ایک حدیث مبارکہ "لیس للماضین ھم الموت انما لھم حسرۃ الفوت"[2] کی تشریح بیان ہوئی ہے، اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

راست فرمود آں سپہدارِ بشر | کہ ہر آں کو کرد از دنیا گذر

ضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صحیح فرمایا ہے کہ جو کوئی اس دنیا سے کوچ کر گیا اسے موت کا کوئی درد و دریغ بیں، بلکہ اسے اپنے اعمال ضایع ہو جانے کا بیحد افسوس ہے کہ اس نے موت کو مرکزِ توجہ کیوں نہ بنایا جو ہر لت اور ساز و برگ کی مخزن ہے، یہاں مولانا مردہ کی اس حسرت کا اب دوسرے انداز میں ذکر کرتے ی، ان کے مطابق اس حسرت و غم کے مارے مردے گویا وہ لوگ ہیں جو عمر بھر اپنے بھنگے پن کے سبب ہودہ و بیکار خیالات و مشاغل کے پجاری رہے؛ آخر موت نے ان کا بھنگا پن دور کر دیا اور ان پر اپنے ن خیالات کی بیہودگی و بے سامانی کھل گئی۔ مولانا ایسے خیالات کو نقشِ باطل قرار دیتے ہوئے سمندر اور

حاشیہ صفحہ ۱۲۰ (۱): سعدیؔ کہتے ہیں:

دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند | ورنہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را

(کلیات سعدی ص ۶۹۷)

۱ ملاحظہ ہو مثنوی مستوفی ص ۱۱۱۵، کتاب مثنوی ص ۵۶۷، مثنوی شریف کا چھٹا حصہ ۶ ص ۳۰۸ ۔ ۲ گذشتہ لوگوں کو موت کا غم نہیں
رنجیں اس بات کی ندامت ہے کہ ان کے اوقات رائیگاں ضایع ہو گئے۔

اس میں پیدا ہونے والی جھاگ کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، اور اس کے بعد حقیقت میں نظر پیدا کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، گوشت پوست تو حیوانوں کا بھی ہوتا ہے، انسان اور حیوان میں فرق، شعور وادراک یا دوسرے لفظوں میں نظر کے سبب ہے، لہٰذا اگر انسان ان چیزوں سے عاری ہے تو اس میں اور گدھے میں کوئی فرق نہیں، بقول سعدی:

آدمی را عقل باید در بدن ورنہ جاں در کالبد دارد حمار[1]

مولانا فرماتے ہیں کہ نہ تو تمھاری چربی سے شمع جل سکتی ہے اور نہ تمھارے گوشت ہی سے کسی مخمور کے لیے کباب تیار کیے جا سکتے ہیں، گویا یہ گوشت یہ چربی تمھاری سب سراسر بیکار شے ہے، اصل بات یہ ہے کہ اپنی حقیقت وماہیت کو پہچانو، اور انسانیت میں ترقی کرنا چاہو تو نظر پیدا کرو، نظر دو قسم کی ہے، ایک تنگ نظر ہوس پرستوں کی مادہ پرست نظر جو تھوڑی دور تک دیکھ سکتی ہے، اور دوسری وہ جو دونوں جہانوں کے علاوہ خدا کا بھی دیدار کر سکتی ہے، ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لہٰذا واللہ اعلم بالاسرار کے سرمہ کی تلاش کرو، تم بحر نیستی کی شرح تو سن ہی لی، اب کوشش کرو کہ ہمیشہ اسی بحر میں رہو، اس دنیا کی اصل ہی نیستی ہے، جتنے بھی مردانِ خدا ہیں وہ نیستی وانکسار کے متلاشی رہتے ہیں ؎

قبلہ کردم من ہمہ عمر از حول آں خیالاتے کہ گم شد در اجل
حسرت آں مردگاں از موت نیست زانست کاندر نقشہا کردیم ایست
ماندیم تا آنکہ ایں نقش است و کف کف ز دریا جنبد و یابد علف
چونکہ بحر افگند کفہا را بہ بر رو بگورستاں و کفہا را نگر
پس بگو کو جنبش و جولانتاں بحر افگندست در بحرانتاں
تا بگویندت بلب نے بل بحال کہ ز دریا گو نہ ازما ایں سؤال

---

[1] کلیات سعدی ص ۹۴۴۔

نقش چوں کفکے بجنبد بے ز موج — خاک بے بادے کجا آید بہ اوج
چوں غبار نقش دیدی باد بیں — کف چو دیدی قلزم ایجاد بیں
ہیں بہ بیں کز تو نظر آید بکار — باقیت شحم و لحمے پود و تار
شحم تو در شمعہا نفزود تاب — لحم تو مخمور را ناید کباب
در گداز ایں جملہ تن را در بصر — در نظر رو در نظر رو در نظر
یک نظر دو گز ہمی بیند ز راہ — یک نظر دو کون دید و روئے شاہ
درمیان ایں دو فرقِ بے شمار — سر ہمہ جو "واللہ اعلم بالسرار"
چوں شنیدی شرح بحر نیستی — کوش تا دائم دریں بحر ایستی
چونکہ اصل کارگاہ ایں نیستی است — کو خلا و بے نشان است و تہی است
جملہ استادان پے اظہار کار — نیستی جویند و جائے انکسار

جاوید نامہ ہی میں فلک مشتری کی سیر کے ضمن میں زندہ رود اور حلاج کی گفتگو کا منظر نما کیا گیا ہے، جس میں حلاج تقدیر و جبر پر روشنی ڈالتے ہیں، اس حصے کے آخر میں رومی کے مندرجۂ ذیل چار اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے:

بود گبرے در زمانِ بایزید — گفت او را یک مسلمانِ سعید
خوشتر آں باشد کہ ایماں آوری — تا بدست آید نجات و سروری
گفت "ایں ایماں اگر ہست اے مرید — آں کہ دارد شیخ عالم بایزید
من ندارم طاقت آں تاب آں — کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں

یہ چاروں اشعار دفتر پنجم میں "دعوت کردن مسلمانے گبرے را باسلام در عہد بایزید"[1] کے

---

[1] مولانا نے ایک اور جگہ اسی قصے کے عنوان کے تحت اسی مبحث کی ہے، "دعوت کردن مسلمانے مغی را بدین اسلام و جواب گفتن او" کتاب مثنوی ص ۳۹۶

تحت تسے میں اس حکایت کے بیان سے دراصل ان مسلمانوں کا ذکر مقصود ہے جو ایمان رکھنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کا ایمان پختہ نہیں ہوتا اور وہ کسی طور اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے ہیں جب اس قسم کا کوئی شخص کسی کافر کو دعوت اسلام دیگا تو ظاہر ہے اس کا کافر پر کیا اثر ہوگا اثر تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ خود وہ شخص اسلام کا عملی نمونہ ہو... حکایت کچھ اس طرح ہے کہ اسلام کے مشہور صوفی بزرگ بایزید کے زمانہ میں کسی مسلمان نے ایک آتش پرست سے کہا کہ بھائی اگر تم اسلام قبول کر لو تو تمہارا اچھا ہو۔ اس سے تمہیں نجات اخروی کے ساتھ ساتھ یہاں عزت و سربلندی بھی حاصل ہوگی۔ اس نے جواب دیا کہ میاں اگر اسلام وہ ہے جو بایزید کا ہے تو اس کی مجھ میں ہمت طاقت نہیں اس لیے کہ اسلام تو جان کی ہمت سے بڑھ کر ہے اور اگرچہ میں دین و ایمان پر یقین نہیں رکھتا تاہم اس (بایزید) کے ایمان کا قائل ہوں لیکن اگر تم اس اسلام کی بات کرتے ہو جس کا عملی نمونہ تم خود ہو تو ایسے میرا دور سے سلام، مجھے ایسے اسلام سے کوئی رغبت ہے، نہ اس کی کوئی خواہش کہ تمہارے مقابلہ میں میرا ایمان بھی کچھ بعد کی ہوں، پھر یہ بھی ہے کہ تمہارے اعمال کی جو صورت ہے اس سے تو مائل بہ اسلام شخص بھی دور بھاگے گا...۔

بود گبرے در زمانِ بایزید — گفت او را یک مسلمانِ سعید
کہ چہ باشد گر تو اسلام آوری — تا بیابی صد نجات و سروری[1]
گفت "ایں اسلام اگر ہست اے مرید — آنکہ دارد شیخ عالم بایزید
من ندارم طاقت آں تاب آں — کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں
گرچہ در ایمان و دین ناموقنم — لیک در ایمانِ او بس مومنم
دارم ایماں کو ز جملہ برتر است — بس لطیف و با فروغ و با فر است
مؤمنِ ایمانِ اویم در جہاں — گرچہ مہرم ہست محکم بر دہان
باز ایماں گر خود ایمانِ شماست — نے بداں میلستم و نے اشتہاست
آنکہ صد میلش سوئے ایماں بود — چوں شما را دید آں باطل شود
زانکہ نامے بیند و معنیش نے — چوں بیاباں را مفازہ گفتنی
چوں بایمانِ شما او بنگرد — عشقِ او ز آورد ایماں بفسرد

[1] پہلا مصرع ثانی اور دوسرے نسخوں میں اسی طرح ہے، ملاحظہ ہو مثنوی شریف دفتر پنجم ص ۹۸، کتاب مثنوی ص ۸۰۲، مثنوی معنوی ص ۳۹۹ ۔

بہادر شاہ ظفر کے عہد کے منشی رجب علی کی غدّاریوں کے شواہد

از

جناب ضیاءالدّین صاحب اچھرہ، لاہور

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری میں انگریزوں کے جن خیرخواہوں نے نمایاں کردار ادا کیا، اُن میں میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ انہوں ہی کا کارنامہ تھا کہ جنرل بخت خاں بادشاہ کو اپنے ہمراہ نہ لیجا سکے، اور میجر ہڈسن اپنا مشن کامیاب کرنے میں کامیاب ہوگیا، جس کے بعد بادشاہ کو اسیر ہو کر رنگون جانا پڑا، متعدد شہزادے بے شمار رہنمایانِ انقلاب اور ہزاروں محبِ وطن افراد قتل ہوئے، اور خیرخواہوں کو انعام و اکرام حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا۔

تاریخوں میں زیادہ تر میرزا الٰہی بخش کو سب سے زیادہ موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، اور منشی رجب علی کی غداری کو نسبتاً زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، اور بادشاہ کے ہمایوں کے مقبرے سے نکلنے کی بھی وہاں میجر ہڈسن کی موجودگی مان لی جاتی ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں متفرق فائلوں کی

---

[1] اس مضمون میں شامل انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز لندن کی دستاویزات (کراؤن کاپی رائٹ) کی اشاعت اور ترجمہ کی اجازت کے لئے کنٹرولر آف ہر میجسٹیز سٹیشنری آفس شکریہ کے مستحق ہیں۔

ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے ایک فائل میں چند ایسے شواہد دستیاب ہوئے جن سے لوٹ اوقات کی بابت ذرا مختلف حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ان دستاویزات میں منشی رجب علی کا کردار بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں جہاں دوسروں کی زبانی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں وہاں وہ خود رجب علی بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کا سہرا بلا شرکت غیرے اپنے سر باندھتا نظر آتا ہے۔ اور اس دعوے کے ثبوت میں متعلقہ حکام کی اسنادِ پیش کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ وہ خود یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بادشاہ کو مقبرۂ ہمایوں سے نکال لانے کے بعد نصف ماہ میں اس کی اطلاع پر میجر ہڈسن اس کے ساتھ شریک ہوا۔

منشی رجب علی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران انگریزی حکومت کے شعبۂ جاسوسی کا باقاعدہ تنخواہ دار ملازم تھا، اس کے کام کی اہمیت اور اس کی اہلیت کا اندازہ تاریخ عروج عہدِ سلطنتِ انگلشیہ میں منشی ذکاءاللہ دہلوی کے اس بیان[1] سے بخوبی ہو سکتا ہے،

"سرکارِ انگریزی کے جو ایجنٹ، اس مخبری کے لئے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے دلی میں رہتے تھے، ان سب کے سردار منشی رجب علی تھے، جاسوسی کے لئے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہئیں وہ ان میں تھیں، انگریزی منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا، وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے، سچی بات دریافت کر لینے کی عجیب قابلیت و استعداد اور فراست و کیاست رکھتے تھے۔"

انگریزوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت منشی رجب علی کے سوانحی خاکہ کے اہم اقتباسات سے بھی ظاہر ہو گی، جو اُس نے اپنے خاندانی حالات کے ضمن میں "تحقیقاتِ چشتی"[2] میں درج کرائے، ملاحظہ کیجئے:

---

[1] بحوالہ ۱۸۵۷ء مؤلفہ غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، صفحہ ۱۳۷ [2] تحقیقاتِ چشتی، مؤلفہ نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۴ء، صفحات ۱۸۱ تا ۲۲۵۔

"حال راقم کا یہ کہ ۱۸۰۵ء سمت ۱۸۶۲ بکرماجیت بمقام کونڈی اپنی جاگیر میں تولد ہوا، سمت ۱۸۷۵ء، ۱۸۱۸ء میں دیوان محکم چند افسر فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کونڈی کو مع دیہات بے سبب بلا وجہ ضبط کر کے ہمارے بزرگوں کو جلاوطن کر دیا وہاں سے نکل کر جگراؤں میں آئے، سردار فتح سنگھ بہادر آہلو والیہ نے محض عالی جاہی سے دو حویلیاں لائق واسطے استقامت کے جگراؤں میں عطا کیں اور پھر راجہ نہال سنگھ ان کے فرزند نے کچھ زمین باغ کے لیے بخشش دی، اور ہمیشہ مہربانی کرتے رہے ......"

۱۸۲۵ء میں دہلی میں مدرسہ تجویز ہوا، حکام درپے اشاعت علوم متوجہ ہوئے تو راقم نے بھی علوم متداولہ رسمیہ وہاں حاصل کیا، اور مدرسہ دہلی میں مدرس علم ریاضی کا رہا[۵۵]، حکام حضور چارلس مٹکاف صاحب بہادر اور الیٹ صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی عنایت کرتے رہے خصوصاً سر چارلس ٹرولین صاحب بہادر جو اب مدراس میں گورنر ہیں، ان کی عنایتوں کی تو نہایت نہیں، بہت نظر عنایت میرے حال پر مبذول تھی، بلکہ جب حضور لارڈ ایمہرسٹ صاحب گورنر جنرل ہندوستان نے دہلی میں بعد فتح بھرت پور دربار کیا تو میں بھی بذریعہ رضیہ اعلیٰ صاحبان جلیل الشان کے حاضر دربار ہو کر خلعت سے معزز و ممتاز ہوا، اور بمقتضائے قدردانی علم کے منشی گاہ بندگان حضور لارڈ گورنر جنرل بہادر سے دربار میں کرسی بھی مرحمت ہوئی، ۱۸۳۰ء میں بعد

---

۵۵ علم ریاضی کی تحصیل میں منشی رجب علی کو سرسید احمد خاں کے نانا نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد خاں کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے، جو اس علم میں بہت ماہر سمجھے جاتے تھے، (دیکھیے حیات جاوید مؤلفہ الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء، حصہ اول ص ۱۹)

قطع تعلق مدرسہ آگرہ کا ہو گیا، اور وارد ہوشنگ آباد ہوا، تب جان ریفت اوسلی صاحب بہادر وہاں حاکم تھے، تعریف اُن کے اخلاق کی بیرون از احاطۂ تحریر ہے خصوصاً جو مجھ پر عنایتیں کرتے تھے میں بیان ان کا نہیں کر سکتا۔۔۔۔"

"جب وارد انبالہ ہو کے ملازمت حضور آنریبل سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر جن کے اوصاف زبان قلم قاصر ہے، حاصل کی تو صاحب موصوف نے یکم فروری ۱۸۳۳ء کو بخدمت منشی گری ملک محفوظ ما بین جمن و ستلج اوّلاً و میر منشی ممالک پنجاب ثانیاً مامور فرمایا جب سے خدمت جارج براڈفٹ صاحب بہادر و صفدر جنگ کرنے بارنیٹ صاحب بہادر و سر ہنری لارنس بہادر و بندگان حضور سر جان لارنس صاحب بہادر جو بفضل الٰہی سر یر آرائے حکم گورنری کشور ہند ہیں، بمقدور خود کار و بار میں سرگرم رہا۔ انہی گورنر جنرل بہادر کو، جب حاکم اعلیٰ لاہور کے تھے، ۱۸۵۳ء میں استعفا دے کر بحصول رخصت و خلعت و خطاب انگریزی و جاگیر وارد وطن اپنے ہوا، بعد اس کے حسب الطلب سر ہنری لارنس صاحب بہادر ملک راجپوتانہ کا بھی سیر کیا۔۔۔۔"

"۱۸۵۷ء میں بمقام دہلی بالائے پہاڑی کمپوئے سرکار میں بعہدۂ میر منشی گری کمانڈر انچیف بہادر معزز و ممتاز ہو کے تحت جناب جرنیل بیچر صاحب بہادر جو کچھ خدمت مجھ سے ہو سکی اس سے قاصر نہ رہا، بعد تسخیر دہلی بحصول رخصت وطن میں آیا، جب جارج کارنک بارنس صاحب بہادر کمشنر ایں روئے ستلج نے رپورٹ اہل خدمت کی کی تو پیش گاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند و نیز آگے خلعت پانچ ہزار روپیہ بذریعہ بندگان حضور سر جان لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل حال مرحمت ہوا اور کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی اور خطاب ارسطو جاہ کا ملا، اور خطاب خان بہادر کا بمقام لاہور میں پیش گاہ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر گورنر جنرل

سابق سے عطا ہو چکا تھا۔ ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۳ء میں براہ سکھر و کراچی و بمبئی و عدن مشرف بہ حج و زیارت ہو کر وارد جگراؤں ہوا، اور بتقریب سیر عجائب خانہ کے بھی بحضور صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب حاضر ہو کر مورد مراحم بے پایاں ہوا، اور شکرگزار عنایت و رخصت ہوا۔۔۔۔"

"جناب باری اس دولت انگلشیہ کو روز بروز ترقی بخشے کہ طرح طرح کی ترقیات کشور ہندوستان میں بہ نیت نیک حکام سپہر مقام عمل میں آتی ہیں۔ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت اور قابلیت نہیں، مگر الحمدللہ کہ اوقات میرے عزت و آبرو سے بسر ہوئے، حکام عہد ہمیشہ عزت افزائی میں مصروف رہے اور امثال و اقران میرے مجھ کو ہمیشہ بنظر اعتبار و اقتدار دیکھتے رہے۔ صاحبان ڈپٹی کمشنر بہادر لدھیانہ ابتدا سے آج تک مجھ پر نظر عنایت مبذول رکھتے ہوئے، چنانچہ آج چارلس الیٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر حال بہت نظر عنایت رکھتے ہیں۔"

یہ ہے منشی رجب علی کی زندگی کا ایک مختصر خود نوشت خاکہ، اگرچہ اس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران انجام دی جانے والی اپنی خصوصی کارگزاری کی بالتفصیل وضاحت نہیں کی، تاہم اس کی روشنی میں اس کے ان کارہائے نمایاں کا پس منظر سمجھنے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے، جن کا ذکر انڈیا آفس ریکارڈز کے حوالہ سے ذیل میں کیا جاتا ہے۔

انڈیا آفس لائبریری میں امیدواران تمغۂ "ستارۂ ہند" کے ذاتی کاغذات پر مشتمل چند فائلیں موجود ہیں۔ ہر فائل میں متعدد امیدواروں کی دستاویزات ہیں۔ منشی رجب علی کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے "اسٹار آف انڈیا" دینے کی تحریک ۱۸۶۶ء میں ہوئی جس کی پیروی لندن میں مقیم ایک شخص سید عبداللہ نامی کرتا رہا۔ سید عبداللہ کی طرف سے ۱۲ دسمبر ۱۸۶۶ء

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۰ پر)

کی تحریر کردہ پہلی درخواست دفتر میں دو روز بعد ۱۶ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو اندراج کی گئی، بعد میں ایک اور درخواست محررہ ۱۰ر مارچ ۱۸۶۸ء پر رجسٹری ڈیپارٹمنٹ انڈیا آفس کی اگلے روز یعنی ۱۱ر مارچ کی وصولی کی مہر دیکھی جا سکتی ہے، کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی رجب علی کو اس سے پیشتر اس کی خدمات کے اعتراف میں انعام و جاگیر سے نوازا گیا تھا، مگر وہ اس عطیہ سے مطمئن نہ تھا اور اس کے ہمدرد رفقا بھی اسے تسلی بخش نہیں سمجھتے تھے، مزید نوازشات کے لیے اس کی بھاگ دوڑ ایک عرصہ تک جاری رہی، اپنے بیان میں وہ اس سلسلہ میں کی جانے والی مسلسل تگ و دو کا ذکر کرتا ہے، اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے ثبوت میں وہ ایک ایسے خیر خواہ کی مثال پیش کرتا ہے جس کی کارگزاریاں اس کی خدمات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں، لیکن اسے ایک بھاری جاگیر عطا کی گئی، وہ اپنی خیر خواہی اور جان نثاری کے کارناموں کی زبردست اہمیت جتلا کر ان کے صلہ میں حاصل کردہ جاگیر کو معمولی اور ناکافی قرار دیتا ہے۔

فائل مذکور میں منشی رجب علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فارسی خط بھی موجود ہے، جس کی نقل زیر نظر مضمون میں شامل ہے، اس خط کے مندرجات اس لحاظ سے خاصے دلچسپ ہیں کہ ان میں انگریزوں کے شعبۂ جاسوسی کا یہ "نامور" اور کامیاب ترین اہل کار جہاں ایک جانب "بجائے اتمام سرکار انگریزی" مفاد عامہ کے خلاف گہری سازشوں میں ملوث نظر آتا ہے، وہاں دوسری جانب وہ اپنی تمام کمائی رفاہ عامہ کے کاموں، مسجدوں اور کنوؤں کی تعمیر اور خیراتی کاموں میں صرف کر دینے کا دعویٰ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ بقول [illegible]

(حاشیہ ص ۱۲۹) اسی شخص کا ذکر [illegible] ہمیں مل سکا ہے سوا حیات جاوید کے، جہاں مولانا حالی نے اس کے ایک طویل مضمون کا ذکر کیا ہے، جو اس نے سر سید احمد خاں کی تعریف میں ۱۸۶۹ء میں ان کے [illegible] کے فوراً بعد وہاں کے ایک اخبار میں شائع کرایا تھا (دیکھیے حیات جاوید حصہ ۱، ص ۱۲۴، [illegible] مصنفہ [illegible] اکادمی پنجاب لاہور [illegible]، ص ۱۶۲۔

مرتب و مدون "داستانِ غدر":

"مقبرہ ہمایوں کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو مولوی رجب علی اور ان کے خاندان سے عقیدت کم ہوگئی تھی، تاہم مولوی رجب علی نے تلافیِ مافات کے طور پر دہلی کے ستم رسیدہ لوگوں کی حتی المقدور امداد کی۔"

(اس کے بعد وہ فلاح و بہبود کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہوگیا، اس کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما تھا، تلافیِ گناہ، عوام میں کھوئی ہوئی عزت اور وقار کی بحالی یا کچھ اور؟ مقصد کوئی بھی ہو اس عالمِ پیری میں بھی وقت پڑنے پر "انگریز بہادر" کی سربلندی کے لیے اپنی جان تک قربان کردینے کے دعوے کی برقراری اس کے ذہن اور کردار کی عکاسی کرتی ہے۔

مذکورہ دستاویزات میں سے چند تو انگریزی میں نقل مطابق اصل ہیں، باقی کا انگریزی ترجمہ منشی رجب علی کے پیروی کنندہ سید عبداللہ نے کیا ہے، اور یہ زیادہ تر اسی کے ہاتھوں کی تحریر کردہ ہیں، ذیل میں ان دستاویزات کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق ہیں، یہ وضاحت بھی کردوں کہ میں نے ان کے آزاد ترجمہ کی بجائے ترجمہ مطابق اصل کو ترجیح دی ہے۔

بیان منشی رجب علی[1] | ۱۸۴۶ء میں سکھوں کے دائمی یادگار معرکہ کے دوران میں نے آں جہانی میجر جارج براڈفٹ صاحب بہادر کے ماتحت سرکار برطانیہ کے لیے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے، اہم واقعات کے اس دور میں اپنی جان اور مال سے یکساں قطع نظر جب بھی فرائض منصبی نے مجھ سے ان کی قربانی طلب کی، میں نے سر پر منڈلاتے ہوئے سخت خطرات میں ہر موقع پر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی، جاں نثاری کی اس کیفیت نے مذکورہ بالا ممتاز افسر کی نظرِ عنایت اس طرف مبذول کی، انہوں نے

---

[1] انڈیا آفس ریکارڈز، فائل نمبر L/PAS/15/73 / ۲، ورق ۵۶۸۔

سرفریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کی موجودگی میں وعدہ کیا کہ وہ نو مواضع کی ایک جاگیر، جو میری موروثی جائداد تھی، مجھے عطا فرمائیں گے، مگر یہ وعدہ، جو سرفریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کے دستخطوں سے توثیق کیا گیا تھا، میجر براڈفٹ صاحب بہادر کے افسوسناک انتقال کے باعث کالعدم ہوگیا، لہٰذا سرفریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کی نوازش سے میں اس قابل ہوا کہ اپنا معاملہ ارباب اختیار کی خدمت میں دوبارہ پیش کرسکوں۔ لازوال یادگار کے مالک کرنل سرہنری منٹگمری لارنس صاحب بہادر نے بملاحظہ سرکار میرے حق میں رپورٹ تحریر کی، اس عرضی کے نتیجہ میں موضع تلونڈی اور دوسرے مواضع، جو میری موروثی جائداد تھے اور جن کی سالانہ جمع دو ہزار روپے تھی، مع ایک اور موضع کے جسے میں نے اپنی سعی و کوشش سے آباد کیا تھا، اور جس کی سالانہ جمع چار سو روپے تھی، مجھے اور میری آیندہ نسلوں کو دائمی طور پر عطا کیے گئے۔

آں جہانی سرہنری لارنس صاحب بہادر اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ سرکار کو میرا معاملہ تاخیر سے پیش کیے جانے کے باعث مجھے میرے قوی اور جائز دعاوی کا شایاں صلہ نہیں دیا گیا، اور انھوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ انگلستان پہونچنے پر وہ میرے مفادات میں اضافے کی حتی المقدور کوشش کریں گے، موت نے اس قابل احترام محسن کو، جو میرے دوست بھی تھے، مجھ سے چھین لیا، جنرل برنارڈ صاحب بہادر جنھوں نے دارالحکومت کے محاصرے کے دوران دہلی فیلڈ فورس کی کمان کی تھی، میری مستحکم خیر خواہی کے علاوہ مسلسل جاں فشانی اور تن دہی کے اتنے معترف تھے کہ انھوں نے مجھے مکمل یقین دلایا کہ یہ خدمات کسی صورت بھی صلہ کے بغیر نہیں رہیں گی، اور یہ کہ وہ بذات خود میرے معاملہ میں کیمپ میں کسی دوسرے فرد کی نسبت زیادہ دلچسپی لیں گے، لیکن یہ عظیم قدرشناس وقت سے پہلے ہی ہیضہ کا شکار ہوکر میجر ہڈسن صاحب بہادر اور مسٹر گریٹ ہیڈ صاحب بہادر کی طرح، جو جنرل بنارڈ

صاحب بہادر کے میرے ساتھ مذکورۂ بالا وعدے کے وقت موجود تھے، ہم سے قطع تعلق کر گئے۔ تسخیرِ دہلی کے بعد کرنل بیچر صاحب بہادر نے مجھے ایک سند عطا کی اور ساتھ ہی سر جان لارنس بارٹ صاحب بہادر کے حضور، جب یہ ممتاز مدبّر انبالہ میں تھے، میری پُر زور سفارش کی۔ میری خدمات کے عوض مجھے جو انعام دیا گیا وہ کونسل میں گورنر جنرل صاحب بہادر کے فرمان کی منسلک نقل سے ظاہر ہے، اس فرمان سے متعلق مجھے چند معروضات پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

مجھے دائمی طور پر جو دو[۲] مواضع عطا کیے گئے، ان میں سے چار سو[۴۰۰] روپے سالانہ جمع کا ایک موضع دراصل اس سفارش کی بدولت عطا کیا گیا تھا جو حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر نے کرنل سر کلاڈ مارٹن ویڈ صاحب بہادر کو فرمائی، جنھوں نے میرا معاملہ ہز ہائی نس مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی خدمت میں پیش کیا، سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر کو اس صورت حال کا بخوبی علم ہے، یہ عطیہ میں نے جس وقت وصول کیا، ایک بنجر اراضی کے سوا کچھ نہ تھا، یہ صرف اس پر صرف کردہ عظیم سرمایہ اور سخت محنت و استقلال کا نتیجہ ہے جو میں اسے قابل پیداوار اور رہائش بنانے میں کامیاب ہوا، اور اب یہ پچھلے اٹھارہ[۱۸] برس سے میرے قبضہ میں ہے۔ آٹھ سو[۸۰۰] روپے سالانہ جمع کا تلونڈی کا دوسرا موضع، جو مجھے اور میرے وارثوں کو دائمی طور پر عطا کیا گیا ہے، میری قدیم جاگیر کا ایک حصہ ہے، لہٰذا میں بڑے ادب کے ساتھ گزارش کرتا ہوں کہ نجہانی جنرل ہیوٹ صاحب بہادر کے میرے ساتھ کیے گئے وعدے کے پیش نظر مجھے جو انعام دیا گیا ہے وہ کسی طور پر بھی میری کارگزاریوں کے ہم پلہ نہیں ہے، اگر میں جان فشن خان ولایتی کا حوالہ دوں تو اس کا ناکافی ہونا مزید نمایاں ہوگا، اس نے دہلی سے پہلے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا، کسی ایک لڑائی میں بھی شریک نہیں ہوا، اور اس کے فرائض چند گھوڑ سواروں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں

موجود رہنے تک محدود تھے، لیکن اسے بیس[۲۰] ہزار روپے سالانہ جمع کی جاگیر عطا کی گئی، اس کے برعکس میں شب و روز سرکار کی خدمت میں مصروف رہا اور باغیوں کے خلاف میری جد وجہد دہلی میں ان کے سرغنوں کے لیے اس قدر اہمیت کی حامل تھی کہ انھوں نے باضابطہ اعلان جاری کیا جس میں اس شخص کے لیے بیس[۲۰] ہزار روپے انعام کا وعدہ کیا گیا جو انھیں مولوی سید رجب علی خاں بہادر کا سر لا کر دے۔

میں اپنے کئی معتمد ملازموں سے محروم ہو چکا ہوں جنھوں نے جاسوسوں کے طور پر کام کیا اور جو دشمن کے ہاتھوں میں پڑ کر یا تو سفاکانہ طور پر قتل کر دیے گئے یا بے دردی سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے، خود باغیوں کے ساتھ بار بار میرے جھگڑے ہوتے رہے جن میں سے ایک مقابلہ میں میرے چار سوار خطرناک حد تک زخمی کر دیے گئے اور میں انھیں ایک چار پائی پر ڈال کر کیمپ میں لایا۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ یہ میری تنہا اور بلا شرکت غیرے ذاتی جد وجہد اور اثر آفرینی کا باعث تھا جو سابق شاہ دہلی اپنے کو حوالہ کرنے پر آمادہ ہوئے ——— اور ان کے بیٹے یعنی شہزادے کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کے حوالہ کیے گئے ——— اور یہ کہ سابق شاہ کے ہزاروں حامیوں سے جنھوں نے تلواریں ہاتھوں میں لیے ہوئے مرنے کا عزم کر رکھا تھا اسلحے چھینے گئے، کرنل بیچر صاحب بہادر میرے اس تمام بیان کی سچائی کی تصدیق کریں گے۔

میں عاجزانہ طور پر واثق امید کا اظہار کرتا ہوں کہ سرکار انگلشیہ جس نے اپنے خیرخواہ ماتحتوں کے کارہائے نمایاں کے اعتراف اور انھیں انعامات سے نوازنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، میرے دعاوی پر فیاضانہ غور فرمائیگی اور مجھے میری جد وجہد اور قربانیوں کے شایان انعام صلہ میں دے گی۔

فرمان گورنر جنرل بہادر بنام منشی رجب علی مورخہ ۱۸؍ جون ۱۸۵۸ء	یہ دیکھتے ہوئے کہ فساد شروع ہونے سے قبل حسب الطلب کیپٹن ہڈسن تم دہلی کے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے اور بعد ازاں

کیپٹن موصوف کے ماتحت کمانڈر انچیف کے میر منشی مقرر ہوئے، اور تم نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض نہایت خاطر خواہ طور پر ادا کیے۔

— اور یہ کہ محاصرۂ دہلی کے دوران تم نے مستند خبروں کی فراہمی میں شاندار کارکردگی دکھائی۔

— اور یہ کہ بدلی سرائے کی مہم کے دوران بھی تم موجود تھے، اور علاقہ کے زمینداروں کو اپنے مقاصد میں شریک کرکے ان کے جاسوسوں کے ذریعہ باغیوں کی روزمرہ نقل وحرکت کی اطلاعات فراہم کرتے رہے۔

— مزید برآں یہ دیکھتے ہوئے کہ مقبرہ ہمایوں کے قریب شاہِ دہلی کی گرفتاری کے موقع پر اور دوسری صبح شہزادگان مرزا مغل، ابوبکر اور خضر سلطان کو حراست میں لیے جانے کے وقت تم میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود تھے۔

— اور یہ کہ اس کے علاوہ تم نے متعدد اہم اور امتیازی خدمات سرانجام دی ہیں۔

لہٰذا ۲۶۹۶ روپے جمع کی وہ جاگیر جو ۱۸۵۳ء میں تمہیں ضلع لدھیانہ میں جگراؤں کے نزدیک بخشی گئی تھی کہ ۲۲۹۶ روپے تمہارے نام تاحیات اور چار سو روپے برائے نسلاً بعد نسلٍ، ہماری کمال عنایت کے سبب اب اس جاگیر سے ۱۴۹۶ روپے تمہیں عمر بھر جاری رہیں گے اور ۱۲۰۰ روپے کی جاگیر نسلاً بعد نسلٍ تمہارے ان بیٹوں کے لیے ہوگی جو تمہارے اپنے خونی رشتے کے وارث ہوں۔[1]

---

[1] فائل مذکورہ، ورق ۶۷۹۔

چیف کمشنر پنجاب کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ تمھیں اس فرمانِ عام کے ساتھ مالیتی پانچ ہزار روپے کی ایک خلعت پیش کی جائے، تم بلاشبہ اس اعلیٰ انعام کو، جو تمھاری ان شاندار اور موثر کارگزاریوں کے عوض عطا کیا گیا ہے، جو تم سرکار کے لیے بجا لائے، اپنی آسایش اور بہبودی کا ذریعہ سمجھوگے، اور اس فرمان کو اپنے دوستوں اور ہمسروں کے درمیان ذاتی فخر اور عزت کا باعث خیال کروگے۔

اصل فرمان فارسی میں لکھا گیا تھا، جس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس فرمان میں جہاں منشی رجب علی کا بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کے موقع پر میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود ہونے کا ذکر ہے، وہاں اس نے صرف موجودگی کے بیان کو اپنی خدمات کے مقابلہ میں کم تر سمجھ کر اس کے رد میں مندرجۂ ذیل نوٹ لکھا ہے:

یہ ایک غلطی ہے، وہ میں ہی تھا جو سابق بادشاہ دہلی کو ہمایوں کے مقبرہ سے لایا، اور نصف راہ میں کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کی طرف گھوڑ سوار دوڑائے، وہ تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھے اور میری طرف سے سابق بادشاہ کی سپر اندازی کی اطلاع پر فوراً میرے ساتھ آملے۔ اس کے ثبوت میں کرنل بیچر صاحب بہادر اور کرنل برن صاحب بہادر کی اسناد منسلک ہیں (مولوی سید رجب علی خاں بہادر)

سند[1] (کرنل) اے۔ بیچر کوارٹر ماسٹر جنرل
بحق منشی رجب علی (مورخہ دہلی)
۲۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء

مجھے ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے جو میر منشی مولوی رجب علی خاں بہادر نے دہلی فیلڈ فورس کی نقل و حرکت کے دوران تمام عرصہ

---

[1] فائل مذکورہ، ورق ۷۷۹۔

فرسٹ ای، پی نیوز یلیٹرز کے قائم مقام کوارٹر ماسٹر جنرل لفٹیننٹ ڈبلیو۔ ہڈسن کی براہ راست ہدایات کے تحت محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے انجام دیں، مئی کے مہینے سے لے کر جب کہ کرنال میں اس کی تشکیل ہوئی، موجودہ وقت تک مولوی رجب علی کی جدوجہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ وہ بڑے دشوار حالات میں بھی مصروف کار رہا ہے، اس نے تقریباً ہر روز شہر سے خطوط کے ذریعہ لگاتار مخبری کرتے رہنے کے علاوہ دشمن کی بیرونی حرکات و سکنات کے متعلق براہ راست اور مستحکم جاسوسی جاری رکھی، میں سمجھتا ہوں کہ مولوی رجب علی نے سرکار ہند کے ساتھ قابل تعریف اور دیانتدارانہ جان نثاری کے جس اعلیٰ کردار کا ہمیشہ مظاہرہ کیا ہے، وہ اس نے عظیم آزمایش کے اس دور میں نہ صرف برقرار ہی رکھا، بلکہ اس میں بے حد اضافہ کیا، میں اس کی کارگذاریوں کو سرکار کے ہمدردانہ ملاحظہ کے لیے پیش کرتے ہوئے اس کے لیے ٹھوس اور مستقل انعام کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔ وہ فتح دہلی ہی سے بادشاہ کو حوالہ کرنے کے لیے آلۂ کار بنا رہا ہے اور ان تینؔ شہزادوں کی گرفتاری میں بھی، جو سرکار کے لیے انتہائی خطرناک تھے اور دہلی میں عیسائیوں کے بے رحمانہ قتل عام میں ملوث تھے، اور دوسرے فرائض کی بجاآوری میں اس نے بہت سارے ذاتی خطرات مول لیے۔ مجھے واثق یقین ہے کہ سرکار برطانیہ کے نیک مقاصد کی خاطر وہ اب بھی اپنی تلوار کو اتنا ہی استعمال کرنے کو تیار ہے، جتنا کہ اپنا قلم۔

[1] کرنل ایچ۔ پی۔ برن بنام جی۔ رکٹس، اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ متعلق منشی رجب علی (محررہ دہلی ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء)

حامل ہذا مولوی سید رجب علی خاں بہادر نے مجھے آپکے نام تحریر دینے کی درخواست کی ہے۔ ضلع لدھیانہ میں اپنے ایک رئیس کی حیثیت سے آپ اسے پہلے ہی جانتے ہیں۔

گزشتہ چار ماہ کے دوران اس نے محکمہ خفیہ اطلاعات میں بڑی عمدہ خدمات انجام دی ہیں اور جد وجہد کے آخری مراحل میں بادشاہ اور اس کے بیٹوں کو پیش کرنے کا ذریعہ یہی تھا، بادشاہ کو اس نے بذاتِ خود پیش کیا۔

اس نے لاہور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے تحت اس تمام عرصے تک ملازمت کی جب میں وہاں ڈپٹی سکریٹری تھا، سر ہنری لارنس کو جن کا وہ پنجاب کی جنگ کے دوران معتمد (کانفیڈنشل) منشی تھا، اس پر بے حد اعتماد تھا، میرے علم میں سرکار کا کوئی اہلکار ایسا نہیں جس نے ملک کے لئے منشی رجب علی سے بہتر خدمات انجام دی ہوں اور یہ سن کر بڑی مسرت ہوگی کہ اسے اس کا مناسب انعام مل گیا ہے۔

[2] چٹھی سر جان لارنس بحیثیت چیف کمشنر پنجاب بنام منشی رجب علی (محررہ لاہور، ۵ اگست ۱۸۵۷ء)

بعد تسلیمات، تمہاری چٹھی بنام حکیم احسن اللہ وزیر شاہ دہلی کی نقل، جو تم نے کمشنر ضلع (ہوڈسن) کو بھیجی، مجھے مل گئی۔ درحقیقت اس کا انداز اور تجاویز اس نوعیت کی تھیں کہ جب وہ چٹھی باغیان دہلی کے ہاتھوں میں پہنچی ہوگی، تو ان کے لئے اس قدر شدید دھچکا ہوئی ہوگی، گویا کہ بارود خانے کے درمیان کوئی بم گرا ہو، میرا مطلب یہ ہے کہ فی الجملہ یقیناً انھوں نے ایک دوسرے پر سے کل اعتماد کھو دیا ہوگا۔

اصل چٹھی اردو میں لکھی گئی تھی جس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کی گئی ہے۔

---

[1] فائل مذکورہ، ورق ۹۷۷، [2] فائل مذکورہ، ورق ۵۷۷

فرمان[1] سر جان لارنس وائسرائے و گورنر جنرل ہند بنام منشی رجب علی (محررہ ۳۱ اگست ۱۸۶۵ء)

تمھاری ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جو تم نے بعض اہم مواقع پر ملک کے لئے انجام دیں یعنی :-

برطانوی افواج کے افغانستان جانے کے لئے برائے حصول اجازت جبکہ سرحد حاکم پنجاب سے گفت و شنید کے وقت،

ان مہمات میں جو پنجاب کے برطانوی عمل داری میں شمولیت کا باعث ہوئیں، اور

سنہ ۱۸۵۷ء میں محاصرہ دہلی کے دوران

۲۶۹۶ روپے سالانہ جمع کی ایک جاگیر جس میں سے ۱۵۲۱ روپے کی رقم دوامی عطیہ اور بقیہ صرف تاحیات تمھیں مرحمت کی جا چکی ہے، اب مذکورہ بالا کارکردگیوں کے پیش نظر برائے منظوری مزید انعام ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی سفارش پر اس کی بجائے مذکورہ کل جاگیر تمھیں دوامی طور پر عطا کی جاتی ہے، اس عطیہ کے بدلے تمھیں سرکار برطانیہ کے ساتھ اپنی خیرخواہی کا ہمیشہ ثبوت دینا چاہئے،

چٹھی تحریر کردہ منشی رجب علی بنام مسٹر ہیملٹن سابق کمشنر دہلی (بحوالہ فائل مذکورہ ورق ۷۸۳)

دریائے علم را گوہر نایاب و سپہر اقبال را آفتاب جہانتاب، مرجع علما و فضلا و مجمع محرز قصبات السبق حکما، دوربین جناب معلی القاب دام اقبالہم، خدمت با عظمت بہمنتا کہ از تحریر مشفقے سید عبداللہ توجہات و التفات و عنایات آنجناب نسبت خود دریافتہ بجناب بہانگاہ باری اداکرم کہ این ذرہ بے قدر را بندگان حضور منشأ م رونق افروزی خود و بدیار فسیح الفضا

---

[1] فائل مذکورہ، ورق ۵۷۷،

شدن فراموش نه فرموده اند؛ بلکه برائے فلاح و بهبود بنده با وجود کثرت مشاغل توجه دارند۔ حقیقت
این ست که خدمات این ذرهٔ بے قدر از عهد فرمان فرمائے کشور عدل و انصاف و مروت و
دانش و فتوت و علم و فضل سر جارج رسل کلارک صاحب بهادر دام اقبالهم در ملک
محفوظ این روے دریاے ستلج و کوهستان و لاهور و حاضر بودن بحضور آنجناب در عهد کرنیل
سر هنری منٹگمری لارنس صاحب بهادر بمقدمهٔ تحقیقات جرم مولراج ناظم ملتان و در
مفسده سنه ۱۸۵۷ء موجود بودن در عین کارزار بمقابله اضراب التواپ آتش بار و آوردن
بادشاه کوتاه اندیش دهلی بحضور صاحبان افواج ظفر امواج و مقابله بودن بسبب دستان
و مجروحی پنج سوار همراهی خود و مامور شدن بحکم ویسرائے گورنر جنرل حال بنا بر مدد دهی تفتیش
پیشوک صاحب بهادر در مقدمه ڈیسبر وغیره حالات که از دفتر گورنرے و لاهور و
انباله و دهلی ظاهر و خطوط انگریزی صاحبان عالی شان بر آن شاهد صادق والحمد لله
که درین وقت حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بهادر و سر فریڈرک کری بارنٹ صاحب
بهادر و مانسل صاحب بهادر و خصوص آنجناب رفیع الالقاب بدربار دربار ملکهٔ مقدسه
انگلستان خلد الله ملکها و سلطانها موجود اند و عندالاستفسار هر چه واقعی است بنظر انصاف
از شرح و بسط آن دریغ نخواهند فرمود، پس مقام غور است که اقرارے که بابت عطائے
کل جاگیر موروثی بنده براڈفٹ صاحب بهادر کردند و سر فریڈرک کری بارنٹ صاحب
بهادر که اگر در معرکه سکهان لاهور ثابت قدمی و تدابیر مستحکم نمی فرمودند تمام کشور پنجاب
از دست سرکار انگریزی بدر می رفت و شورشے عظیم برپا می شد، تصدیق خود بر اقرار براڈفٹ
صاحب بهادر نگاشته و من بحق خود نرسیدم در دفتر انگریزی حالش واضح است، و در آن
وقت رازها و اسرارها که صاحب ممدوح سپرد بنده کردند تا امروز هم بر زبان نیاورده

و صاحب ممدوح در خط انگریزی خود اشاره باں کرده اند و نزدم موجود و بے شک صاحب ممدوح الصدر عند الاستفسار خود بیان خواہد فرمود، ہرگاه چنیں صاحبان عالی شان مربی خود و گواه خود دارم، و از قات تا قات عدالت سرکار انگلشی مشہد است دل غمگسار چرا در تصور ایں امور پاش پاش نگردد، و دیدهٔ جیحوں و جگر خون چگونہ نشود، مرا فقط برائے ایں نه کردم کہ عمر نوح و خزانهٔ قارون و گریہ ایوب و صبر یعقوب از کجا پیدا کنم، و دنیاے دنی را گاہے بنظر نیاورده ام، و ہرچہ بدست آمد در بنائے مساجد و چاہات فی سبیل اللہ و خیرات براه خدا صرف کردم، ایں امر از غایت شہرت محتاج بدلیل نیست، پس اگر سعی آنجناب اندک نظر توجہ وزیر اعظم کشور انگلستان بحال شود بمقصود خود خواہم رسید ورنہ بقول شاعر

ع۔ زبانِ شکوه نه داریم دوست دامن گیر

داستانِ بنده دراز است، زیاده ازیں طول نه کردم کہ موجب ملال مزاج ہمایوں نگردد، مختصر ایں است کہ قبل ازیں ہم خدمات سرکار بجانفشانی کرده ام، و ایں وقت عمرم زیاده از شصت سال است، تا زنده ام بجان حاضرم، و دعائے ترقی ملک و دولت سرکار سپہر اقتدار انگلشی و صاحبان قدر افزا و عنایت فرمائے خود می کنم قلم شکستم و مضمون مختصر کردم، کہ نیست طرز ادب گفتگوے طولانی، آفتاب اقبال تاباں باد۔

سید رجب علی عفی عنہ

معروضہ ۲۲ ر ستمبر ۱۸۹۶ء

بمقام جگراؤں ضلع لودیانہ

مہر

سیرت نبوی کے قدیم و اولین مآخذ اور ان کا تنقیدی جائزہ

تصحیح و استدراک

از جناب محمد اجمل اصلاحی ندوی ایم، اے علیگ مدیر معاون مجلہ ثقافۃ الہند نئی دہلی

جون کے معارف میں ڈاکٹر تقی الدین ندوی کا مقالہ "سیرت نبوی کے قدیم و اولین مآخذ اور ان کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے مقالہ پر از معلومات ہے لیکن تنقیدی جائزہ میں مزید تفصیل کی ضرورت تھی ذیل میں اس مقالہ کی بعض اہم فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

(الف) سیرت ابن اسحٰق کے بارے میں فاضل مقالہ نگار رقمطراز ہیں:-

"ابن ہشام نے اس کی تہذیب و تلخیص کرکے اس عطر بیز مشک کی خوشبو کو وقف عام کیا اور آج وہی ذوق شناسان علم کی توجہات کا مرکز ہے، لیکن ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق کو زیاد البکائی اور یونس بن بکیر سے حاصل کیا ہے، جن کے بارے میں محدثین کی رائیں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں۔" (ص ۴۱۶)

معلوم نہیں فاضل مقالہ نگار سے یہ چوک کیسے ہوگئی، ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق صرف زیاد البکائی سے حاصل کی ہے، پوری سیرت میں یونس بن بکیر سے ایک روایت بھی منقول نہیں ہے

ممکن ہے ابن ہشام کی سندوں میں یونس کے نام سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہو، لیکن یہ یونس بن بکیر نہیں ہیں، بلکہ ابن ہشام کے شیخ یونس بن حبیب نحوی (متوفی ۱۸۳ھ) مراد ہیں، ابن ہشام نے متعدد مقامات پر "یونس النحوی" نسبت کے ساتھ لکھا ہے۔ ابن ہشام کے تذکرہ میں فاضل مقالہ نگار نے خود لکھا ہے کہ "زیاد البکائی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور ان ہی کی روایت سے مغازی ابن اسحٰق کی سماعت و تحصیل کی تھی"۔ (ص ۴۵۴)

(ب) سیرت ابن ہشام کے بارے میں لکھتے ہیں،

"مصطفیٰ السقا اور عبدالسلام ہارون کی تحقیق و تہذیب کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں اس کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن طبع ہوا"۔ (ص ۴۵۴)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیرت ابن ہشام کا ایک نہایت عمدہ ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا، جس کی تحقیق و تہذیب کا کام مصطفیٰ السقا اور عبدالسلام ہارون کے اشتراک سے انجام پایا، حالانکہ اس طرح کا کوئی ایڈیشن اب تک منظر عام پر نہیں آیا، اصل میں فاضل مقالہ نگار نے سیرت ابن ہشام کے دو ایڈیشنوں کو خلط ملط کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سیرت ابن ہشام کا ایک محقق ایڈیشن تین صاحبان مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی نے تیار کیا تھا جو پہلی بار ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ بمصر سے شائع ہوا تھا پھر دوبارہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

عالم عرب کے ممتاز محقق عبدالسلام ہارون نے تہذیب سیرۃ ابن ہشام کے عنوان سے سیرت ابن ہشام کی تلخیص و تہذیب کی تھی جس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۶۳ء میں المؤسسۃ العربیۃ الحدیثۃ قاہرہ سے

ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ طبع دوم ۱۳۷۵ھ، ۱: ۱۰۰، ۹۰، ۳۳۵

(فی یونس بن حبیب النحوی ۲: ۳۴۳ والشذا فی یونس النحوی)

شائع ہوا تھا۔

(ج) کتب مغازی کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "ذیل میں ہم ان اکابرین امت کے نام اور ان کی تصنیفات کی ایک جامع فہرست درج کرتے ہیں، جو فن سیر کے ارکان و اساطین شمار ہوتے ہیں" (ص ۴۵ ۴ ۴)، اس کے بعد اٹھائیس (۲۸) علمائے مغازی کا تذکرہ کیا ہے، اس جامع فہرست سے مشہور علمائے مغازی کے نام غائب ہیں جن کی معلومات یا تصنیفات کو اس موضوع پر اہم ماخذ کی حیثیت حاصل رہی ہے، اور انھیں کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مثال کے طور پر یہاں چند ناموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابان بن عثمانؓ بن عفانؓ (متوفی ۱۰۵ھ) خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ بن عفان کے صاحبزادے تھے، ۳۶ھ میں قصاص عثمانؓ کی مہم میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ شریک تھے، اس لئے جوزف ہوروفتس کا خیال ہے کہ ان کی پیدائش کسی طرح ۲۰ھ سے بعد کی نہیں ہو سکتی، مدینہ کے فقہائے عشرہ میں انکا شمار ہوتا تھا ۷۵ھ سے ۸۲ھ تک سات سال مدینہ کے گورنر رہے، عبد الملک بن مروان نے معزول کیا، ان کے انتقال کے بارے میں کئی روایتیں ہیں، امام بخاری نے التاریخ الکبیر میں ولید کے عہد (۸۶-۹۶ھ) میں وفات لکھی ہے، جب کہ ابن سعد نے یزید ثانی (۱۰۱-۱۰۵ھ) کا زمانہ لکھا ہے۔[1]

ابن سعد نے مغیرہ بن عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام بن المغیرہ کے بارے میں واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ "مغیرہ ثقہ تھے لیکن کم احادیث کی روایت کی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی انھوں نے ابان بن عثمان سے اخذ کئے تھے، وہ ان کے سامنے اکثر پڑھے جاتے تھے، اور وہ ہمیں انکی

[1] سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین، مصنفہ پروفیسر جوزف ہوروفتس ترجمہ نثار احمد فاروقی ادارۂ ادبیات دلی، ۱۹۸۰ء، ۱۱-۱۲، طبقات ابن سعد، بریل، ج ۵، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

تعلیم کا حکم دیتے تھے۔[1] مغیرہ بن عبد الرحمٰن ابن اسحٰق اور ان کے والد اسحٰق بن یسار کے علاوہ امام مالکؒ کے شیوخ میں ہیں اور ثقہ ہیں۔[2] ابن سعد نے اہل مدینہ کے طبقہ ثانیہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ شرحبیل بن سعد (متوفی سنہ ۱۲۳ھ) سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ مغازی اور اصحاب بدر کا ان سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔[3] شرحبیل نے غزوۂ بدر اور غزوہ احد میں شریک ہونے والوں نیز مہاجرین حبشہ اور مہاجرین مدینہ کی فہرست مرتب کی تھی، آخر عمر میں افلاس کا شکار ہوئے جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کے مغازی کو ساقط الاعتبار قرار دیا لیکن موسیٰ بن عقبہ نے جو خود ثقہ اور فن مغازی کے سرخیل ہیں شرحبیل بن سعد کی مدافعت کی ہے۔[4]

۳۔ عبد اللہ بن محمد بن ابی بکر بن حزم (متوفی سنہ ۱۳۵ھ) ابن اسحٰق کے اہم شیوخ میں سے ہیں مغازی کے ماہر تھے، ان کی روایات ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور طبری کا ماخذ ہیں، وفود، ارتداد اور بعض تحریری دستاویزوں کے سلسلہ میں ان کی روایتیں خاص طور سے آتی ہیں، عبد اللہ بن ابی بکر کے ایک بھتیجے عبد الملک بن محمد بن ابی بکر کے بارے میں خطیب بغدادی نے سریج بن النعمان کا قول نقل کیا ہے کہ ہم نے عبد الملک سے سن کر مغازی قلمبند کی جو انھوں نے اپنے چچا عبد اللہ بن ابی بکر سے حاصل کی تھی۔[5] واقدی نے بہت سی روایات عبد الملک کے دوسرے بھائی عبد الرحمٰن کے واسطے سے نقل کی ہیں، محدثین نے عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم کی توثیق کی ہے، امام مالکؒ کا قول ہے کہ وہ اصحاب علم اور اہل بصیرت میں سے تھے، امام نسائیؒ نے "ثقہ ثبت" لکھا ہے۔[6]

---

[1] طبقات ابن سعد، دار صادر بیروت ۵: ۴۱۰ [2] میزان الاعتدال طبع الحلبی ۴: ۱۶۳، تہذیب ۱۰: ۲۲۵ [3] تہذیب ۴: ۳۲۱ [4] تہذیب ۱: ۳۱۱ نیز ملاحظہ ہو جوزف ہورووٹس ۱: ۳۲ - ۳۴ [5] تاریخ بغداد طبع الخانجی ۱۳۴۹ھ ۱۰: ۴۰۹ [6] تہذیب ۵: ۱۶۴ نیز دیکھئے جوزف ہورووٹس: ۵۳ - ۵۸

۴۔ ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل (متوفی ۱۳۱ھ یا ۱۳۷ھ) عروہ بن الزبیر، علی بن حسین اور سلیمان بن یسار وغیرہ سے روایت کی۔ امام زہری کے معاصر اور ان کے شیخ بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ابن اسحٰق، امام مالک اور امام لیث کے بھی شیخ ہیں۔ امام نسائی اور ابوحاتم نے ثقہ قرار دیا ہے[1]۔ فیوک نے مغازی پر ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے[2]۔

۵۔ عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم (متوفی ۱۷۶ھ) عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کے تذکرہ میں ان کا ذکر گزر چکا ہے۔ ہارون رشید کے عہد میں بغداد میں قاضی تھے اور وہیں انتقال کیا۔ خطیب نے لکھا ہے کہ جلیل القدر عالم، سیرت و حدیث کے ماہر اور ثقہ تھے۔ ابن ندیم نے سن وفات ۱۷۶ھ لکھا ہے، لیکن ان کے شاگرد سریج بن نعمان جوہری کا بیان ہے کہ ان کا انتقال ۱۷۷ھ میں ہوا۔ سریج خود جنازہ میں شریک تھے[3]۔ ابن ندیم نے فن مغازی پر عبدالملک بن محمد کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (ولہ من الکتب کتاب المغازی)[4]

۶۔ علی بن مجاہد کابلی (متوفی ۱۹۰ھ) ابن الکابلی کے نام سے مشہور ہیں۔ ابومعشر سندی، موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ابن اسحٰق، یونس بن ابی اسحٰق اور سفیان ثوری وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ علی بن مجاہد سے سماعت کرنے والوں میں جریر بن عبدالحمید، محمد بن عیسیٰ بن طباع، صلت بن مسعود کے علاوہ امام احمد بن حنبل بھی ہیں۔ امام احمد ابن حنبل نے ۱۸۲ھ میں ان سے سماعت کی۔ یحییٰ بن ضریس اور احمد بن جعفر جمال انھیں جھوٹا قرار دیتے ہیں لیکن امام ترمذی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے روایتیں درج کی ہیں، اور میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ (کتبت عنہ ما اُری بہ بأسا) ابن کابلی نے فن مغازی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی[5]۔

---

[1] تہذیب ۹، ۳۰۷-۳۰۸ [2] انگریزی ترجمہ سیرت ابن ہشام (دی لائف آف محمد) از گلیوم مطبوعہ ۱۹۵۵ء مقدمہ ۱۹۔
[3] تاریخ بغداد ۱۰، ۴۰۸-۴۱۰ [4] فہرست مطبوعہ رحمانیہ مصر ۱۴۵ [5] تاریخ بغداد ۱۲، ۱۰۴، تہذیب ۷، ۳۷۷-۳۷۸، سمعانی، گب میموریل لندن ۱۹۱۲ء ورق ۴۶۹۔

۔ ابان بن عثمان بجلی، احمر بجلی کے لقب سے مشہور تھے، یاقوت نے ابوجعفر طوسی کی کتاب اخبار مصنفی الامامیہ کے حوالہ سے ان کے حالات لکھے ہیں، کوفہ کے رہنے والے تھے، شعراء کے حالات انساب اور ایام عرب کے ماہر تھے، ان موضوعات پر ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ اور محمد بن سلام جمحی نے ان سے کثرت سے روایتیں نقل کی ہیں، ابان بن عثمان بجلی کی ایک ہی تصنیف معروف ہے جس میں انھوں نے مبدأ، مبعث، مغازی، وفات، سقیفہ اور ردہ کے واقعات جمع کئے تھے[1]، میزان الاعتدال میں ذہبی نے لکھا ہے کہ احمر بجلی ابان بن تغلب کے شاگرد تھے۔ ان کے بارے میں کلام کیا گیا ہے لیکن بالکلیہ متروک نہیں ہیں، (تکلم فیہ ولم یترک بالکلیۃ[2]) ابان بن تغلب بھی شیعہ عالم لغوی اور نحوی تھے ابن عیینہ، حماد بن زید اور ہارون بن موسیٰ وغیرہ نے ان سے حدیث کی سماعت کی ۱۴۱ھ میں انتقال ہوا[3]۔

ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ (۱۱۰ - ۲۰۹ھ) ابن ہشام کے اہم شیوخ میں سے ہیں، سیرت ابن ہشام میں اشعار وانساب اور تاریخ کے علاوہ مغازی کی روایتیں بھی ابوعبیدہ سے منقول ہیں اس سے ابان بن عثمان بجلی کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

۸ - ابوالحسن مدائنی (۱۳۵ - ۲۲۵ھ) علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف المدائنی[4] کی علمی زندگی کا آغاز محدث کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی توجہ تاریخ و تذکرہ اور انساب و اشعار پر مرکوز کر دی تذکرہ نگاروں نے "الاخباری صاحب التصانیف والمغازی، والانساب" کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے، خطیب بغدادی نے لکھا ہے۔

"وکان عالما بایام الناس واخبار العرب وأنسابهم، عالما بالفتوح

---

[1] معجم الادباء (دار فائدہ) ۱ : ۱۰۹ بغیۃ الوعاۃ طبع انجانجی مصر ۱۳۲۶ھ، ۱۷۶، طبقات فحول الشعراء شرح محمود محمد شاکر، دار المعارف مصر ۱۹۵۲ء ۲۰ [2] میزان الاعتدال ۱ - ۵ [3] معجم الادباء ۱ - ۱۰۸ بغیۃ الوعاۃ ۱۷۶ [4] ابوالحسن مدائنی پر ایک مفصل مقالہ قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے دو قسطوں "فردوس" مارچ ۱۹۷۸ء

والمغازی وروایۃ الشعر صدوقاً فی ذلک"[1]

مدائنی کے شیوخ میں موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) اور ابو معشر سندی (متوفی ۱۷۰ھ) جیسے ائمہ مغازی اور ابو الیقظان (متوفی ۱۹۰ھ) جیسے عالم انساب شامل ہیں، شاگردوں میں مشہور مورخ ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ بغدادی (متوفی ۲۹۹ھ) صاحب التاریخ الکبیر اور ماہر انساب زبیر بن بکار (متوفی ۲۵۶ھ) صاحب انساب قریش اور احمد بن الحارث الخزاز (متوفی ۲۵۸ھ) قابل ذکر ہیں۔

یاقوت نے ابن ندیم کی کتاب سے مدائنی کی تصنیفات کی فہرست نقل کی ہے، جس میں کتبہ فی اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے سیرت کے موضوع پر مدائنی کے تیس رسائل کا ذکر ہے، تین کتابوں کتاب عہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب سرایا رسول اللہ علیہ وسلم کے نام مکرر ہو گئے ہیں، ان مکرر ناموں اور کتاب حجۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ کو اس فہرست سے خارج کر دیا جائے تو چھبیس[2] کتابیں ہوتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

کتاب امہات النبیؐ، کتاب صفۃ النبیؐ، کتاب اخبار المنافقین، کتاب عہود النبیؐ کتاب تسمیۃ المنافقین ومن نزل فیہ القرآن منہم ومن غیرہم، کتاب تسمیۃ الذین یؤذون النبیؐ وتسمیۃ المستہزئین، کتاب رسائل النبیؐ، کتاب کتب النبیؐ الی الملوک کتاب آیات النبیؐ، کتاب اقطاع النبیؐ، کتاب فتوح النبیؐ، کتاب صلح النبیؐ، کتاب خطب النبیؐ، کتاب المغازی، کتاب السرایا، کتاب الوفود (اس میں وفود یمن، وفود مضر اور وفود ربیعہ کا تذکرہ ہے)، کتاب دعاء النبیؐ، کتاب خبر الافک، کتاب ازواج النبیؐ کتاب عمال النبیؐ علی الصدقات، کتاب ما نہی عنہ رسول اللہ ﷺ، کتاب اخبار

---

[1] [illegible] معجم الادباء ۱۲: ۱۲۹ - ۱۳۱

کتاب الخاتم والرسل، کتاب من کتب لہ النبیؐ کتابا و امانا، کتاب اموال النبیؐ، و کتاب من کان یرو علیہ الصدقۃ من العرب[۵]۔

ابن عدی کے نزدیک مدائنی حدیث میں قوی نہیں ہیں، لیکن ابن معین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے[۶]۔

۹۔ ابوجعفر الخزاز (متوفی ۲۵۸ھ) ابوجعفر احمد بن الحارث بن المبارک الخزاز مدائنی کے شاگرد رشید اور "صاحب المدائنی" کے لقب سے مشہور تھے، کثرت سے روایتیں بیان کیں، ثقہ تھے، ابن ندیم نے مغازی پر ان کی کتاب "مغازی النبیؐ و سرایاہ و ذکر ازواجہ" کے عنوان سے ذکر کی ہے[۷]، یہ کتاب بظاہر مدائنی ہی کی روایات پر مشتمل رہی ہوگی، خطیب بغدادی نے لکھا ہے، کہ خزاز صاحب علم و فہم و صدوق تھے، مدائنی سے ان کی ساری تصنیفات کی روایت کی، ابوسعید سکری، اور ابوبکر ابن ابی الدنیا وغیرہ نے ان سے روایت کی، ابن قانع کا بیان ہے کہ ۲۵۸ھ میں بغداد میں انتقال کیا، ایک قول ۲۵۹ھ کا بھی ہے[۸]۔

۱۰۔ ابراہیم بن ہلال ثقفی (متوفی ۲۸۳ھ) طوسی نے امامیہ کے مصنفین میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اصفہان میں سکونت پذیر تھے، یاقوت نے ابراہیم کی تصنیفات میں کتاب المغازی کا بھی ذکر کیا ہے[۹]۔

(د) سیرت پر متاخرین کی تصنیفات کے عنوان سے فاضل مقالہ نگار نے سات کتابوں کا ذکر کیا ہے، اس فہرست میں درج ذیل کتابوں کا نام نہیں ہے حالانکہ سیرت نگاری کی تاریخ میں انھیں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے،

---

۵ فہرست ابن ندیم کا جو اڈیشن ہمارے پیش نظر ہے، اس میں دو رسائل فتوح النبیؐ و اخبار النبیؐ کا ذکر نہیں ہے، ۶ میزان الاعتدال ۳-۱۵۳ ۷ فہرست : ۱۵۲ ۸ تاریخ بغداد ۴-۱۲۲، معجم الادبا ۲-۲۱۳ ۹ معجم الادبا ۱-۲۳۳

۱۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر۔ حافظ ابن عبدالبر (۳۶۸ھ - ۴۶۳ھ) کی تصنیف ہے، ابن حزم کی جوامع السیرۃ اور ابن سید الناس کی عیون الاثر کا ماخذ ہے، ابن حزم کی بہت سی تحقیقات کا اصل ابن عبدالبر ہی کے ہاں ہے۔ ڈاکٹر شوقی ضیف کی تحقیق سے المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ نے ۱۹۶۶ء مطابق ۱۳۸۶ھ میں طبع کیا۔

۲۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر۔ ابن سید الناس (متوفی ۷۳۴ھ) کی مشہور تصنیف ہے ۱۳۵۶ھ میں قاہرہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۳۔ السیرۃ النبویہ ۔ شہاب الدین احمد بن اسمٰعیل الشیطی (متوفی ۸۳۵ھ) کی مبسوط تصنیف جو تقریباً تیس حصوں میں تھی۔[1]

۴۔ دلائل نبوت کی کتابوں کے سلسلہ میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس موضوع پر امام ابو الحسن ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی ایک کتاب "اعلام النبوۃ" ۱۳۱۹ھ میں بغداد سے المطبعۃ البہیۃ سے شائع ہوئی تھی۔

---

[1] ایضاح المکنون ۲-۴۴

پیرس سے ایک مکتوب گرامی

"جولائی ۱۹۸۲ء کے معارف کے صفحہ ۱۰۵ پر کتابت کی غلطی کی وجہ سے حضرت "عبداللہ بن عمروؓ" کے بجائے عبداللہ بن عمرؓ چھپ گیا ہے، ہم جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس غلطی کی طرف حسب ذیل مکتوب لکھکر توجہ دلائی، اس میں اور بھی ایک مفید بات لکھی ہے جو امید ہے کہ ناظرین کے لئے باعث دلچسپی ہوگی۔"

پیرس، ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون! — عید مبارک

ابھی ابھی جولائی کا معارف پہنچا، ممنون ہوا،

اس کے صفحہ ۱۰۸ "میں عُبداللہ بن عُمرؓ" غلط ہے، یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہیں، مرحوم شاہ معین الدین احمد صاحب نے یہ غلطی نہیں کی ہوگی،

مرحوم کے بیان پر کہ "بے شک ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی" فاضل معاصر محمد مصطفےٰ الاعظمی کی یہ تحقیق ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جانے کے قابل ہے کہ ممانعت کا حکم رسول اکرمؐ سے "صحیح حدیثوں" میں کہیں ثابت نہیں، صرف ایک حدیث

حضرت ابو سعید خدریؓ کی ہے، جو صحیح مسلم میں داخل ہوگئی ہے لیکن ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیان کیا ہے، کہ امام بخاریؒ نے اسے بھی رد کردیا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی ذاتی رائے جو کسی غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوگئی ہے۔

اس خبر سے بھی مسرت ہوئی کہ سیرت شامی چھپ رہی ہے، خدا جلد مکمل کرائے،

نیازمند

محمد حمید اللہ

سلسلۂ سیر الصحابہ

سیرۃ النبیؐ کے مقدس سلسلے کے بعد، سیر الصحابہؓ کا بھی ایک سلسلہ بیان کے مختلف مصنفین ورفقاء سے تیار کرایا گیا ہے، جو گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے، جن میں تین جلدیں مع خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مہاجرین پر ہیں، اور دو جلدیں انصار کرامؓ پر ہیں، اور ایک پوری جلد ازواج مطہرات، بنات طاہرات، اور دوسری صحابیات قانتات پر ہے، تین جلدیں صحابہ وصحابیاتؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت اور صحابہ کے سیاسی، انتظامی، اور علمی کارناموں پر ہے، ان جلدوں میں صحابۂ کرام کی مقدس زندگی کا پورا مرقع آگیا ہے، اسی کی ایک جلد میں حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کا تذکرہ بھی ہے، جو اسلام کے ایک متبحر عالم اور بڑے ہی عبادت گذار تھے، اور حدیثوں میں ان کے بڑے فضائل آئے ہیں۔

قیمت پورے سٹ کی ... ۱۹۱۰۰۰

"منیجر"

ادبیات

غزل

از ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، الہ آباد

یہ فضا عجب فضا ہے، یہ چمن عجب چمن ہے
نہ کہیں ہے شمع روشن نہ کہیں کوئی لگن ہے

کہیں درد و کرب و غم ہے تو کہیں بڑی گھٹن ہے
میں کہوں تو کس زباں سے کہ یہی مرا وطن ہے

کوئی کس طرح سنائے کسے جذبۂ محبت
کہ مزاجِ عہدِ حاضر بڑا حوصلہ شکن ہے

کسی غیر کا گذر ہی ہے کہاں ترے علاوہ
یہ ہے خاص تیری منزل یہ دلوں کی انجمن ہے

مرے دوستوں کو مجھ سے ہے یہی تو بس شکایت
مرے جام میں ابھی تک وہی بادۂ کہن ہے

یہ بتانِ عہدِ حاضر تو ہیں لائقِ پرستش
مگر اس کو کیا کروں میں مرا دل ہی بت شکن ہے

نہ بدل سکا زمانہ مری خوئے عاشقی کو
جو لباس پیشتر تھا وہی اب بھی پیرہن ہے

ہو نصیب ہم کو کیسے اے طفیلؔ سربلندی
نہ متاعِ دین و ایماں نہ متاعِ علم و فن ہے

غزل

از جناب بسنت کمار بسنت، ایڈوکیٹ لکھنؤ

یہ چمن یہ سبزہ و برگ و گل یہ مہکتی شام حسیں حسیں
یہ نسیم و نکہتِ جانفزا کہیں پاس ہے کوئی مہ جبیں

غمِ کائنات نہ پاس آ، غمِ زندگی نہ مجھے ڈرا
میں پیامبر ہوں نشاط کا مری راہ میں نہیں غم کہیں

یہ جبیں پہ پیار سے ہے پڑی شکن [illegible]
یہ جمالِ حسن یہ بانکپن لبِ سرخ و عارضِ آتشیں

ہوا آشیاں سے بلند [illegible]
یہ کلام حسن [illegible] شمیم نرگس و یاسمیں

مجھے فکرِ تیغ ہنر کی ہیں جوں بے پیام و خوشی
مرے لب پہ نغمۂ سرمدی تری دید چشم ہو

نہ طواف دیر و حرم میں کچھ نہ صنم کدہ میں نہ خم میں کچھ
نہیں ہم میں کچھ نہیں تم میں کچھ کسی کو

ہے عجب عالم ہمسفر ہیں وہاں دل تو ادھر ادھر
نہیں راہ میں کوئی راہبر نہیں کوئی

تری کائنات ہے کہکشاں یہ دہر تیری ترا جہاں
تری ذات و نام میں جاوداں تو فلک

جو نسترن و گل تھا کھلا دیا جہاں چاہا خون کو بہا دیا
جو بہار آئی تو کب یہ ہا ہمیں ہوش و

لئے میں پیام بہار کا جو بسنت سوئے چمن گیا
کھلے پھول راہبر، نکھر گیا نہ رہ چمن

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب چمپارن

بستیوں میں وہ چلے آئے ہیں ویرانوں سے
ہو گیا عشق بھی سوا ترے ا

وہ تھے عشرت کدۂ حسن میں جلوہ افروز
ہم رہ عشق میں لڑتے رہے طو

دیکھ یہ معجزۂ تشنہ لبی اے ساقی
مے ابلنے لگی ٹوٹے ہوئے پیم

عشق کی راہ میں آئے ہیں مقام ایسے بھی
راز کی بات بھی کہنا پڑی بر

سوزِ دل، سوزِ جگر، سوزِ محبت کے سوا
چاہیے کیا انھیں ہم سوختہ س

وہ تو ہر حال میں مائل بہ کرم ہیں لیکن
ہم تو جیتے ہیں غمِ عشق کے ا

چاکِ دامن سے جو مل جاتی ہے فرصت ان کو
تیرے دیوانے الجھتے ہیں گر

کیجیے آپ کوئی طرزِ جفا اب ایجاد
دلِ بیتاب بہلتا نہیں ا

حسنِ تدبیر سے جاگ اٹھتا ہے قوموں کا نصیب
کبھی تقدیر بدلتی نہیں ار ما

کام آئے گا کوئی وقتِ مصیبت وارث
یہ توقع ہی نہیں آج کے انسانوں سے

مطبوعات جدیدہ

یون العرفان فی علوم القرآن مرتبہ مولانا قاضی مظہرالدین احمد بلگرامی تقطیع توسط کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۳۲۰ مجلد مع خوبصورت گردپوش قیمت ۱۵ روپیہ پتہ:

(۱) ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (۲) کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور یوپی

رآن مجید کی جمع وتدوین پر اردو میں بہت کام ہوا ہے، لیکن اسباب النزول اور محکم ومتشابہ یا ہے، مولانا قاضی مظہرالدین سابق صدر شعبہ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس کتاب نوں مباحث پر گفتگو کی ہے، اول الذکر مبحث میں جمع وترتیب کے سلسلے کی ضروری بحثوں صطور پر عہد رسالت، عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں قرآن کی جمع وترتیب کی نوعیت ہے اور قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے توقیفی یا عدم توقیفی ہونے کا ذکر کیا ہے اب میں شان نزول کا مطلب، اس کی اہمیت اس کے فائدے اور قرآن کے تدریجاً جانے کی حکمت بتائی ہے، تیسرے باب میں محکم ومتشابہ کے مفہوم ومراد کی وضاحت اور ت دوسرے امور پر بحث کی گئی ہے، غالباً عام قارئین کی رعایت سے آخر الذکر دونوں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے، لائق مصنف احتیاط کی بنا پر عموماً ہر مبحث کے دمین کی رائیں پیش کرکے آگے بڑھ گئے ہیں لیکن اس کی وجہ سے بعض مسائل کے متعلق نا اور خاص فیصلہ سامنے نہیں آسکا ہے، دو ایک جگہ حوالے بھی درج ہونے سے رہ گئے ہے، لبید بن ربیعہ کے شعر گوئی چھوڑ دینے کا واقعہ بلا حوالہ درج ہے، اکثر حوالے ثانوی

ماخذ کے دیے گئے ہیں، عام اور اوسط درجہ کی استعداد رکھنے والوں کو اس کتاب سے قرآن کے بارہ میں بہت سی اچھی اور مفید باتیں معلوم ہوں گی۔

بناتِ اسلام کی دینی و علمی خدمات مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری تقطیع کلاں، کاغذ کتابت عمدہ صفحات ۹۶ قیمت دس روپیے پتہ۔ دائرہ ملیہ، مبارکپور۔ اعظم گڈھ۔

مردوں کی طرح مسلم خواتین کے دینی و علمی کارنامے بھی گوناگوں ہیں، اس کتاب میں ان کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، یہ دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں امت کی عام خواتین کے شوق و جستجوئے علم کا حال بیان کیا گیا ہے، اس میں خصوصیت سے حدیث کی طلب و تحصیل اور اس کے درس و تدریس میں ان کے کمالات دکھائے ہیں اور فقہ و تفسیر حفظ و تجوید، شعر و ادب، خطاطی و کتابت وعظ و ارشاد اور ہدایت و تذکیر میں بھی ان کے کاموں کا جائزہ لیا ہے، دوسرے باب میں علم و فضل اور فقہ و حدیث میں اُن ممتاز متعدد خواتین کا تذکرہ ہے جو دورِ صحابہ میں تھیں، اس کتاب سے مسلمان خواتین کے دینی علوم کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات سامنے آجاتے ہیں، اس کا مطالعہ عورتوں کے لیے خاص طور پر مفید اور سبق آموز ہے،

نمود ہستی مرتبہ جناب سید محمد حسنین صاحب تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۰ قیمت ۲۲ روپیے، پتے (۱) بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (۲) کری سینٹ کوآپریٹو پبلشنگ سوسائٹی لمیٹڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ "نقش" میں مندرجہ ذیل چار اشخاص کی سیرت و شخصیت خدوخال پیش کیے گئے ہیں، فخر الدین محمد شمسی، فخر الدین علی احمد سابق صدر جمہوریہ ہند، قاضی عبد الودود، پروفیسر فضل الرحمن، فخر الدین علی احمد صاحب کے علاوہ تینوں شخصوں کا تعلق صوبہ بہار سے ہے، فخر الدین کے ذکر میں غالب کے خاندان سے ان کے تعلق اور اپنی ان سے متعدد ملاقاتوں کا مفصل ذکر کیا ہے،

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام ۹ نومبر ۱۹۸۰ء کو منعقد اردو اکادمیوں کی کل ہند کانفرنس میں کی گئی ان کی ایک تقریر بھی نقل کی گئی ہے، اس میں اس وقت کے وہاں موجود یو۔پی کے گورنر، وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم وغیرہ کو آڑے ہاتھوں لیا ہے، اردو میں درخواستیں نہ لینے اور ممبروں کو اسمبلی میں اردو میں حلف کا موقع نہ دینے پر سرزنش کی تھی۔ فخر الدین محمد شمسی کی شخصیت علمی حیثیت سے زیادہ ممتاز نہ تھی تاہم وہ عمدہ سیرت و شخصیت کے مالک تھے، اور ان کے اصحاب علم و ادب سے مراسم و تعلقات بھی تھے، قاضی عبدالودود صاحب کی ذات تعارف سے مستغنی ہے، پروفیسر فضل الرحمن بہار کے لائق و فاضل شخص تھے لیکن انھوں نے کم عمر پائی اس لیے ان کی صلاحیتوں کے جوہر پوری طرح نہیں چمکے تاہم ایک پرنسپل اور معلم کی حیثیت سے ان کے کارنامے ان کے شاگردوں کو برابر یاد رہیں گے، جناب سید حسنین نے ان کے بہت سے دلچسپ اور موثر واقعات لکھے ہیں، مصنف نے ہر صاحب تذکرہ کی سیرت و شخصیت اور کمالات کا جوہر کھینچ دیا ہے اور ہر تذکرہ کے ضمن میں متعدد ایسے واقعات بھی بیان کئے ہیں جن سے گذشتہ عہد کی علمی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی حالت بھی سامنے آجاتی ہے، مصنف نے جن اشخاص کے بارہ میں اپنے نقوش و تاثرات پیش کئے ہیں، وہ انکے ممدوح و محبوب ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے دوسرا رخ بھی پیش کرنے میں تامل نہیں کیا ہے، چنانچہ قاضی عبدالودود کے متعلق لکھتے ہیں "قاضی صاحب حافظ قرآن ہیں، عربی دان اور انگریزی و فارسی زبان پر کامل دسترس رکھتے ہیں، انکی بصیرت اور فکر و نظر کا سوز و ساز مگر دل کو نصیب نہیں" ۹ عند التذکرہ انھوں نے اکثر اعتراف کیا کہ عالم وجود کے مسئلہ پر وہ مبہوت ہو جاتے ہیں، اور حیات بعد الموت کی صداقت پر انھیں شبہ معلوم ہوتا ہے، بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ وہ اس لئے مسلمان ہیں کہ پیدائش اور تعلیم و تربیت ایسے خاندان میں ہوئی جو مذہب اسلام کے پیرو تھے ورنہ وہ صرف انسان ہیں، انسانیت کو وہ مذہب تصور کرتے ہیں، رب کو خدا سے موسوم نہیں کرتے، ایک لافانی عظیم توانائی سمجھتے ہیں، جو نظام کون و مکاں پر اٹل ضابطے کے ساتھ

قادر ہے، وہ قانون داں ہیں، اور ولایت سے سند یافتہ بیرسٹر، مرئی اور غیر مرئی، ہر امر کے وجود و عدم کو قاضی صاحب اسی نقطۂ نظر سے سوچنے اور سمجھانے کے عادی ہیں، معجزات اور وحی پر ان کا ایمان نہیں، کشف و کرامت کو وہ خرافات سمجھتے ہیں، قاضی صاحب کا شمار صفِ اول کے محققین میں ہوتا ہے لیکن ان کی تحقیق کا مول سے بعض اہلِ نظر مطمئن نہیں ہیں، اس سلسلہ میں انکی تصنیف اشتر و سوزن پر ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک دلچسپ تبصرہ ہماری زبان سے نقل کرنے کے بعد لائق مرتب لکھتے ہیں "قاضی صاحب کی تحقیقات لطف لینے کی نہیں انکی زبان دیباں اور تکنک پر آج بھی جملے بازیاں کم نہیں" دوسرا حصہ "نقش" تصویروں سے مزین ہے، اس میں بعض اصحاب علم و کمال، مرتب کے خاندان اور خود ان کی طالب علمی اور معلمی کے دور کی مختلف موقعوں کی تصویریں دی گئی ہیں، تیسرے حصہ کا نام "نگارش" ہے، اس میں پرنسپل فضل الرحمٰن، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ کے اردو اور انگریزی خطوط اور تحریروں کا عکس شائع کیا گیا ہے، یہ مجموعہ سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے حصوں کی تقسیم سے بھی خوش ذوقی ظاہر ہوتی ہے، انداز نگارش بھی دلکش ہے،

بیان میرٹھی مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۴۶ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۵ روپے پتہ، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگ پور۔

محمد مرتضیٰ بیان میرٹھی انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے ایک صاحب کمال شخص تھے، اتفاق سے اردو کے جواں سال ادیب و شاعر ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی نظر سے انکے چند اشعار گذرے جن سے متاثر ہو کر انھوں نے اس گمنام شاعر و اہل قلم کے حالات و کلام کی جستجو کا بیڑہ اٹھایا، زیر نظر کتاب انکی اسی دلچسپی اور توجہ کا نتیجہ ہے، انھوں نے بیان کے حالات کی دریافت اور کلام کی فراہمی کیلئے مختلف کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی بھی کی اور ان سے واقفیت رکھنے والے بعض اشخاص کا پتہ چلا ان سے خط و کتابت اور ملاقاتیں بھی کیں، اس کتاب میں پہلے بیان کے خاندانی اور ذاتی حالات و کمالات کا ذکر ہے اور آخر میں انکی شاعری پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے، بیان نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو کی طرح فارسی میں بھی مشق سخن کی ہے، ساحل صاحب نے ہر صنف کلام میں بیان کے شاعرانہ کمالات و خصوصیات اس طرح واضح کیے ہیں جن سے خود ان کے اچھے شعری و ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے، بیان چاہے ذکی کے معاصرین کے ہم پایہ نہ رہے ہوں تاہم قابل توجہ ضرور تھے، ساحل صاحب کی اسعد روانی [illegible]

سفینۂ غزل از جناب عروج زیدی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت پندرہ ۱۵ روپیے پتہ نیشنل اکاڈمی انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ و عرفان زیدی معرفت سیف الدین خان رام پور۔

جناب عروج زیدی ایک پختہ مشق شاعر ہیں، ان کے قطعات کے مجموعہ کا ان صفحات میں پہلے ذکر آچکا ہے، یہ غزلوں کا مجموعہ ہے، عروج صاحب احسن مارہروی مرحوم کے واسطے سے حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہیں، اس لیے زبان کی سلاست و سادگی، اور بیان کی صفائی و روانی انکا طرۂ امتیاز ہے، انھوں نے غزل کو صرف معاملات حسن و عشق ہی کا ترجمان نہیں بنایا ہے، بلکہ وہ زندگی کے موجودہ نشیب و فراز اور عہد حاضر کے مسائل و معاملات کا ذکر بھی کرتے ہیں، مگر چونکہ ان کو غزل کی روایت سے واقفیت ہے، اور وہ تغزل کے پوری طرح مزاج شناس ہیں، اس لئے اس کا رچاؤ اور اس کی رنگینی و لطافت ہر موقع پر برقرار رہتی ہے، جدت اور تجربہ پسندی کے شوق میں اردو غزل جس ناہموری اور عدم توازن کا شکار ہو رہی ہے، عروج صاحب کی شاعری اس سے محفوظ ہے، ان کی اصل خوبی ان کا معتدل و متوازن انداز سخن ہے، زبان و بیان کی طرح ان کے فکر و خیال میں بھی بلندی اور پاکیزگی ہے، امید ہے کہ سفینۂ غزل کو ارباب ذوق میں مقبولیت حاصل ہوگی۔

حدیث حیات مرتبہ جناب رئیس نعمانی صاحب تقطیع خورد کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی صفحات ۵۰ قیمت دو روپیے ۵۰ پیسے شایع کردہ مکان ۱/۱۹۱ اصطبل چارباغ، لکھنؤ،

جناب رئیس نعمانی نے فارسی زبان کی ترویج کے لیے طرحی تحریری مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا ہے اور ان میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعام دینے کا فیصلہ کیا

کیا ہے، جو مقابلہ میں سب سے بہتر غزل کہنے والے کو دیا جائے گا، اس کتابچہ میں ان حضرات کی غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں، جو مقابلہ کی شرطوں کے مطابق اور اس طرح آل راکہ گرمیٔ ایماں حیات نیست" میں کہی گئی تھیں، اس انتخاب میں یو۔پی، بہار، بمبئی، حیدرآباد، دہلی اور پنجاب کے اہل سخن و اصحاب ذوق کا کلام شامل ہے، چند ہندو اور خواتین شعرا بھی اس بزم سخن میں شریک ہیں، فارسی شعر و سخن کا مذاق عام کرنے کی یہ کوشش لائق تحسین ہے،

رنگ برنگے پھول مرتبین جناب شبا حسین و ننھ کش، صاحبان تقطیع کلاں، کاغذ کتابت

بچوں کی نظمیں) و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ مجلد، قیمت درج نہیں، پبلیکیشنز ڈویژن

پٹیالہ [illegible] دہلی

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر مختلف زبانوں میں ان کے لیے کتابیں بھی شائع کی گئی تھیں، پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے اس موقع پر بچوں کے لیے رنگ برنگ اردو نظموں کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، اردو کے بعض اہل قلم اور شاعر صرف بچوں ہی کے لیے نظمیں اور کتابیں لکھتے ہیں جیسے اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر وغیرہ اس مجموعہ میں ان کے علاوہ نظیر اکبرآبادی، پنڈت دیاشنکر نسیم، حالی، چکبست، اقبال، تلوک چند محروم، عرش ملسیانی اور بہت سے موجودہ شعرا کی نظمیں اکٹھا کی گئی ہے، مجموعہ کی ابتدا حمد و مناجات کی نظموں سے ہوئی ہے، پھر ہندوستان کی عظمت، پہاڑوں، دریاؤں، موسموں، قدرتی مناظر، جانوروں، پرندوں، ہندو مسلم تہواروں اور بعض نئی ایجادات پر نظمیں ہیں، بعض نظمیں اخلاقی بھی ہیں، امید ہے بچے نظموں کے اس دلچسپ اور سبق آموز مجموعہ کو شوق سے پڑھیں گے

"ض"

جلد ۱۲۸ ماہ ۔۔۔ نمبر ۳ ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

مجلس ادارت

جلد ۱۲۸ ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۳

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

انگریزی زبان کے مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شا ڈرامائی انداز میں بیان ہوے کر ساری دنیا کو چونکا دیتے تھے،

اُن ہی کا بیان ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب پورا یورپ مشرف بہ اسلام ہو جائے گا،

یہ بیان عجیب و غریب ضرور ہے مگر عیسائی مدبرین، مبلغین اور مستشرقین کو غیر شعوری طور پر احساس ہے کہ اسلام میں جو قدرتی نفوذ کی قوت ہے اس بنا پر کہیں یہ واقعی ہر جگہ چھا نہ جائے، اس لئے وہ کبھی مسلمانوں کے خلاف جنگی محاذ آرائی کرتے ہیں کبھی مذہبی علمی اور تحقیقی تحریریں لکھ کر اسلام کے خلاف زہر پھیلاتے ہیں، اُن کے یہاں خوشی منائی گئی کہ انھوں نے صقلیہ اور اندلس کے مسلمانوں کو یورپ سے جلا وطن کیا، وہ اس لئے بھی مسرور ہیں کہ دولت عثمانیہ کی جلالت و عظمت کو اپنے حیلۂ افرنگی سے ختم کر ڈالا، ان کو اس سے بھی تسکین ہوئی کہ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت، پھر ایران، مشرق وسطیٰ اور مصر کی حکومتوں کو برباد کرکے وہاں کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنالیا، گو وہ اب پھر سے آزاد ہو چکے ہیں، ان تدبیروں کے باوجود اُن کو یہ بھی احساس ہے کہ اسلام دنیا میں جس طرح بڑھتا گیا، اس کو وہ روک نہ سکے، عیسائیوں کی آبادی اگر نو سو پچاس ملین ہے تو مسلمان دنیا میں سات سو پچاس ملین ہیں، گو عیسائیت ساڑھے چھ سو برس اسلام سے پرانی ہے، مسلمانوں کی آبادی عیسائیوں سے کم ضرور ہے مگر خود اُن کا اعتراف ہے، کہ اسلام عیسائیت کی طرح ایک فرقہ کے اندر محض ایک چرچ نہیں بلکہ یہ ایک ایسی کمیونٹی ہے جو مذہب سے منسلک ہے اور یہی اس کی مخصوص قوت ہے،

عیسائی مبلغین کی با ضابطہ متمول تنظیمیں ہیں، جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں، مسلمانوں کی ایسی تنظیمیں نہیں ہیں، پھر بھی دنیا کے ہر گوشہ سے غیر مسلموں کے مشرف باسلام ہونے کی خبریں برابر ملتی رہتی ہیں، اس صدی میں سائنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ امریکہ کے خلا باز چاند کی سطح پر اترے، مگر مذہب کی تاریخ میں بھی یہ ایک عظیم واقعہ ہے، کہ اس کے ایک خلا باز جیمس ایروِن نے چاند کی سطح پر سے اس دنیا

کو یہ کائنات کے ایک معمولی مادہ کے سوا کچھ نظر نہیں آئی جس کے بعد اس کو اللہ کا
ا، اسی کے ساتھ اس کو اتفاق ہوا کہ اللہ کا آخری پیام اسلام ہی قبول کرنے کے لائق ہے
ی پا تا، تو اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، اس کا یہ اعلان کسی تلوار کے ذریعہ سے عمل میں والر
یں ہوا،

کے خلاف عیسائی مبلغین اور مستشرقین ہر قسم کی زہر چکانی اور ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں، مگر
نے کے بجائے ابھر کر سامنے آہی جاتی ہے گبن نے اپنی مشہور تاریخ ہسٹری آف دی ڈیکلائن
ت دی رومن امپائر میں لکھا تھا، کہ افریقہ اور ایشیا کے لاکھوں انسان مومن عربوں کی
ی دباؤ کے بغیر شامل ہوتے رہے، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف اپنی رغبت سے مائل
ہ پڑھ لیتے، ختنہ کرا لیتے تو چاہے قیدی ہوں یا غلام یا مجرم، وہ یہ محسوس کرنے لگتے کہ وہ
تح مسلمانوں کے برابر ہو گئے ہیں، اب وہ گنہگار نہیں سمجھے جائیں گے، وہ اپنی اندرونی صلاحیت
بیدار پانے لگے، اسی طرح عرب کے پیغمبرؐ نے جو روحانی اور دنیاوی تعلیمات دیں، ان کی طرف
کو ترغیب ہونے لگی، نو مسلموں کو عرب کے پیغمبرؐ کے الہامات کی سچائی اور پاکیزگی پر یقین ہونے لگا
ن الہامات کو انسانی عقل اور ربانی تخیل کے مطابق سمجھنے لگے، اسلام کا پیام زرتشتیوں کے
وہ خالص اور موسیٰؑ کے افکار سے زیادہ فیاض تھا، ان میں وہ متضاد باتیں بھی نہ تھیں جن
کے ذریعہ سے ساتویں صدی میں دی جا رہی تھی، (جلد سوم ص ۵۹)

۔ جی۔ ویلس نے اپنی کتاب دی آوٹ لائنز آف ہسٹری میں اسلام اور رسول اللہ
یہ وسلم پر بہت کچھ لکھا ہے، اس کا قلم رسول اللہؐ کی شان میں بہت گستاخ ضرور
لیکن وہ اس کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں بہت سی
نہ تعلیمات ہیں، جب اس کی تبلیغ شروع ہوئی تو معاشرہ میں ظلم وستم کا دور دورہ تھا

جس سے سوسائٹی دب کر رہ گئی تھی، اسلام نے ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کیا جس سے معاشرتی ستم آرائی ختم ہو گئی، اسلام کے معاشرہ میں لطف، صبر اور محبت ہے یہی ایک تنہا خصوصیت نہیں، بلکہ قرآن کے ذریعہ سے اس نے توحید کا جو تخیل پیش کیا، وہ یہودیوں سے بالکل مختلف تھا، عیسائیت نے اس تخیل کو اتنا گنجلک بنا دیا ہے کہ اس سے نہ صرف تفرقہ پیدا ہوتا گیا، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی اسپرٹ ہی جاتی رہی، اسلام میں عبادت کرنے کا جو نظام ہے، وہ بھی اس کی قوت ہے، پھر اس میں کہ کو جو اہمیت دی گئی ہے، اس سے بھی اس کی شان میں اضافہ ہوا، یہ نیا مذہب وہی ہے جو حضرت عیسیٰ کی زندگی میں عیسائیت یا گوتم بدھ کی زندگی میں بودھسزم میں تھا، اسلام میں بڑے بڑے علما، فضلا، اساتذہ اور مبلغین ہوئے لیکن ان میں پادری نہیں ہوئے،

ایچ جی۔ ویلس کی اس تحریر میں یہ بھی ہے کہ اسلام میں لطف و کرم، فیاضی اور اخوت کی تعلیم بھری ہوئی ہے، یہ بہت ہی سادہ اور قابل فہم مذہب ہے، اس کو معمولی آدمی بھی آسانی سے سمجھ لیتا ہے، یہودیت کے یہاں خدا عجیب غریب چیز بن گیا ہے، عیسائیت میں تثلیث، عقائد اور کفر کی اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اُن کے اور چھور کا پتہ نہیں چلتا، مگر دکیت کا اعلیٰ تخیل مانی کو دار پر چڑھانے میں ختم ہو گیا، دنیا جب غیر یقینی حالت میں تھی، مکاری عام تھی، تفرقہ پھیلا ہوا تھا، اخوت کا فقدان تھا، بہشت راہبوں، پادریوں اور اُن کے ہمنوا حکمرانوں کے لئے مخصوص تھی تو محمدؐ نے ایسی تعلیم دی جو لوگوں کے دلوں میں اتر گئی،

ایچ۔ جی۔ ویلس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام پھیلتا گیا، یونان چوائنگ تک پہونچا، افریقہ تک گیا، اس کے سیلاب میں ایرانی، رومی، یہودی، اور مصری تمدن بہہ گیا، اس کو اس لئے فروغ ہوا کہ اس کے ذریعہ سے اس زمانہ کے لئے بہترین معاشرتی، اور سیاسی نظام پیش کیا گیا، یہ اس لئے بھی پھیلا کہ لوگ سیاسی حیثیت سے مظلوم تھے، ان کا استحصال ہو رہا تھا، اُن کے اوپر

ن حکومت قائم تھی، اسلام میں وسیع النظری تھی، اس کی تعلیمات میں تازگی تھی، پاکیزگی تھی،
ے سیاسی نظریوں میں نیاپن تھا، اس زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی نظام کے مقابلہ میں اسکا
ہر طرح بہتر تھا، اس لئے رومن امپائر کے سرمایہ دارانہ نظام اور یورپ کی معاشرتی روایات
ے سے بڑی ضرب کاری لگی، ایچ۔ جی۔ ویلس یہ بھی لکھتا ہے کہ مسلمانوں میں زوال اس وقت
ع ہوا، جب انھوں نے اپنے اس اخلاص کو زائل کر دیا، جس سے انسانیت متاثر ہوئی
ء، (ص ۵۷۹، ۵۸۱-۵۸۹ سنہ ۱۹۲۹ء اڈیشن)

اس کا یہ لکھنا صحیح ہے، چنانچہ خود مسلمان اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ بن گئے حضرت
ید بسطامیؒ کے زمانے میں ایک یہودی ان کا بہت معتقد ہو گیا جب مسلمانوں نے اس سے کہا
ہ اسلام قبول کر لے، تو اس نے جواب دیا کہ اگر مسلمانی وہی ہے، جس پر بایزید عمل کرتے
تو وہ بہت اونچی چیز ہے، میں اس پر عمل نہیں کر سکتا، اور اگر مسلمانی وہ ہے، جس پر
ل کرتے ہو تو اس سے مجھ کو شرم آتی ہے، اسی طرح ایک امریکن کی یہ بات مشہور ہے کہ
ب وہ اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ فوراً مسلمان ہو جائے، لیکن
ب وہ مسلمانوں کی زندگی کو دیکھتا ہے تو پھر اسلام کے قبول کرنے سے باز رہتا ہے،

حضرت عمر فاروق اعظمؓ جب بیت المقدس میں داخل ہوئے تو اُن کی سادگی خشیت الٰہی
ن پروری اور انسان دوستی دیکھ کر وہاں کے عیسائی متاثر ہو کر بول اٹھے کہ مسلمان عیش
شرت کے لئے جد و جہد نہیں کرتے، بلکہ نوع انسان کو سنوارنے اور صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے کے
نگوشاں ہیں، حضرت عمرؓ نے اپنے ارشاد اور احتساب سے اپنے والیوں، فوجی سرداروں
ر لشکریوں کو پاکیزہ نفسی اسدقلی، اور دیانت داری کی اسلامی تعلیم دے کر اُن کو اسلام کی ایسی
ت تصویر بنا دی تھی کہ ان کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام کی طرف خود بخود جھکتے تھے، اسی لئے اُن کے زمانے

میں جتنے علاقے فتح ہوئے، وہاں کے باشندے بطیب خاطر سب کے سب مسلمان ہو گئے،

موجودہ دور کی انسانیت اسی کرب واذیت میں مبتلا ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں تھی، اس کی نظر خدا کے آخری پیام انسانیت کی طرف اٹھ رہی ہے، اگر مسلمان زبان، دل اور عمل کی سچائی، دیانت داری، عدل پروری، اخوت، عفو و درگزر، انسان دوستی، حلم، بردباری، رفق، لطف، خوش کلامی، میانہ روی، خودداری، خودشناسی، حق گوئی اور بے باکی کی اسی تعلیم پر عمل کرنے لگیں، جو اسلام نے دی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ دکھ بھری انسانیت اسلام کو دنیا کے لئے صحیح معنوں میں رحمت اور برکت سمجھنے کے لئے مجبور نہ ہو، مسلمانوں کو ہر وقت اپنے عمل اور زبان حال سے یہ کہنا ہے:-

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب

یگانہ اور مثال زمانہ گوناگوں
نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بے زاری

نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی

یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

مقالات

حکیم سنائی کے قصائد اور اسلامی افکار و عقائد

از

پروفیسر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فارسی شاعروں میں حکیم سنائی غزنوی کو بعض حیثیتوں سے تقریباً سبھوں پر تفوق حاصل ہے، وہ بڑی اہم سیرت شخصیت کے مالک تھے، وہ نہایت بے باکی اور جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے بادشاہ وقت ہوں یا وزیر مملکت، سب کے سامنے حق کا اظہار بے جھجک کرتے، علمار کی سخت گیری سے نالاں ہوئے تو بہرام شاہ غزنوی کے نام خط لکھا، اس میں اپنے نقطۂ نظر کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے، خط کے آخری جملے یہ ہیں:

از سید کائنات محمد مصطفےٰ صلوات اللہ علیہ اخبار صحیح مروی است و سلف صالحین معتقد اند و مناقب آل رسول صلوات اللہ علیہ و مثالب آل سفیان اگر دروغ است و کافۂ الناس نہ برین ہستند عقلاً دانند کہ ضمیر است و کلمۂ حق است، لاکلام فیہ۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے، اور سلف صالحین اسی کے تبع رہے، اگر آل رسول صلوات اللہ علیہ کی تعریف و توصیف اور آل سفیان کی برائیاں غلط ہیں اور عامۃ الناس کا یہ دستور نہیں تو نہ ہو، دانشمند جانتے ہیں کہ بات درست ہے، یہی کلمۂ حق ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں۔

بد خدایا آراستہ گرداں عالم را با عالمانی
کہ از تو بترسند یا از خلق شرم دارند و مارا ابتلائے
صحبت بیگانگاں کوئے تربت گرداں و سلطان
عصر را توفیق دہ کہ مفسداں را انواختہ
دارد کہ در نواختن ایشاں ہلاکت دین است
و توفیق دہ تا مصلحان و حلال خوارگان را
نیکو دارد کہ در نیکو داشت مصلحاں نظام
دین و دولت است و بقائے مملکت
(مکاتیب سنائی طبع ۱۹۶۲
ص ۱۲۰ - ۱۲۱)

بار خدایا! عالم کو ایسے عالموں سے آراستہ
کر جو تجھ سے ڈرتے یا مخلوق سے شرم رکھتے ہیں،
اور ہمیں کوچۂ علم و عرفان سے بیگانہ لوگوں کی
صحبت سے محفوظ رکھ، اور بادشاہ وقت کو توفیق
دے کہ وہ مفسدوں کو نہ نوازے، اس لیے کہ
ان کی نوازش میں دین کی ہلاکت ہے، اور اسے
ایسی توفیق عنایت کرے کہ وہ نیک اور پاکیزہ
لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس لیے کہ
ان کے ساتھ خوش سلوکی نظام دین و دولت
اور بقائے مملکت کا ضامن ہے۔

ابوالقاسم درگزینی سلطان سنجر کا وزیر تھا، اس نے حکیم سنائی کو اپنے دربار میں مدعو کیا، لیکن وہ وزیر کی سخت گیری سے بیزار تھے، انھوں نے دعوت نامہ رد کر دیا، اس سلسلہ میں ان کے دو[1] خط اور دو[2] قطعے موجود ہیں، جو ایک طرف ادبی شاہکار ہیں، اور دوسری طرف حق گوئی اور بے باکی کے ایسے نمونے ہیں جن کی مثال آج کے دور جمہوری میں بھی نہیں ملتی، نمونے کے لیے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں:

الحمد بہ بزرگی کہ زد بفضل الکبیر یا آں بزرگ
دین و دنیا کردہ و روا است کہ گوشہ دل ایں
گوشہ گرفتہ را بتقاضا آسایش خود خراب نہ کند
کہ جسم حقیر ایں بندہ نہ سزائے چشم تر یہ آں
خداوند است و اینجے چند بہائے ایں بیچ

آپ کی اس بزرگی کا واسطہ جو خدائے بزرگ
و برتر کی طرف سے عنایت ہوئی ہے، کہ اس
گوشہ گیر کے سکون دل کو اپنے یہاں کے آرام و
آسایش کی دعوت سے برباد نہ کریں، اس لیے
کہ میرا حقیر جسم آپ کی آسودہ چشمی کی تاب نہیں

ارشاد و انشا کرد :

ای چو عقل از کل موجودات فرد
وی جہان از تو سپہر سال خورد
خاک بوسان سر کوی تو اند
روشنان کارگاہ لاجورد
پاسبانان در و بام تو اند
چرخ و خورشید و مہ گیتی نورد
تا سنائی کیست کاید بر درت
چہ کو؟ تا گویدش از راہ برد
گر تن و جانم بخدمت نامدند
عذرشان بپذیر کت سرکش نبرد
صدر تو چرخ است و تن را بال نیست
روی تو مہر است و جان را چشم درد
جان من آزاد کن تا عقل من
ہر زمانت گوید: زہ ای آزاد مرد

لکھا، چند ابیات فی البدیہہ نظم ہو گئے ہیں :

اے وزیر! تو عقل کی طرح سارے عالم میں
ممتاز و منفرد ہے، تیری وجہ سے سپہر پیر سال جوان
ہو گیا ہے، سارے ستارے اور سیارے
آپ کے آستان کے خاک بوس ہیں، اور آسمان
سورج، چاند جس کے در کے پاسبان ہوں اس کے
دربار میں سنائی کے آنے کا کیا موقع، اگر سنائی
جان و تن سے حاضر دربار نہ ہو سکا تو اس کا
عذر قبول کر، اس میں حیلہ و حجت کی کوئی بات
نہیں، تیری بارگاہ آسمان کی طرح بلند ہے،
اور میرے بازو کمزور ہیں، تیرا چہرہ آفتاب کی
مانند درخشاں اور میری جان کو گویا آشوب چشم
ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے، اس کے لیے
میں تیرا ثنا خواں رہوں گا۔

(مکاتیب سنائی ص ۱۰۴)

سنائی کی سیرت کا اہم پہلو ان کے کلام میں پوری طرح نمایاں ہے، ان کے کلام کا دوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اور جس زمانہ میں اسلامی فکر کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے اس کی مثال غزنوی دور میں مفقود ہے، دین کو ان کی فکر میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا، اسلام کا جیسا [illegible] تھا، اس کے لیے ان کے رقعات سے دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں :

اگر چگونہ بہ بدعت تن کس را نسبت کنند کہ اگر در پیکر حروف نظمش در نگرید جان سنت آنجا بینید، و اگر از نقش نقش نثرش بجوئید توحید و تجرید آنجا یابید (مکاتیب ص ۶۲)	تو پھر ایسے شخص پر بدعت کا الزام کیسے لگ سکتا ہے کہ اگر اس کے منظومات کے حروف کے پیکر میں دیکھیں تو جانِ سنت وہاں دیکھیں اور اگر اس کے نثر کے نقوش کا مطالعہ کریں تو توحید و تجرید وہاں پائیں۔
در مزرعۂ دین ہر تخم کہ اندازی برومند است و در شاہراہ شرع اگرچہ گامی است سودمند است۔ (مکاتیب ص ۹۶)	دین کے کھیت میں جو تخم بویا جائے گا اس میں پھل آئے گا اور شرع کی شاہراہ میں جو قدم اٹھایا جائے گا سودمند ہوگا۔

سنائی کی مثنویات کے تمام تر موضوعات دینی، اخلاقی اور عارفانہ ہیں، ان کی شہرۂ آفاق مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ ہے، اس مثنوی کو تصوف کی دنیا میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں، سنائی کے تصوف کی بنیاد دین پر ہے، اس کا ثبوت حدیقہ کے موضوعات اور فہرست عناوین سے بخوبی فراہم ہوتا ہے، فارسی میں تصوف و اخلاق کے لیے عام طور پر صنف مثنوی مخصوص تھی، چنانچہ فارسی مثنویات کا وافر حصہ تصوف و اخلاق سے گہرا ربط رکھتا ہے، لیکن سنائی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے دینی و اخلاقی و عرفانی مطالب کے لیے صنف قصیدہ سے بھی کام لیا، انھوں نے قصائد میں دلچسپ مضامین کے دریا بہائے ہیں، حکیم کے اکثر قصائد بلاشبہہ دینی و عرفانی خیالات کے قابل یادگار نمونے ہیں، جن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدہ نگاری محض لغو خیالات کا مجموعہ اور بیکاری کا مشغلہ ہی نہ تھا، اس کے ذریعہ مفید کام انجام پا چکے ہیں۔

سنائی کے متعدد قصیدے اخلاقی و عرفانی رنگ میں ہیں، عام اخلاقی قصائد کے علاوہ ان کے مخاطب علماء، مشائخ، صدور و قضاۃ ہیں، ان کی نسبت سے دینی اور علمی خوامض کا اظہار ان مدحیہ قصائد میں ہوا ہے، ان میں بادشاہوں اور امراء کا ذکر بہت کم ہے، چند ہی بادشاہوں اور امیروں کے

مائدان کے دیوان میں پائے جاتے ہیں اور ان میں بھی مبالغہ اور لفاظی کے بجائے اخلاق
کے موضوعات پر اظہارِ خیال ہوا ہے، اور ان کے کلام میں اس قسم کے منظومات کی کثرت
ے ان کے قصائد کی ایک نوع "الزہدیات" قرار پائی ہے، جو دیوان کے بعض قدیم نسخوں میں
ے، اور اس نوع کے ذیل میں سارے اخلاقی و دینی رنگ کے قصیدے جمع ہو گئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عرفانی و اخلاقی قصائد کے لحاظ سے فارسی شاعروں میں سنائی
یں اور بجز دو شاعروں یعنی ناصر خسرو اور سعدی کے کسی اور کا نام ان کے ساتھ نہیں لیا جا سکتا،
کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ناصر خسرو ایک اسماعیلی مبلغ و داعی ہے، اس کے یہاں اخلاقی موضوعات
رفان اور تصوف سے اس کا تعلق نہ تھا، سعدی کے اخلاق پر سنائی کی طرح دینی اور فکری رنگ
تھا، گویا ان دونوں شاعروں سے بھی سنائی منفرد ہیں۔

حکیم سنائی نے قصیدوں میں دین کو جس طرح پیش کیا ہے، اس سے ان کا شمار بڑے درجے کے
فکرین میں ہونا چاہیے، ان کی اسلامی فکر کی حیثیت محض نظری نہ تھی، ان کی شاعری میں بڑا
ہے، چونکہ ان کے مخاطب عوام و خواص سبھی قسم کے لوگ تھے، اس لیے ان کے یہاں تعریف،
اور اعتراض سب کچھ ملتا ہے، انھوں نے اسلامی معاشرے پر، جو دین کی گرفت سے آزاد ہو رہا
تنقید کی ہے، انھوں نے کرب و درد کے ساتھ بار بار یہ تذکرہ کیا ہے کہ معاشرہ علم و عمل سے
ہا ہے، اخلاقی کمزوری ہر طبقے کے لوگوں میں تیزی سے راہ پا رہی تھی، اظہارِ حق میں کوئی جھجک
ہیں کرتے، اس لیے سوسائٹی کے ہر طبقے کے افراد کی خوبیوں اور خامیوں کی پوری تنقیح کی ہے، اسبا
کے ذکر کے ساتھ خرابیوں کے دور کرنے کی صورتوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں، وہ
کے بڑے مخالفین میں تھے، ظاہرداری ان کے نزدیک زبردست اخلاقی فساد کا نتیجہ
ہا، کے بگاڑ کو وہ دین کا بگاڑ سمجھتے تھے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے دور میں جن معاشرتی

و اخلاقی کوتاہیوں کا ذکر ملتا ہے، وہ آج کی بات معلوم ہوتی ہے اور واقعی بات ہے کہ آج سے نو سو سال قبل دینی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ جس طرح بگڑ چکا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان نو سو برسوں میں بگاڑ کی رفتار بہت تیز نہ تھی ورنہ اب تک سوسائٹی دینی اور اخلاقی لحاظ سے انسانیت کی منزل سے گذر گئی ہوتی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سنائی کی شاعری کا یہ عملی پہلو اگرچہ قصائد میں بہت نمایاں ہے، مگر ان کی شاعری کے دیگر اصناف میں بھی یہ رخ پوری طرح روشن ہے، اور ان کی نثری تحریریں جو خطوط کی شکل میں باقی ہے، ان کی سیرت کے اس پہلو کی سب سے بڑی آئینہ دار ہے۔

دین کو انسانی زندگی میں سب سے اہم مقام حاصل ہے، مگر اس دور کے معاشرہ میں اسے جس مقام کا حامل ہونا چاہیے وہ نہیں، اس کا انھیں سخت ملال تھا۔ شاید ہی کوئی قصیدہ ہو جس میں اس کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے نہ آگیا ہو، اس سلسلہ کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک قصیدہ کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں، واضح ہو کہ سارے قصیدے کا شروع سے آخر تک ایک ہی انداز ہے، اس میں کوئی شعر مدحیہ نہیں:

عالمے پر لشکر دیو است و سلطانِ تو دیں　　زآن سلطان باغی و منددیش از بروت لشکری
دینِ حسینی قست آزو آز دو خوک سگ است　　کشتہ ایں را می کشی و آں ہر دو را می پروری
بر یزید و شمر ملعوں چوں ہمیں لعنت کنی　　چوں حسینِ خویش را شمر و یزید دیگری
گر د جعفر گرد گر دیں جعفری جوئی ہمی　　زانکہ نہ بود ہر دو ہم دیار و ہم دیں جعفری
چوں تو داوی دیں بدنیا در رہِ دیں کے کنند　　پنج حس و ہفت اعضاء مر ترا فرماں بری
اختر نیکوت باید بہ سپہر دیں برائے　　زانکہ اندر دور او طالع بود نیک اختری
چوں تو "لا" ما کہتری کر دی پس از دیوان لعر　　جز تو زالا اللہ کہ خواہد یا فت امر مہتری

درخیبر بجز حیدر نه کند از بعد آں　　دین را که داند کرد جز حیدر دری
دین و ملک و دولت پایدارنی روشنا　　که ره بر خوک و خر دارد بقصد قیصری
ده صد ہزار ابلیس آدم روئے ہست　　تا ہر آدم روئے را از نہاد آدم نسشمری
را از خضر نشناسی ہمی در تیه جہل　　زاں ہمی از رہبراں جوئی ہمیشه رہبری
ے از طبع و نفس و عقل ابراہیم وار　　تا بدانی نقشہائے ایزدی از آزری
چشم راست بیں ہرگز نخیز مو کبر بر شرک　　شرک مرد از احولی داں کبر مرد از اعوری
را الله اکبر گفتنی تا با خودی　　بندۂ کبری نه بندہ پادشاہ اکبری
پ دیں بردں از گنبد نیلوفری است　　پس بر آر از داد و دانش بوکز دیں بروں پری

(دیوان تصحیح مدرس رضوی چاپ ابن سینا ص ۶۵۴ بعد)

ایک دوسرے قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بینی جز ہوا آں دین بود بر جاں نشاں　　ہر چہ یابی جز خدا آں بت بود در ہم شکن
از از گلشن تحقیق تا در کوے دیں　　کشتگانِ زندہ بینی انجمن در انجمن
یں خود بو العجب در دیست کا بدرو چون شمع　　چوں سوئے بیار خوشتر گردی از گردن زدن
نه ماو من در عالم سلامت دسبس　　چوں ازیں عالم بروں رفتی نه ما ماند نه من
تا پردہ بینی یک جہاں پر شاہ و بت　　چوں در دو بی پردہ رفتی ایں دہے گشت آں شمن
از دیں ساز تا باقی بمانی بہر آنکہ　　گر بریں پوشش نمیری ہم تو گوری ہم کفن
بلہ درد و توحید نتواں رفت راست　　یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

(دیوان، ص ۴۸۵)

ایک تیسرے قصیدے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں جن سے دین کی اہمیت اند خود دین کے

انقلابی تصور سے کما حقہٗ آگاہی ہوتی ہے:

زماہ دیں تواں آمد بصحرائے نیاز ارنی ‌ ‌ ‌ ‌ بمعنی کے رسد مردم گذر ناکردہ بر اسما

درون جوہر صفرا ہمہ کفرات و شیطانی ‌ ‌ ‌ ‌ گرت سودائے دیں باشد قدم بیروں نہ از صفرا

چہ مانی بہر مرداری چو زاغاں اندریں پستی ‌ ‌ ‌ ‌ قفس بشکن چو طاؤساں یکے بر پر بریں بالا

عروس حضرت قرآں نقاب آنگہ براندازد ‌ ‌ ‌ ‌ کہ دار الملک ایماں را مجرد بیند از غوغا

عجب نبود گر از قرآں نصیبی نیست جز نقشے ‌ ‌ ‌ ‌ کہ از خورشید جز گرمی نہ بیند چشم نابینا

اگر دینت ہمی باید ز دنیا دار دل یکسل ‌ ‌ ‌ ‌ کہ حرصش با تو ہر ساعت بود بے جمعیتے آوا

ہمی گوید کہ دنیا را بدیں از دیو بخریدم ‌ ‌ ‌ ‌ اگر دنیا ہمی خواہی بدہ دیں و ببر دنیا

ز باد فقہ و باد فقر دیں را ہیچ نکشاید ‌ ‌ ‌ ‌ میاں در بند کاری را کہ ایں زنگست و آں آوا

چہ علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب ‌ ‌ ‌ ‌ چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا

ازیں مشتی ریاست جوئے رعنا ہیچ نکشاید ‌ ‌ ‌ ‌ مسلمانی ز سلماں جوئے و درد دیں ز بو دردا

وگر نز بہر دینستی حد اند بند دی گردوں ‌ ‌ ‌ ‌ وگر نز بہر شرعستی کمر بکشاید ی جوزا

چوں تن جاں سخت کو علم دیں کز تست آید ‌ ‌ ‌ ‌ درون سو شاعریاں و بیروں سو کوشک و دنیا

ترا ایزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ ‌ ‌ ‌ ‌ ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا

ز بہر دیں بگذاری حرام از حرمت یزداں ‌ ‌ ‌ ‌ ولیک از بہر حق تعالیٰ حلال از گفتۂ ترسا

(دیوان ص ۱۱ و بعد)

اس قبیل کے اشعار سے جو سنائی کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں واضح ہے کہ دین انسانی زندگی کا سب سے زیادہ موثر عامل ہے، ان کے یہاں دین کا ایک وسیع تصور ملتا ہے [illegible] حرکی عنصر ہے، لیکن ان کا یہ انقلابی تصور عام نہیں ہو سکا ہے اس لیے کہ سنائی کے افکار [illegible]

لکھا گیا ہے اگر ان کے کلام بالخصوص قصائد کا صحیح طور پر مطالعہ ہوا ہوتا تو وہ اقبال کے محبوب ترین شاعر
تے، اس لیے کہ ہمیں ان دونوں شاعروں کے یہاں بڑی فکری مماثلت ملتی ہے۔

حکیم سنائی یونانی فلسفے کے مخالفین میں تھے اور اس کو توحید اسلامی کی راہ میں رکاوٹ خیال
تھے، ان کے زمانہ میں مسلمانوں میں فلسفہ رواج پا رہا تھا اور ایک گروہ دانشمندوں میں ایسا
س کی حمایت میں کوشاں تھا، حکیم سنائی اس گروہ سے نبرد آزما رہے ہیں، دہریت بھی پھیل رہی تھی
ں کی مخالفت میں بڑا زور صرف کر رہے تھے، چنانچہ ایک پورا طویل منظومہ اسی موضوع پر سپرد قلم
، یونانی فلسفے کے رد میں کافی اشعار پائے جاتے ہیں، ذیل میں دو قصیدوں سے چند اشعار پیش
تے ہیں، ان سے سنائی کے موقف کی پوری نشاندہی ہو جائے گی:

چنبر اسلام برده سر بیرون ‌‌ ز سنت کرده دل خالی ز بدعت کرده سر گون
داره شیطانی شده بر نفس تو سلطان ‌‌ تنت را جهل پیرایه دلت را کفر پیرامون
عتقادی من مشکی تا بطلسم آرم ‌‌ علی رغم تو در توحید فصلی گوش دار اکنون
س که عالم را طبائع مایه پندار ی ‌‌ نهی علت هیولیٰ را که آن ایدون و این ایدون
چیست اقدر است فاعل وین بداں ماند ‌‌ که در نج بابد گاو است که آمد ناله از گردون
ید و من خواهم ز سر بیضهٔ مرغی ‌‌ چه گفت است اندر معنی تا تلقین کن افلاطون
و زرده و بیتیم و آب اندر یکے بیضه ‌‌ و زاں یک بیضه چندیں گونه مرغ آید همی بیرون
ز چه معنی گشت پر زاغ چون قطران ‌‌ ز بهر چه دم طاؤس رنگیں شد چو بو قلمون
ند ما آخر چه علت بود در خلقت ‌‌ چه اشد آنچنان شنوم و چون تند چنیں میمون
ن یکے در خلقت شاہیں و در عقابی ‌‌ نگوئی کز چه معنی راست آں سقطان آں ایں مستعطن
ماہیت بسیں پیشه در ہوا باز ان ‌‌ یکے چوں زورقی زریں رواں بر آب در جیحون

چه از یک زمین چندین نبات مختلف بینم — ز نخل و نار و سیب و بید چون آبی و چون زیتون
همیدون می خورند یک آب و در یک بوستان رویند — برنگ دیگر صبر و سنبل و مازو و مازریون
اگر علت طبایع شد وجود جمله را چون شد — یکی ممسک یکی مسهل یکی دارو یکی طاعون
همانا اینکه من گفتم طبایع کرد نتوانند — نه افلاطون، نه غیر او بزرق و حیلت و افسون
مگر بیچون خداوندی که اهل هر دو عالم را — بقدرت در وجود آورد بے آلت بکاف و نون
خداوندے کہ آدم را و فرزندان آدم را — پدید آورد از ماء معین و از گل مسنون
همیشه بود او بے ما همیشه باشد او بیشک — صفاتش همچو ذاتش حق ولیکن سر او مخزون
کہ پنہاں کرد جز ایزد بسنگ خاره در آتش — کہ در دیا نہی جزوی ز خاک تیرہ آذریون
صدف حیران بدریا در زدوات آهو بصحرا بر — رمیده وار میده برود در دریا و در ہامون

(دیوان ص ۵۳۶ بعد)

ایک اور قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مسلمانان مسلمانان مسلمانی مسلمانی — ازین آیین بی دینان پشیمانی پشیمانی
مسلمانی کنون اسمیست برعرفی و عادتی — دریغا کو مسلمانی، دریغا کو مسلمانی
فرو شد آفتاب دین برآمد روز بی دینان — کجا شد درد بودردا و آن اسلام سلمانی
جہان یکسر همه پر دیو و پر غول اند امت را — کہ یارد کرد جز اسلام و جز سنت نگهبانی
بمیرید از چنین حالی کز و کفر و هوا خیزد — از یرا در چنان جاها فرو ناید مسلمانی
شراب حکمت شرعی خورید اندر حریم دین — کہ محرومند ازین عشرت هوس گویان یونانی
مسازید از برای نام و دام و کام چون غولان — جمال نقش آدم را نقاب نفس شیطانی
شود روشن دل و جان تان ز شرع و سنت احمد — ازاں کز طلعت اولی توی شد جوہر مانی

ر دِ سخن پیشہ کہ بہر دامِ مشتی دون | زدینِ حق بماندستی بہ نیروے سخن دانی
تی دیدی از سنت کہ رفتی سوئے دونان | چہ تقصیر آمد از قرآن کہ گشتی گرد لامانی
ن طوقِ عقلانی بسوئے ذوقِ ایمان شو | چہ باشد حکمتِ یونان بہ پیشِ ذوقِ ایمانی

(دیوان ص ۶۷۸ - ۶۸۰)

ایک پورے قصیدے میں حضرت امام ابو حنیفہ کا ایک دہری سے مناظرہ نظم کیا ہے، قصیدہ
نایہ ہے: در بطلان حجت دہریان و برہان بر اثبات ذات خداوند سبحان فرماید
قصیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار خلیفہ کے دربار میں ایک دہری آیا، اس نے کہا کہ شریعت
بی فضول ہے، کھاؤ پیو، مزے اڑاؤ، دنیا خود قدیم ہے، اس کا کوئی خالق نہیں، مادہ اور ہیولیٰ بعد
مادہ ہے، امیر المومنین نے حضرت امام ابو حنیفہ کو طلب کیا، قاصد گیا اور صورت حال سے مطلع
رت ابو حنیفہ مغرب تک نہ آئے، دہری کو بہت غصہ آیا، اور کہنا شروع کیا کہ وہ مجھ سے مناظرہ
سکتے، ڈر کے مارے وہ نہیں آ رہے ہیں، اتنے میں امام صاحب رونما ہو گئے اور تاخیر سے
اس طرح توجیہ کی کہ دربار میں آنے کی غرض سے جب میں دجلہ کے کنارے پہونچا تو کشتی جا چکی تھی
ـ درخت تھا، اس کے تختے ہو گئے، پھر وہ مل گئے اور ایک کشتی بن گئی، آہنی حلقے خود بخود ظاہر
میں ٹھنک گئے، اور پھر کشتی کنارے آ گئی اور اس میں سوار ہو کر میں نے دجلہ پار کیا، اس بنا
سے پہونچا، دہری نے یہ باتیں سنیں اور بول اٹھا کہ اس سے بڑا جھوٹ اور کچھ نہیں ہو سکتا، امام
دیا کہ دہری کا عقیدہ ہے کہ عالم قدیم ہے، اس کا کوئی خالق نہیں، خود بخود ہیولیٰ سے وجود میں
ہے، اگر اس کا یہ قول صداقت پر مبنی ہے تو پھر درخت کا خود بخود تختہ بن جانا، تختوں کا خود بخود
حلقوں کا پیدا ہو کر کشتی میں ٹھنک جانا کیونکر ممکن نہیں ہو سکتا، اس کے بعد خداوند عالم کی
ت اور صنائع و بدائع کا ذکر کر کے خالقِ کائنات کے وجود پر ایک مدلل تقریر کی، دہری کے پاس

کوئی دلیل سوائے خاموشی کے نہ تھی، اور اپنی اس گستاخی کے نتیجے میں وہ سولی پر چڑھا دیا گیا۔

ذیل میں اس قصیدے کے چند اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے سنائیؒ کے احساسات کا اندازہ ہو سکے گا اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کو کس مرتبے کا امام سمجھتے تھے:

اے خردمند موحد پاک دین ہوشیار / از امام دین حق یک حجت از من گوش دار

آں امامے کو زحجت بیخ بدعت را بکند / نخلِ دین در بوستانِ علم زو آمد ببار

آنکہ در پیش صحابہ فضلِ او گفتہ رسولؐ / تا قیامت راد علمش کار خلقاں را قرار

شمع جنت خواند عمرؓ را نبی یکبار و بس / بوحنیفہ را چراغِ امتاں گفت او سہ بار

چوں پدید آمد بکوفہ بوحنیفہ تاج دیں / آنکہ شد از علم او دینِ محمدؐ آشکار

گفت گر در امتم ہفتاد و سہ فرقت بہم / ہست یک زاں اہل جنت را مرجع دیگر بنار

بوحنیفہ سرور آں قوم اہل جنت است / معدہ اہل ہوی از وے شود مقہور و خوار

معنی سرّ ار گفتن بوحنیفہ را چراغ / ماضی و مستقبل و حال از علومش در چہار

آنکہ در فت وانکہ آید وانکہ بیند روئے او / ہر سہ را از روشنائی ہر سہ را علمش حصار

دہریے آمد بنزدیک خلیفہ ناگہاں / بغض دینی مبغضی شوخی پلیدِ نابکار

ایں چہ بند است از شریعت برتنت گفتا بہ پیر / یا فتی پادشاہی خوش خور و بغم گذار

روزہ و عقد و نکاح و دور بودن از مراد / حج و غزو و عمرہ و ایں امرہائے بیشمار

خویشتن رنجہ چہ داری چوں بعالم ننگری / تا بدانی کایں قدیم است و ندارد کردگار

گفت رسم شرع و سنت جملہ تزویر و ریاست / سربسر گیتی قدیم است و ندارد کردگار

طبع و ترکیب و ہیولیٰ راشت سم اصل کون / ہر کجا ایں منکر آید عقل او زار و غبار

گفت امیرالمومنین کاے مرد پر دعوی باش / تا بایماں امامِ راستین فخر دیار

ت و زخجلت کہ اے نعمان چرا دیر آمدی … وادن جوابے پر معانی مرد و ار
ت حالی چوں شنیدم امر شہ برخاستم … رخ نہادم سوئے قصر و تخت شاہ تاجدار
بر سیدم بر کرانِ دجلہ کشتی رفتہ بود … بود تختی منکر آنجا تختہ با شد بر قطار
آمد کشتی شد درز ہا ئش ناپدید … خود بخود بنشست آنجا بر کنار رود بار
تہ ہائے آہنی دیدم ز سنگ آمد بروں … اندر آمد در حرارہ کشتی شد پا یدار
آنکہ پیش آمد من نشستم اندر رو … زیں سبب تاخیرم افتاد اے پسر معذور دار
ت ملحد ترم دار اے بو حنیفہ زیں دروغ … تختہ آورد کایں کس ندارد استوار

اس کے بعد صانع عالم کو شمار کیا ہے خصوصاً آدمی کی پیدائش کا ذکر کرکے صانعِ عالم کی کمال خلاقی
بتایا ہے، پھر کہتے ہیں:

انعے باید حکیم و قادر و قائم بذات … تا پدید آید ز صنعِ او بستانِ قندھار
ح ناداں کے پدید آرد حکیم و فیلسوف … عقل از تو کے پذیرد ایں سخن را برمدار
بگو ایزد یکے قائم بذات و لم یزل … قادر و معطی و دانا خالقِ بر و بحار
بود یم او پدید آورد مان از چہار طبع … محدث آمد چار طبع و چار فصل روزگار

(دیوان ص ۲۳۸ بعد)

سنائی بڑے درجے کے موحد تھے، ان کا کلام توحید کے اعلیٰ خیالات سے مملو ہے، ان کے نزدیک
ئنات کا سارا عمل ذات باری کے حکم کے تابع ہے، وہ ذات واجب الوجود ہے، اس کا کوئی شریک
ہتا نہیں، وہ بے عیب ہے، ہر ضرورت سے مبرا، اوپر جو اشعار نقل ہوئے ہیں ان میں سے بعض
ا توحید باری تعالیٰ سے متعلق خیالات کا اظہار ہوا ہے، دیوان میں متعدد قصائد ہیں جن کا موضوع
ا توحید خداوندی ہے، چند منظومات سے منتخب اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

ای در دل مشتاقان از عشق تو بستانها	وز حجت بیچونی در صنع تو برهانها
در ذات لطیف تو حیران شده فکرتها	بر علم قدیم تو پیدا شده پنهانها
در بحر کمال تو ناقص شده کاملها	در عین قبول تو کامل شده ناقصها
در سینهٔ هر معنی بفروخته آتشها	بر دیدهٔ هر دعوی بر دوخته پیکانها
از سوز جگر چشمی چون حقهٔ گوهرها	وز آتش دل آهی چون رشتهٔ مرجانها

(دیوان ص ۱۶)

شہادت گفتن آن باشد کہ ہم ز اول در آشامی	ہمہ دریائے ہستی را بدان حرف نہنگ آسا
نیابی خار و خاشاکے دریں رہ چون بفراشی	کمربست و بفرق استاد در حرف شہادت لا
چو لا از صدر انسانی فگندت در رہ حیرت	پس از نور الوہیت باللہ ای از الا
آنکہ نامش از مکان آمد ندارد خود مکان	پس تو دارندۂ مکانی در مکان چون خوانمت
این و آن باشد اشارت سوئے اجسام کثیف	تو لطیفی در عبارت این و آن چون خوانمت
آنچہ دل داند حدوث است آنچہ لب گوید حروف	من ز دل چون دانمت یا از زبان چون خوانمت
از دعائے کن مکان آمد پس از تخییل خویش	در مناجات از فضولی کن مکان چون خوانمت

(ص ۱۰۴-۱۰۵)

بندۂ خاص ملک باش کہ با داغ ملک	روزہا ایمنی از شحنہ و شبہا ز عسس
ہر کہ او نام کسے یافت ازیں درگہ یافت	اے برادر کسے او باش و میندیش ز کس

(ص ۳۰۷)

با دو قبلہ در رہ توحید نتوان رفت راہ	یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

(ص ۴۰۸)

نبوت کے بارے میں حکیم سنائی کے وہی خیالات ہیں جو سلف صالحین سے چلے آرہے ہیں،
ول اللہ صلعم کے عقیدے کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کو سنت رسولؐ کے تابع کر دے، اس لیے
چھے اور برے کا مدار اس پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس امر خاص میں کیا عمل رہا ہے، جو
پسند ہے وہ چیز اچھی ہے، جو ان کو ناپسند ہے وہی چیز بری ہے، سنائی نے سنت رسولؐ کی اتباع کو دین
ن بتایا ہے، ان کے اس طرح کے خیالات سے دیوان بھرا پڑا ہے، اس سلسلے کے چند منظومات کا
س درج کیا جاتا ہے :-

ا دین اگر اقبال مر و مصطفائی را	نگروی ہرگزی پیدا خدائے ما خدائی را
یا مرسل تازی کہ برزد بادی از کوششش	ہیں گنج زمینی را ہماں گنج سمائی را

(دیوان ص ۳۳)

بصحرا شد جمال سید کون از عدم	جاہ کسریٰ را زد بعالمہائے عزل اندر قدم
دعوت چوں بزد در رفلک بطحی در زمان	بر کنار عرش برزد رایت ایمان علم
بر کل مخلوقات آنکہ از بہر جاہ	یاد کردایزد بجانِ او بعمراں ور قسم
بر چرخ گردوں نام او بینی نشاں	بر نہاد عرش یزداں نام او بینی رقم
نصر من اللہ چوں برآمد از عرب	آتش اندر زد بجان شہہ یلیا عجم
لم آمدہ پیشِ قیامش در رکوع	طارم کسریٰ از و کسرو ز جاہ او بجم
شرع و دینش را خدا اندر جہاں	یاد کرد اندر کلام خود نہ افزون و نہ کم
ماں بو بکرؓ بود و قائمین فرخ عمرؓ	متقین عثمان، علی مستغرقیں آمد بہم
دلاور آدم خواجۂ ہر دو جہاں	آنکہ یزدانش امامت داد بر کل امم
ل و جاہ و اقبالش خدائے ذوالجلال	نام او پیش از ازل با نام خود کردہ رقم

صدرِ ہر دو جہان و کارساز حشر و نشر — آفتابِ دین محمد سید عالی ہمم
در سخن جز نامِ او گفتن خطا باشد خطا — در ہنر جز نعتِ او گفتن ستم باشد ستم

(ص ۳۶۳ مجلد)

اے سنائی گر ہمی جوئی ز لطفِ حق سنا — عقل را قربان کن اندر بارگاہ مصطفیٰ
مصطفیٰ اندر جہان، آنگہ کسے گوید کہ عقل — آفتاب اندر فلک، آنگہ کسے جوید سہا
طوقِ داران الٰہی از زبانِ ذوق و شوق — عقل را در شرع او خوانند غم خوار و کیا
در شریعت ذوقِ دین یابی نہ اندر عقل از آنک — قشر عالم عقل دارد مغز روحِ انبیا
عقل تا با خود منی دارد عقالش خوان نہ عقل — چون منی زو دور گشت آنگہ ورا خوانش دوا
عقل تا گمراست او را شرع نپذیرد عزیز — باز چون گم گشتہ گردد شرع پیشش کہربا
در خداے آباد یابی امر و نہی و دین و کفر — وا محمد مرسل خداے آباد را بس پادشا
رحمۃ للعالمین آمد طبیبت زو طلب — چہ از این عاصی و زان عاصی ہمی جوئی شفا
کان شفا کز عقل و نفس و جسم و جان جوئی شفا — چون نہ از دستور او باشد شفا گردد شفا
کان نجات و کان شفا کا باب سنت جستہ — بو علی سینا ندارد در نجات و در شفا
مسجدِ حاجت روا جوئی مجو اینجا کہ نیست — راہِ سنت گیر و آنگہ مسجد حاجت روا
چنگ در فتراکِ او زن تا بہ حق یابی رہی — سنگ بر قندیلِ خود زن تا ز خود گردی رہا
در حریمِ مصطفیٰ بو بکر دار اندر حسام — تا سیہ روئی جفا بینی و خوش خوئی وفا
عشق را بینی علم برکردہ اندر کوئے صدق — عقل را بینی قلم بشکستہ در صدر رضا
با وفا در دین چنداں بپر در راہِ او — تا نہ مال خوف ماند با تو نہ بیم رجا

(ص ۴۳ - ۴۴)

حسب ذیل نعتیہ قصیدے میں سورۂ والضحیٰ کی پوری تفسیر فی البدیہہ کی گئی ہے، چند ابتدائی
کیے جاتے ہیں:

اے ما اہم اندر تیرگی ہم در صفا	نیست دار الملک جز رخسار و زلفِ مصطفیٰ
روش گر بصرا نادیدی قہر و لطف	کافری بے برگ اندر ستی و ایمان بے نوا
و قدر در شکل روے و موے اوست	این ز و اللیل شود معلوم آن از و الضحیٰ
کفر و ایمان نیستی آن زلف در رخ	کی قسم گفتی بدان زلف و بدان رخ پادشا

(دیوان ص ۴۴)

ایک نعتیہ قصیدے کے چند شعر قابلِ ذکر ہیں:

باے رایت تحقیق رایت را حشم	رائے تو باشد حشم توفیق بفرمانِ علم
ودی بود تو موجودِ کلّی را وجود	حق بجائے تو نکردی یاد در قرآن قسم
نہ اندی رحمۃ للعالمین بہر دان ترا	در ہمہ عالم کہ دانستی صدر را او نعم
لعمرک گفت اینجا جاے دیگر والضحیٰ	گشتان روشن کہ تو ابوالقاسمی نہ بوالحکم
ہم روے و موبت پردہ از رخ بر نداشت	نہ ظلم از نور پیدا بود نہ نور از ظلم
ا بیمار غفلت بود اندر راہ لا	حق ترا از حصۂ تحقیق فرمودش نعم
ے محمد رو طبیبِ حاذق و صادق توئی	خلق کن با خلق و برنہ در دایشان مرہم

(دیوان ص ۳۰۴)

رسول اللہ کو دین کا صحیح ترجمان سمجھتے تھے، اپنے زمانے کے مسلمانوں کے دینی افکار میں اختلاط
بہت احساس تھا، ایک طرف تو علمائے سو کا غلبہ تھا، دوسری طرف باطل عقائد ابھر رہے تھے
نانی فلسفہ کی پیروی میں دین و شریعت کی نئی تعبیر پیش کرتے تھے، سنائی کو اس کا بڑا درد تھا

اور انھوں نے متعدد نظموں میں اس فتنے سے آگاہ کیا ہے، ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۱ راهِ دین پیداست لیکن صادقِ دیندار کو　　یک جهان معشوق بینم، عاشقِ غمخوار کو
عالمی پُر زد انکار است از خارِ خواجگی　　ای دریغا در جهان یک حیدرِ کرّارؓ کو
گشت پُر طوفانِ زنا اهلِ زمانه چون کنم　　آن دعای نوح و آن کشتیِ دریابار کو
طور هست و لن ترانی لیک چون موسیٰ ترا　　آن تجلای جلال و وعدهٔ دیدار کو
پیش ازین در راهِ دین بُد صد هزار اسفندیار　　گرد هفت اقلیم اکنون یک سپه سالار کو
عمرؓ و عثمانؓ و بوبکرؓ و علیؓ بینم همی　　آن حیا و علم و عدل و صدق آن هر چار کو
در رهِ هل من مزید عاشق هر جانب را　　آن اناالحق گفتن و آن دجله و آن دار کو
هودج از معشوق در بیع از عاشقان خالی بماند　　در دیارِ دردمندان یک در و دیوار کو
چشمِ موسیٰ تار شد بر طورِ غیرت زانتظار　　جلوهٔ توحید و برقِ خرمنِ اشرار کو
گیرمت بوبکر نامت چون نداری صدقِ او　　یاری دندان مار و زخمِ آن در غار کو
چون همی خواهی که عاری بوسه بر ساقِ عرش　　در رهِ اسلامِ عشق بوذرؓ و عمارؓ کو
(دیوان ص ۴۴، ۵۰)

ایک دوسرے قصیدے میں دین کے دعویداروں کی خوب خبر لی ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے سنائی چند لاف از خواجه و مهتر زنی　　داد قلابان همی بے مهر سلطان زر زنی
با چنین دل ایجوز اندر مشو در کوی عشق　　رخت دل در خانه نه تا کے چو دربان در زنی
گر یکی دم بر تو آید باز پرس از یاد فقه　　قال قیلے پیش گیری چنگ در دستر زنی

---

۱ اسی زمین میں ایک اور قصیدہ اور مشابہ زمین میں دوسرا قصیدہ ہے جن میں اسی مضمون پر اظہارِ خیال ہوا ہے، دونوں کے مطلعے یہ ہیں:

سر بسر دعویٰ است مردا مردِ معنی دار کو　　تیز بینی پاک دستی رهبرِ غمخوار کو (ص ۲۰۴)
اے سنائی عاشقی را درد باید درد کو　　بارکش نیکوان را مرد باید مرد کو (ص ۱۸۸)

ر در صدر فقہت مفتیؒ لازم کند　　فقر را منکر شوی با شیخ شبلیؒ بر زنی

یال اللہ اگر دانی صہیب از کف بنہ　　تا کے از عیسیٰ گراں جوئی دلات از خر زنی

مومن، سینہ کافر رسم تر سایاں بود　　روے چوں بوذر نمائی راہ چوں آذر زنی

ہمہ رنگست و نیرنگست زلیخا سرتاب　　عاشق شو تا مغا چنگ در دلبر زنی

سنائی راست می گوئی ز کیچ گریاں مترس　　تا قدم چوں دم براہِ دین پیغمبر زنی

(۶۹۴_۶۹۳)

حسبِ ذیل قصیدے میں" اصحابِ قال" کی نکوہش کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :

لنید آخر محال اے حلقِ اصحابِ حال　　در مکان آتش زنید اے طائفۂ اربابِ قال

ا روز بہار از گرم رفتن دم زنید　　زیں یجوز و لا یجوز و خرقہ و حال و مجال

پوشہ گشتہ اند از بہر زرق و مخرقہ　　دیں فروشاں گشتہ اند از آرزوئے جاہ و مال

نظام الدین و فخرِ ملت و شیخ الشیوخ　　چند ازیں حال محال و چند ازیں ہجر و وصال

ان مرز و ذوالجلال و ذوالبقا را یافتی　　در خط خوب تکین و در خم زلفِ ینال

ں باشد کہ متواری شود سیمرغ وار　　ہشت جنت زیر پر و ہفت دوزخ زیر بال

جنیدؒ و بایزیدؒ از خاک سر بر کنید　　تا جہانے پُر جدل بیند و خلقے پُر جدال

و دریغا صادقان گرم رو در راہِ دیں　　سیر ایشاں دیدہ و وزد عشق ایشاں سینہ مال

بر داری تو اے نامحرم نا اہل حام　　از جفاہائے صہیبؓ و از بلاہائے بلالؓ

زاغ سیاہ ذیست یک باز سفید　　یک رمہ افراسیاب ذیست پیدا پور زال

دیوان بینم اینک در مصارف جبرئیل　　بیشۂ شیراں شرزہ شد کمیں گاہ شغال

(ص ۳۴۵ بعد)

(باقی)

امام ابومعشر سندی صاحب المغازیؒ

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

صدر اسلام میں ہندوستان کے جن علماء اور ان کے خانوادوں نے اپنے علمی و دینی کارناموں کے باعث امامت و سیادت پائی اور صدیوں تک ان کے علم و فضل کی گرم بازاری رہی، ان میں امام ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی صاحب المغازی متوفی سنہ ۱۷۰ھ رحمۃ اللہ علیہ کو خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔

انھوں نے مرکز اسلام مدینہ منورہ میں ہوش کی آنکھ کھولی، بعض اصاغر صحابہؓ کی دید و زیارت کا شرف پایا، علمائے تابعین سے علم حاصل کیا، زندگی کا بیشتر حصہ یہیں بسر کیا، اور سیر و مغازی میں ایک اہم کتاب لکھی، جو بعد میں مدینہ منورہ کی دیگر کتبِ مغازی کی طرح اس موضوع کا مستند ماخذ قرار پائی، زندگی کے آخری دور میں خلیفہ مہدی عباسی کی دعوت پر بغداد آئے اور دس سال کے بعد یہیں انتقال کیا، دوسری اور تیسری صدی کے علمائے اسلام کی طرح وہ بھی حدیث و فقہ کے زبردست علماء اور حفاظِ حدیث میں سے تھے، اسی کے ساتھ اخبار و احداث خصوصاً سیر و مغازی میں امامت کا درجہ رکھتے تھے[1]۔

امام ابومعشر کے تذکرہ نویسوں نے ان کے حالات زندگی کے بارے میں نہایت اختصار سے

---

[1] ابومعشر سندی مدنی کے معاصرین میں ایک اور صاحب علم ابومعشر کی کنیت سے مشہور تھے، جو بنی مالک بن زید مناۃ ابن تمیم سے تھے، ان کا نام زیاد ابن کلیب تھا، یوسف بن عمر کی امارت عراق کے زمانہ میں فقیہ، عالم اور صاحب فتویٰ تھے ...

ہے، ابن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے طبقات میں، خلیفہ بن خیاط متوفی ۲۴۰ھ نے تاریخ میں، ابن قتیبہ ۲۷۶ھ نے المعارف، امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے تاریخ کبیر، امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے کتاب الجرح والتعدیل، ابن ندیم موجود ۳۷۷ھ نے الفہرست اور ابوالفضل طاہر ابن القیسرانی متوفی ۵۰۷ھ نے الانساب المتفقہ میں امام ابو معشر کے متعلق چند سطریں ہیں، ان میں سے بعضوں نے صرف ایک دو سطر پر اکتفا کیا ہے، البتہ خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ تاریخ بغداد میں ان کے حالات نسبتہً تفصیل سے لکھے ہیں، اسی طرح حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ تہذیب التہذیب میں، امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے تذکرۃ الحفاظ، میزان الاعتدال اور العبر فی خبر من غبر میں مزید باتیں بیان کی ہیں، مگر ان میں بھی حالات زندگی کم اور ائمہ جرح وتعدیل کے آراء زیادہ ہیں، بہرحال اس وقت امام ابو معشر کے بارے میں ان ہی کتابوں سے یہ معلومات ... جا رہی ہیں۔

نسب اور ولاء | باتفاق مورخین ان کا نام ونسب یہ ہے: ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی ہاشمی مولیٰ بنی ہاشم یا مولیٰ المہدی[1]، چونکہ مدینہ منورہ کی طرف نسبت مدنی اور مدینی دونوں سے ہوتی ہے ابن القیسرانی نے ان کو مدینی لکھا ہے[2]، جب کہ عراق کے شہر مدائن کی طرف نسبت مدائنی ہے۔ ان کے سندی النسل والاصل ہونے پر تمام تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے اور سب نے ان کو سندی کی نسبت سے یاد کیا ہے، ان کے صاحبزادے محمد بن ابی معشر جو نہایت ثقہ محدث اور امام ترمذی کے ... بیان کرتے ہیں:

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۴۱۸، تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۱۷، تاریخ کبیر ج ۴ قسم ۲ ص ۱۱۴، المعارف ص ۲۲۰، کتاب الجرح ... ج ۴ قسم ۱ ص ۴۹۳، الفہرست ص ۱۳۶، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۷ وغیرہ [2] الانساب المتفقہ ... ۶۔

كان ابي سنديًّا اخرم خياطًا[1] — میرے والد سندی تھے، ان کا کان چھدا ہوا تھا، وہ درزی تھے۔

سندھ کے باشندوں میں کان چھدانے کا عام رواج تھا، اور وہ اس بارے میں عرب میں مشہور تھے، امام شعبی متوفی ۱۰۴ھ نے ایک موقع پر کہا ہے:

واحبب من رأيته يعمل بالخير — تم جس کو نیک کام کرتے ہوئے دیکھو اس سے

وان كان اخرم سنديًّا[2] — محبت کرو، اگرچہ وہ کان چھدا سندھی ہی ہو۔

عام سندھیوں کی طرح ابو معشر کا رنگ سیاہ تھا، ابو مسہر کا بیان ہے:

كان ابو معشر اسود[3] — ابو معشر کا رنگ سیاہ تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ گورے تھے۔

اسی طرح سندھیوں میں عجمیت و لکنت عام تھی جس کی وجہ سے وہ حروف اور الفاظ کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے، ابو عطا سندی کوفی متوفی بعد ۱۸۰ھ جیسا مشہور حماسی شاعر اپنی لکنت و لثغت کی وجہ سے صحیح تلفظ سے معذور تھا، اور جرادہ کو زرادہ، حج کو زز اور شیطان کو سیطان کہتا تھا، ابو معشر کی زبان میں بھی لکنت تھی، جس کی وجہ سے وہ بعض حروف و الفاظ صحیح طور سے ادا کرنے سے معذور تھے، ابن القیسرانی نے ان کے تلمیذ ابو نعیم فضل بن دکین کا یہ قول نقل کیا ہے جس کو امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور میزان الاعتدال میں درج کیا ہے:

كان ابو معشر سنديًّا وكان رجلًا الكن وكان يقول: حدثنا محمد — ابو معشر سندھی تھے، ان کی زبان میں لکنت تھی اور حدیث بیان کرتے وقت محمد بن کعب

---

۱ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۸۔ ۲ طبقات ابن سعد ج ۶، ص ۲۴۸

۳ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۷۔

بن قعب، یرید محمد بن کعب[۱] کہنا چاہتے تھے کہ محمد بن کعب کہہ بیٹھے۔

یہی معذوری و مجبوری احادیث کی روایت کے سلسلہ میں صاف اور صحیح طور سے سند
نہ کرنے کے اسباب میں سے بڑا سبب بنی، جیسا کہ معلوم ہوگا۔

ابومعشر کے سندی، اخرم، الکن اور اسود ہونے کی ان تصریحات سے ان کا سندی الاصل ہونا
واضح ہے، مگر ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ، میزان الاعتدال اور العبر میں ان کی نسبت "السندی"
بیان کرنے کے باوجود ان کو گورا چٹا اور فربہ لکھا ہے، بلکہ العبر میں یہاں تک لکھ دیا ہے:

قیل لہ السندی من قبیل اللقب بالضد[۲] — لقب بالضد کے مطابق ان کو سندی کہا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے ان کو "السندی المدنی" لکھنے کے باوجود لکھا ہے:

یقال ان اصلہ من حمیر[۳] — کہا گیا ہے کہ ان کی اصل یمن کے قبیلہ حمیر سے ہے۔

یہ اقوال جمہور مورخین کی تصریح کے خلاف ہیں، ابن القیسرانی نے ان کے سندی الاصل ہونے کو
بہت واضح طور سے بیان کر کے اس قسم کے احتمال کی گنجائش نہیں رکھی، وہ انساب و القاب کی تحقیق
پر بڑی نظر رکھتے تھے، ان کا بیان یہ ہے:

السندی والسندی والسندی والسندی، الاول منسوب الی السند، منھم ابومعشر المدنی السندی مولیٰ بنی ھاشم[۴] — ان چار سندیوں میں سے پہلے کی نسبت سندھ کی طرف ہے، ان ہی میں سے ابومعشر مدنی سندی مولیٰ بنی ہاشم ہیں۔

---

[۱] انساب المتفقہ ص ۷۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۷، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۲۹۔ [۲] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۲۵۹۔ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹۔ [۴] الانساب المتفقہ ص ۷۷۔

ہمارے خیال میں امام ذہبی اور حافظ ابن حجر کے یہ اقوال ابومعشر کے بعد ان کے دو پوتوں حسین بن محمد ابومعشر اور داؤد بن محمد بن ابومعشر کے عالی نسبی کے ادعا کی وجہ سے ہیں، جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے دادا کا نسبی تعلق یمن کے شاہی خاندان حمیر یا بنو حنظلہ بن مالک سے ہے، وہ اپنا سلسلۂ نسب حضرت آدمؑ تک بیان کیا کرتے تھے، اور ان کا اصل نام عبدالرحمٰن بن ولید بن ہلال تھا۔

ابومعشر کے بارے میں عالی نسبی کا دعویٰ

امام ابومعشر کے صاحبزادے محمد بن ابومعشر کا بیان گذر چکا ہے کہ میرے والد سندھی تھے، ان کا کان چھدا ہوا تھا، اور ان کا ذریعۂ معاش خیاطی تھا، باپ کے اس صاف وصریح قول کے مقابلہ میں ان کے دو بیٹوں ابوبکر حسین بن محمد بن ابومعشر اور ابوسلیمان داؤد بن محمد بن ابومعشر نے الگ الگ دعوے کیے ہیں، خطیب بغدادی نے حسین ابن محمد ابن ابومعشر کا بیان نقل کیا ہے کہ میرے والد محمد ابن ابومعشر نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ میرے والد ابومعشر کا نام ان کے چرائے جانے سے پہلے عبدالرحمٰن بن ولید بن ہلال تھا، ان کو چوری کر کے مدینہ میں فروخت کیا گیا، اور بنی اسد کی ایک جماعت نے ان کو خرید کر نجیح نام رکھا، اس کے بعد وہ موسیٰ بن مہدی کی والدہ کے لیے خریدے گئے (فاشتری لام موسیٰ بن المھدی) اور موسیٰ کی والدہ نے ان کو آزاد کر دیا، اس لیے ان کی میراث بنو ہاشم کو ملی اور دیت کی ذمہ داری حمیر پر رہی، اور میرے والد ابومعشر کہا کرتے تھے کہ وہ حنظلہ بن مالک کی اولاد سے ہیں، انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنا نسب نامہ حضرت آدمؑ تک بیان کیا کرتے تھے، اور یہ کہ میرے نزدیک بنی ہاشم کی ولاء اور غلامی بنی حنظلہ کے نسب سے زیادہ محبوب ہے۔[1]

یہ پورا بیان جمہور مورخین کے خلاف ہے جیسا کہ معلوم ہوگا، ابومعشر کو مدینہ منورہ میں پہلے بنی مخزوم کی ایک عورت نے خریدا، بعد میں مہدی کی ماں ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ نے ان کی مکاتبت کی، ازآں

---

[1] تاریخ بغداد ص ۴۲۸۔

کے آزاد کردیا، اور حقِ ولاء اپنے لیے محفوظ رکھا، یہ عورت ام موسیٰ بن مہدی یعنی مہدی کے بیٹے ہادی کی ماں نہیں ہے، بلکہ ام موسیٰ اس کی کنیت قائم مقام نام کے ہے جو خود مہدی کی ماں ہے، ت مہدی کی ماں کا نام خیزران ہے، ام موسیٰ (خیزران) کے ابومعشر کو خریدنے کی صورت میں ان کی حمیر کے ذمہ کیسے ہوگئی؟ خاص طور سے جب کہ وہ قبیلۂ حنظلہ بن مالک سے تھے جو قبیلۂ حمیر سے جدا قبیلہ ہے، ابومعشر انتہائی بچپن میں مدینہ منورہ لائے گئے، اس عمر میں اپنا نسب نامہ دو چار تک یاد نہیں رہتا ہے چہ جائیکہ حضرت آدمؑ تک بیان کیا جائے، ان واقعات کے بے اصل ہونے ب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے راوی کو اہل علم نے غیر ثقہ قرار دے کر اس سے روایت ترک ا ہے، اور وہ غیر ثقہ و متروکین میں شامل ہے، خطیب نے لکھا ہے:

ولم یکن بالثقۃ فترکہ	حسین بن محمد بن ابومعشر ثقہ نہیں تھے اس لیے
الناس [1]	لوگوں نے ان سے روایت بند کردی تھی،

ان بے بنیاد دعووں کے مقابلے میں دوسرے بھائی داؤد بن محمد بن ابومعشر کا بیان قابل توجہ ہے:

حدثنی ابی ان ابا معشر کان	میرے والد نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ ان کے
اصلہ من الیمن وکان سبی فی	والد ابومعشر کی اصل یمن سے ہے، اور وہ یمامہ
وقعۃ یزید بن المہلب بالیمامۃ	و بحرین میں یزید بن مہلب کے واقعہ میں گرفتار
والبحرین، وکان ابیض [2]	کیے گئے، اور وہ گورے تھے۔

قول کی تائید کے لیے قرائن پائے جاتے ہیں، یمن اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات بہت تھے اور یمن کے حدود میں ہندیوں اور سندھیوں کی آبادیاں تھیں، عہد رسالت سے پہلے وہاں ہندیوں کا انی زور تھا، ایک مرتبہ وہاں کے حکمراں سیف بن ذی یزن نے ایران کے بادشاہ کسریٰ سے شکایت کی

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۹۲ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۷۔

کہ میرے ملک پر سیاہ رنگ کے لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے، اس پر کسریٰ نے دریافت کیا:

فای السودان غلبوا علیها الحبشة — کن کالوں نے یمن پر قبضہ کیا ہے، حبشی

ام السند[1] — یا سندھی؟

دوسری روایت میں ہے کہ سیف بن یزن نے اجانب کے غلبہ کا شکوہ کیا تو کسریٰ نے پوچھا:

ای الاغربة الحبشة — کن اجنبی لوگوں نے غلبہ کیا ہے، حبشی

ام السند[2] — یا سندھی؟

ایک بزرگ بیرزطن ہندی یمن میں تھے، جو بھنگ کے ذریعہ علاج کرنے میں مشہور تھے، اور عہد رسالت میں یا اس کے بعد مسلمان ہوئے[3]

ہمارا خیال ہے کہ امام ابومعشر کا خاندان سندھ سے نکل کر پہلے یمن کے اس علاقہ میں آباد ہوا جو یمامہ سے قریب تھا، اس زمانے کا بحرین اسی علاقہ میں تھا جو آج کل سعودی عرب کا منطقۂ شرقیہ کہلاتا ہے، آج کا بحرین اس سے دور واقع ہے، قدیم زمانہ میں اس کو اُوال کہتے تھے۔

مذکورۂ بالا قول میں اسی قدیم یمامہ و بحرین کے ایک واقعہ کا ذکر ہے، جس میں ابومعشر کی گرفتاری بیان کی گئی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۹۶ھ میں خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن مہلب ازدی کو عراقین کی امارت دی، اس نے اشعث بن عبداللہ ابن جارود کو بحرین کا امیر مقرر کیا، اور مسعود بن ابو زینب محاربی نے اس کے خلاف خروج کیا، جانبین میں مقابلہ ہوا، نتیجہ میں یزید بن مہلب کے امیر اشعث ابن عبداللہ کو شکست ہوئی اور مسعود محاربی بحرین پر قابض ہوگیا[4]، داؤد بن محمد بن ابومعشر کے بیان کے مطابق ۹۶ھ کی اسی جنگ میں ابومعشر گرفتار کرکے مدینہ منورہ لائے گئے۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۰ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۶۳، کتاب التیجان ص ۳-۳۰۳، طبری ج ۲ ص ۱۱۶

[3] رجال السند والہند، طبع قاہرہ ص ۷۷۔ [4] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱، ص ۴۲۔

آزادی اور مدینہ منورہ میں مستقل سکونت

امام ابو معشر کا خاندان سندھ سے عرب میں کب، کہاں اور کیسے پہونچا، ان باتوں کے بارے میں یقینی معلومات نہیں ہیں، اگر ان کے پوتے داؤد کا
صحیح مان لیا جائے تو ان کا خاندان یمن کے اس علاقہ میں آباد تھا جو یمامہ اور بحرین کے قریب واقع تھا،
ہیں ان کی پیدائش بھی ہوئی، سنہ ۹۶ھ میں وہ بچپن میں گرفتار کرکے مدینہ منورہ لائے گئے، اس
ت ان کی عمر کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مدینہ منورہ میں حضرت ابو امامہ
ہل بن حنیف متوفی سنہ ۱۰۰ھ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، اور ان کی ہیئت یاد رکھی، اور بقول امام ذہبیؒ
رت سعید بن مسیب مدنی متوفی سنہ ۹۴ھ کا زمانہ نہیں پایا، ہمارا اندازہ ہے کہ ابو معشر آٹھ سال کی
ں سنہ ۹۶ھ میں یا اس کے بعد یہاں لائے گئے، اور ان کی پیدائش ۸۸ھ کے حدود میں ہوئی ہوگی۔

امام ابو معشر کی زندگی درحقیقت مدینہ منورہ آنے کے بعد شروع ہوئی، اس سے پہلے ان کا کوئی
د نشان نہیں ملتا ہے، ان کے سوانح نگاروں میں ابن سعد، ابن قتیبہ، ابن ابی حاتم رازی کا متفقہ
ن ہے:

وکان مکاتباً لامرأة من بنی مخزوم	ابو معشر بنی مخزوم کی ایک عورت کے مکاتب
فادّی وعتق واشترت ام موسیٰ	غلام تھے، اور انھوں نے مکاتبت کی رقم
بنت منصور الحمیریة ولائه	ادا کرکے آزادی حاصل کرلی اور ام موسیٰ بنت
	منصور حمیریہ نے ان کا حق ولا خرید لیا۔

ن ندیم نے صرف یہ لکھا ہے: وکان مکاتباً لامرأة من بنی مخزوم غالباً ان کا نام نجیح ان کی
مولاۃ والکہ مخزومیہ نے رکھا تھا، عرب اپنے غلاموں کے نام نیک فالی کے لیے عطاء، افلح، یسار
وغیرہ رکھتے تھے، مکاتبت یعنی ایک خاص مقدار میں رقم ادا کرنے کی شرط پہ آزادی ابو معشر کی پختہ عمر کی

طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۱۸، المعارف ص ۲۲۰، کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ قسم ۱ ص ۴۹۳، ابن ندیم

جد ہوئی ہوگی، اور جوانی میں آزادی کے لیے جد وجہد کی ہوگی جس کے نتیجے میں ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ نے مقررہ رقم ادا کرکے ان کو آزاد کر دیا اور حق ولاء اپنے لیے محفوظ رکھا، جو آگے چل کر خلیفہ مہدی کی فرمایش اور خواہش پر بغداد جانے اور درباری اعزاز پانے کا باعث بنا، ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ کے بارے میں ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب میں لکھا ہے کہ ابوجعفر منصور نے اموی دور خلافت میں ام موسیٰ حمیریہ سے قیروان میں نکاح کیا تھا جس کے بطن سے محمد المہدی اور جعفر الاکبر پیدا ہوئے، صورت یہ ہوئی کہ حضرت عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے خاندان کا ایک نوجوان افریقہ کے شہر قیروان پہونچا، جہاں اس نے ام موسیٰ حمیریہ سے شادی کی، اس سے ایک بچی پیدا ہوئی، کچھ دنوں کے بعد وہ جوان قیروان میں فوت ہوگیا، جب اس کی خبر عراق میں اس کے خاندان والوں کو ملی تو ابوجعفر منصور بچی کو لینے کے لیے قیروان گیا، وہاں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ ام موسیٰ نے ایک خیاط (درزی) سے دوسرا نکاح کرلیا تھا جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ خیاط بھی انتقال کرچکا ہے، ام موسیٰ حمیریہ نہایت حسین وجمیل تھی، اس لیے ابوجعفر منصور نے اس سے نکاح کرلیا اور اس کے لڑکے کا نام طیفور رکھا، عباسی خلافت میں اس کو طیفور مولیٰ المہدی کہنے لگے، حالانکہ وہ مہدی کا بھائی ہے اور ان دونوں کی ماں ام موسیٰ حمیریہ ہے[1]، اسی طیفور مولیٰ المہدی کو ہارون رشید نے اپنے دور خلافت میں سندھ کی امارت دی تھی، اس وقت یہاں یمانیہ اور نزاریہ کی قبائلی عصبیت اور جنگ برپا تھی جس کے فرو کرنے میں طیفور ناکام رہا[2]۔

ابومعشر ایام طفلی سے سن شعور تک بنی مخزوم کی ایک عورت کے غلام رہے اور پختہ عمری میں مکاتبت کے ذریعہ آزادی کی کوشش کی، اس درمیان میں ان کی مالکہ نے ان کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ کی، وہ بچپن ہی میں مدینہ منورہ کے فقہاء ومحدثین سے تحصیل علم اور کسب فیض کرنے لگے، اور ان میں دینی وعلمی کمالات کا ظہور ہونے لگا، حتیٰ کہ ان کی جوانی میں صلاحیت وصلاحیت دیکھ کر اعیان واشراف کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں، اور عہد

[1] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۱　[2] رجال السند والہند ص ۴۳۳۔

بن علی بن عبداللہ بن عباس (بعد میں خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی) کی بیوی ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ ابو معشر کی مکاتبت کی رقم ادا کر کے آزاد کر دیا اور ان کو اپنی ولاء میں لے لیا، اس کے بعد وہ یکسوئی اور کے ساتھ تحصیل و تکمیل میں لگ گئے۔

ت ابو امامہؓ کی زیارت اور تابعیت

امام ابو معشر نے آخری دس سال کے علاوہ پوری زندگی مدینہ منورہ میں بسر کی حتیٰ کہ تحصیل علم کے سلسلہ میں کسی دوسرے شہر جانے کی تصریح نہیں ملتی ہے، ان کے تمام ذہ و شیوخ مدنی ہیں جن میں سے اکثر نے براہ راست حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسب فیض کیا ہے، خود معشر کو بچپن میں ایک صحابی حضرت ابو امامہؓ بن سہل بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کی رویت و لقاء کی سے تابعیت کا شرف حاصل ہے، ان سے حدیث کی روایت تو نہ کر سکے مگر ان کی حالت و ہیئت کی روایت ہے، خطیب بغدادی، امام ذہبی، حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے:

رأی ابا امامۃ بن سھل بن حنیف[۱]　　　ابو معشر نے ابو امامہ بن سہل بن حنیف کو دیکھا ہے۔

حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ اوس سے تھے، ان کی والدہ مرت حبیبہؓ بنت ابو امامہ سعد بن زرارہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تھیں، اور نانا حضرت امامہؓ بنی نجار کے نقیب تھے، واقدی نے کہا ہے کہ ابو امامہؓ بن سہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت لائے گئے تو آپ نے ان کا نام اور کنیت ان کے نانا کے نام و کنیت پر ابو امامہ سعد رکھا، انھوں نے اپنے حضرت سہلؓ بن حنیف، حضرت عثمانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت معاویہؓ سے روایت کی ہے، سعد نے ان کو کثیر الحدیث اور ثقہ بتایا ہے[۲] خلیفہ بن خیاط نے تصریح کی ہے کہ حضرت ابو امامہؓ بن سہل بن حنیف کی وفات سنہ ۱۰۰ھ میں واقع ہوئی[۳]

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹۔

[۲] طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۵۲ [۳] تاریخ خلیفہ ج ۱، ص ۳۳۴۔

ابو معشر نے اپنے بچپن میں حضرت ابو امامہؓ کو ان کے آخری زمانہ میں دیکھا، اس وقت ان سے استفادہ ذکر سکے، البتہ ان کا حلیہ یاد رکھا، صاحبزادے محمد بن ابو معشر کا بیان ہے :

قال رأیت ابا امامۃ بن سہل بن حنیف شیخاً کبیراً یخضب بالصفرۃ ولہ ضفیرتان وقد کان رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	والد ابو معشر نے کہا ہے کہ میں نے حضرت ابوامامہؓ بن سہل بن حنیف کو دیکھا ہے، وہ بہت بوڑھے تھے، زرد خضاب استعمال کرتے تھے، ان کے دو چوٹیاں تھیں، اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔

اور ان کے شاگرد محمد بن بکار کا بیان ہے :

قال رأیت ابا امامۃ بن سہل بن حنیف یخضب بالحناء ولہ وفرۃ [1]	ابو معشر نے بتایا ہے کہ میں نے ابو امامہ ابن سہل بن حنیف کو دیکھا ہے، وہ حنا کا خضاب لگاتے تھے، اور ان کے بال بڑے بڑے تھے۔

علمائے رجال و طبقات تابعیت کے لیے صحابی کی صحبت کے قائل ہیں، مگر قول اظہر یہ ہے کہ صحابی کا لقاء تابعیت کے لیے کافی ہے [2]۔ اس قول کی بنا پر ابو معشر تابعی ہیں۔

تحصیل علم | ابو معشر نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے کو علم و فضل کی آغوش میں پایا، مدینہ منورہ اجلۂ تابعین اور سادات فقہاء و محدثین سے معمور و مشحون تھا، ہر گلی کوچہ میں حضرات صحابۂ کرام کے فیض یافتہ علماء و فقہاء تحدیث و روایت میں مشغول تھے، اور ائمۂ کتاب و سنت کے ساتھ اصحاب سیر و مغازی تعلیم و تدریس میں مشغول تھے، خاص طور سے فقہائے سبعہ مدنی علوم کے منتہی و مرجع تھے، یعنی حضرت سعید بن مسیبؒ

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۸۔ [2] جواہر الاصول ص ۱۰۱ طبع بیروت۔

ت قاسم بن محمد بن ابوبکر، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت خارجہ بن زید بن ثابت، حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن
وف، حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، حضرت سلیمان بن یسار رحمہم اللہ علم نبوت کے امین تھے
ی دور میں مدینہ منورہ میں حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر، حضرت
بن عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن عبداللہ بن عمر، حضرت بلال بن عبیداللہ بن عمر، حضرت ابان بن
ن، حضرت قبیصہ بن ذویب، حضرت اسماعیل بن زید بن ثابت رحمہم اللہ فقہ و فتویٰ اور حدیث
بجہ امامت رکھتے تھے[1] ان حضرات کے علاوہ مدینہ منورہ میں اور بہت سے ائمہ علم و فضل اور ارباب صلاح
ا اپنے حلقہ میں دینی و علمی خدمت انجام دے رہے تھے۔

ابومعشر نے صغر سنی ہی میں اس زمانہ کے مزاج و رواج کے مطابق اپنے مدنی ائمہ فقہ و حدیث سے
ع و روایت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں تصریح کی ہے کہ ابومعشر نے
ضرت سعید بن مسیب سے روایت کی ہے[2] حضرت سعید بن مسیب کا وصال ۹۴ھ میں ہوا ہے
قول کے رو سے ابومعشر نے بچپن میں ان سے روایت کی ہے، مگر امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ابومعشر نے
مسیب کا زمانہ نہیں پایا ہے[3] اور ابومعشر کے شیوخ حدیث میں حضرت ابوبردہ بن ابوموسیٰ اشعریؓ
ہیں، جن کی وفات ۱۰۳ھ کے آخر یا ۱۰۴ھ کے شروع میں ہوئی ہے، اس وقت ابومعشر کی عمر
ہ پندرہ سال کی رہی ہوگی، اس عمر میں یا اس سے کم میں جمہور محدثین کے نزدیک ذکی الحس اور باشعور
کی روایت صحیح مانی جاتی ہے، خطیب نے الکفایہ میں لکھا ہے:

وقال قوم الحد فی السماع	ایک جماعت نے کہا ہے کہ سماع حدیث کی حد
خمس عشرۃ سنۃ، وقال غیرھم	پندرہ سال ہے، دوسروں نے کہا ہے کہ تیرہ
ثلاث عشرۃ، وقال جمھور العلماء	سال ہے، اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ جس کی

---

[1] مقدمہ علوم الحدیث ص ۳۳۲-۳۴۲۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۰۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶۔

یصحوا السماع لمن سنہ دون ذالک — عمر اس سے کم ہو اس کا سماع بھی صحیح ہے ،

وھذا ھو عندنا الصواب [1] — ہمارے نزدیک یہی قول درست ہے ۔

ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو معشر نے صغر سنی ہی میں بحالت غلامی مدینہ منورہ کے علماء سے کسب فیض کی ابتداء کر دی تھی ،

شیوخ واساتذہ | ابو معشر کے شیوخ واساتذہ سب کے سب مدنی ہیں ، امام مالک کی طرح ان کا بھی تحصیل علم کے سلسلہ میں مدینہ منورہ سے باہر جانا معلوم نہیں ہوتا ہے ، مدینہ منورہ اس وقت علمائے تابعین اور ائمۂ دین کا مرکز تھا ، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے ، مگر کتابوں میں چند حضرات کے نام کے بعد و الکبار وطائفۃ وغیرہ کے الفاظ ہیں ، ہم ذیل میں ان کے چند شیوخ کے نام پیش کرتے ہیں :

(۱) سعید بن مسیب قرشی مدنی متوفی ۹۴ھ ، مدینہ کے فقہائے سبعہ کے سرخیل اور افقہ اہل الحجاز ہیں ، ابوبکر ، عمر ، عثمان ، علی ، سعد بن ابی وقاص ، حکیم بن حزام ، عبداللہ بن عباس ، عبداللہ بن عمر ، عبداللہ بن عمرو بن العاص ، ابوذر ، ابو درداء ، حسان بن ثابت ، زید بن ثابت ، عتاب بن اسید ، عثمان بن ابی العاص ، ابو موسیٰ اشعری ، ابو سعید خدری ، ابوہریرہ ، ام المومنین عائشہ ، اسماء بنت عمیس ، خولہ بنت حکیم ، فاطمہ بنت قیس ، ام سلیم ، ام شریک رضی اللہ عنہم وعنہن وغیرہ سے روایت کی ، [2] حافظ ابن حجر نے لکھا ہے :

رأی ابا امامۃ بن سھل بن حنیف — ابو معشر نے حضرت ابو امامہ کو دیکھا ہے ،

وروی عن سعید بن المسیب ۔ — اور سعید بن مسیب سے روایت کی ہے ۔

اور امام ذہبی نے لکھا ہے کہ

لم یدرک سعید بن المسیب ۔ — ابو معشر نے سعید بن مسیب کو نہیں پایا ۔

---

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۶۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۴ ۔

(۲) ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعری مدنی متوفی سنہ ۱۰۳ھ یا سنہ ۱۰۴ھ مشہور محدث و فقیہ ہیں، ان کا
[ا]رث یا عامر ہے، ایک قول ہے کہ کنیت ہی نام ہے، کثیر الحدیث عالم ہیں، ایک زمانہ میں کوفہ کے
تھے، ابو معشر کے سب سے قدیم الوفاۃ استاذ ہیں، انھوں نے اپنے والد ابو موسیٰ اشعری، علی بن
[ابی طا]لب، حذیفہ بن یمان، عبداللہ بن سلام، اغر مزنی، مغیرہ بن شعبہ، ام المومنین عائشہ، محمد بن مسلمہ،
[عبداللہ بن عمر]، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عروہ بن زبیر، اسود بن یزید نخعی رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے[۱]
(۳) محمد بن کعب قرظی مدنی متوفی سنہ ۱۱۷ھ اعلم بتاویل القرآن یعنی قرآن کی تفسیر کے سب سے
[بڑے] عالم تھے، انھوں نے عباس بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عمرو بن عاص
[ابوذر] غفاری، ابو درداء رضی اللہ عنہم سے روایت کی، بعض علماء کے نزدیک ان حضرات سے محمد بن
[کعب] کی روایات مرسل ہیں، نیز فضالہ بن عبید، مغیرہ بن شعبہ، معاویہ ابن ابو سفیان، کعب بن عجرہ، ابو ہریرہ
[زید بن] ارقم، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، عبداللہ بن عمر، براء بن عازب، جابر بن عبداللہ،
[عبداللہ] بن یزید خطمی، عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور دیگر حضرات سے روایت کی ہے[۲]، محمد بن کعب
ابو معشر کی جملہ مرویات ائمہ حدیث کے نزدیک معتبر ہیں۔

(۴) سعید بن ابو سعید مقبری مدنی متوفی سنہ ۱۲۳ھ والد کا نام کیسان ہے، بنی لیث کی ایک
[عور]ت کے غلام تھے، مدینہ منورہ کے قبرستان کے قریب قیام کی وجہ سے مقبری مشہور تھے، انھوں نے
[حضر]ت ام سلمہ، سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، معاویہ بن ابی سفیان، ابو شریح، انس بن مالک، جابر
[بن عب]داللہ، عبداللہ بن عمر، یزید بن ہرمز، عبداللہ بن رافع مولیٰ ام سلمہ، سالم بن عبداللہ مولیٰ نصریین
[عطاء] بن یسار، عبداللہ بن قتادہ، اپنے والد ابو سعید، بھائی عباد بن ابو سعید وغیرہ سے روایت
[کی] ہے[۳]، طبقات ابن سعد میں ہے کہ وہ سنہ ۱۰۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں فوت

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۰۴ [۲] ایضاً ج ۹ ص ۴۲۲، [۳] ایضاً ج ۴ ص ۳۸۔

ہوئے،[1]

(۵) نافع مولی ابن عمر مدنی ۱۱۷ھ ایران کے شہر ابوشہر کے رہنے والے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک غزوہ میں پایا تھا، انھوں نے اپنے آقا عبداللہ بن عمرؓ، ابوہریرہؓ، ابولبابہ بن عبدالمنذرؓ، ابوسعید خدریؓ، رافع بن خدیجؓ، ام المومنین عائشہؓ، ام المومنین ام سلمہؓ، عبداللہ، عبیداللہ، سالم، زید ابنا، عبداللہ بن عمرؓ، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، نبیہ بن وہب، قاسم بن محمد بن ابوبکر، عبداللہ ابن ابوبکر، صفیہ بنت ابی عبید، سعید بن ابو ہند، مغیرہ بن حکیم صنعانی کے علاوہ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت سے روایت کی ہے[2]

(۶) محمد بن قیس مدنی متوفی ۱۲۵ھ یعقوب قبطی کے غلام ہیں، کثیر الحدیث عالم ہیں، عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں قاضی تھے، انھوں نے جابر بن عبداللہ سے مرسل احادیث کی روایت کی ہے، نیز ابوصرمہ انصاری، عبداللہ بن قتادہ، عمر بن عبدالعزیز، ابوبردہ بن ابوموسیٰ، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، عبدالرحمٰن بن یزید بن معاویہ سے روایت کی ہے[3]، محمد بن قیس سے ابومعشر کی مرویات بھی محدثین کے نزدیک معتبر ہیں۔

(۷) محمد بن منکدر مدنی متوفی ۱۳۰ھ فقہائے حجاز میں احد الاعلام اور زبردست محدث و فقیہ ہیں، ان کا شمار سادات قرا میں ہے، انھوں نے اپنے والد منکدر بن ہدیر، چچا ربیعہ بن ہدیر، ابوہریرہؓ، ام المومنین عائشہؓ، ابوایوب ربیعہ بن عباد، سفینہ، ابوقتادہ، امیمہ بنت رقیقہ، مسعود ابن حکم زرقی، انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ بن سہل بن حنیف، یوسف بن عبداللہ بن سلام، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیب، عبیداللہ بن ابورافع، محمد بن کعب قرظی وغیرہ سے روایت کی ہے،[4]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۸۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱۲ [3] المعارف ص ۲۰۳ [4] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۷۳ و ۴۷۴

ابن سعد نے ان کے شاگرد ابو معشر سندی سے روایت کی ہے کہ محمد بن منکدر کے والد نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے ایک ضرورت ہے، آپ میری مدد فرمائیے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، اگر میرے پاس دس ہزار درہم ہوتے تو میں تم کو دے دیتی، ان کے جانے کے بعد ہی خالد بن اسد نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں دس ہزار درہم بھجوائے، اور انھوں نے یہ ساری رقم منکدر کے یہاں بھجوا دی، انھوں نے اسی وقت ایک ہزار درہم کی ایک باندی خریدی، جس کے بطن سے تین فرزند پیدا ہوئے، ان میں سے ایک یہی محمد بن منکدر اور دوسرے دو بھائی ابو بکر بن منکدر اور عمر بن منکدر ہیں، فکانوا عُبّاد اهل المدينة اور یہ تینوں بھائی مدینہ منورہ کے عبّاد و زہّاد میں ہوئے [1]

(۸) موسیٰ بن یسار مدنی مطلبی متوفی ــــــھ مشہور عالم مغازی محمد بن اسحاق کے چچا اور قیس بن مخرمہ قرشی کے غلام ہیں، انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے، یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے، اور ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقات میں کیا ہے [2]

(۹) ہشام بن عروہ بن زبیر اسدی مدنی متوفی ۱۴۵ھ نے حضرت عمرؓ کی زیارت کی ہے اور آپ نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا ہے، نیز سہل بن سعد، جابر بن عبد اللہ اور انس بن مالک کے دیدار سے مشرف ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے والد عروہ بن زبیر اسدی، چچا عبد اللہ ابن زبیر، دونوں بھائی عبد اللہ بن عروہ، عثمان بن عروہ، چچا زاد بھائی عباد بن عبد اللہ بن زبیر، ان کے بیٹے یحییٰ بن عباد، بیوی فاطمہ بنت منذر، عمر بن خزیمہ، عوف بن حارث بن طفیل، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف، محمد بن منکدر، وہب بن کیسان، صالح بن ابو صالح سمان، عبد اللہ بن ابو بکر بن حزم، عبد الرحمٰن بن سعد، محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی، محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباسؓ

[1] طبقات ابن سعد [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۴۷

وغیرہ سے روایت کی ہے۔[۱]

(۱۰) موسیٰ بن عقبہ مدنی متوفی ۱۴۱ھ مولیٰ آل زبیر، صاحب المغازی، مدینہ منورہ کے فقیہ و مفتی تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے، ام خالد بنت خالد اموی صحابیہ سے روایت کی ہے، نیز اپنے نانا ابوحبیبہ مولیٰ زبیر، حمزہ بن عبداللہ بن عمرؓ، سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، اعرج، نافع بن جبیر، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ، نافع مولیٰ ابن عمر، کریب، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، محمد بن منکدر، عروہ بن زبیر، زہری وغیرہ سے روایت کی ہے، ثقہ محدث و فقیہ اور مغازی کے زبردست عالم و مصنف ہیں، امام مالک اپنے تلامذہ کو ان کی کتاب المغازی سے استفادہ کی تاکید کرتے تھے، اور اس کو اصح المغازی کہتے تھے، امام مالکؒ کا ایک قول یہ ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے کبرسنی میں یہ کتاب لکھی ہے اور دوسروں کی طرح اس میں اطناب و اکثار نہیں ہے، محمد بن طلحہ ابن طویل کا قول ہے کہ مدینہ منورہ میں ان سے بڑا مغازی کا عالم نہیں تھا۔[۲]

(۱۱) محمد بن عمرو بن علقمہ لیثی مدنی متوفی ۱۴۴ھ نے اپنے والد عمرو بن علقمہ، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، عبیدہ بن سفیان، سعید بن حارث، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، عمر بن اکیمہ لیثی، محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی، واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ، خالد بن عبداللہ بن حرملہ، عبدالرحمٰن بن یعقوب، عمر بن حکم بن ثوبان، سعد بن سعید انصاری، یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب وغیرہ سے روایت کی ہے، امام مالکؒ نے موطأ میں ان سے روایت کی ہے، کثیر الحدیث تھے۔[۳]

(۱۲) حریث بن ذباب مدنی متوفی ــــھ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور ان سے محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی نے روایت کی ہے۔[۴]

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۸۴۔ ۲۔ ایضاً ج ۱۰ ص ۳۶۰، العبر ج ۱ ص ۱۴۲

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۷۵ ۴۔ تاریخ کبیر ج ۱ قسم ۲ ص ۱۱۰، کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ۲ ص ۲۶۲

فی الحال ابو معشر کے چند شیوخ و اساتذہ کے یہ نام سامنے آگئے ہیں جن میں اس دور کے مروجہ
ہ و فنون کے کاملین اور نمایاں مقام کے مالک ہیں، تلاش و جستجو کے بعد ان میں بہت کچھ اضافہ
سکتا ہے۔

ب و تلامیذ | امام ابو معشر کے اصحاب و تلامیذ کا حلقہ بھی ان کے شیوخ و اساتذہ کی طرح بہت
ع ہے، جن میں حفاظ حدیث، ائمہ جرح و تعدیل، اہل فقہ و فتویٰ اور اصحاب سیر و مغازی سب ہی
ل ہیں، چند حضرات کے نام یہ ہیں:

(١) سفیان بن سعید ثوری، ابو عبداللہ کوفی متوفی سنہ ١٦١ھ امیر المومنین فی الحدیث، ابو معشر سے
ے بصرہ میں فوت ہوئے۔

(٢) عبدالرحمٰن بن مہدی عنبری، ابو سعید بصری متوفی سنہ ١٩٨ھ مولیٰ بنی عنبر یا مولیٰ بنی ازد،
ح و تعدیل کے امام ہیں۔

(٣) عبدالرزاق بن ہمام حمیری، ابو بکر صنعانی متوفی سنہ ٢١١ھ مولیٰ حمیر، صاحب المصنف۔

(٤) وکیع بن جراح، ابو سفیان کوفی متوفی سنہ ١٩٦ھ، امام ابو حنیفہ کے شاگرد اور امام شافعیؒ کے
اد ہیں۔

(٥) لیث بن سعد فہمی، ابو الحارث مصری متوفی سنہ ١٧٥ھ مولیٰ بنی قیس، اصفہانی الاصل اور
مصر کے شیخ و عالم ہیں۔

(٦) سعید بن منصور، ابو عثمان خراسانی مکی متوفی سنہ ٢٢٧ھ صاحب السنن، ایک واسطے سے
بخاری کے استاد ہیں۔[١]

(٧) محمد بن عمر، ابو عبداللہ واقدی مدنی متوفی سنہ ٢٠٧ھ مولیٰ بنی اسلم، مشہور محدث و مورخ

ان کے مفصل حالات ہماری کتاب مآثر و معارف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اور بغداد کے قاضی ہیں۔

(۸) منصور بن ابی مزاحم بشیر، ابو نصر ترکی بغدادی متوفی ۲۳۵ھ مولی ازد۔

(۹) محمد بن بکار بن ریان ہاشمی، ابو عبداللہ متوفی ۲۳۸ھ مولی بنی ہاشم، صحیح مسلم میں ان کی حدیثیں مروی ہیں۔

(۱۰) محمد بن سوار، سدوسی عنبری، ابو الخطاب بصری متوفی ۲۳۱ھ، ان کے واسطے سے امام ترمذی نے ابو معشر سے روایت کی ہے۔

(۱۱) بشیر بن ولید، ابو الولید کندی متوفی ۲۳۸ھ صاحب القاضی ابو یوسف، احناف کے ایمہ کبار میں سے ہیں، مہدی اور مامون کے دور میں قاضی تھے۔

(۱۲) عبداللہ بن مبارک حنظلی تمیمی، ابو عبدالرحمن مروزی متوفی ۱۸۱ھ مولی بنی تمیم۔ شیخ الاسلام، ان کی کتاب الزہد والرقائق میں ابو معشر سے روایت موجود ہے۔

(۱۳) یزید بن ہارون، ابو خالد واسطی متوفی ۲۰۶ھ مولی بنی سلیم، ثقہ وصالح حفاظ محدثین میں ہیں۔

(۱۴) عاصم بن علی، ابو الحسن واسطی متوفی ۲۲۱ھ مولی بنی تیم، واسط میں انتقال کیا۔

(۱۵) عبداللہ بن ادریس اودی زعافری، ابو محمد کوفی متوفی ۱۹۲ھ، اہل مدینہ کے فقہی مسالک پر فتویٰ دیتے تھے۔

(۱۶) عثمان بن عمر عبدی، ابو محمد بصری متوفی ۲۰۸ھ، ایک قول کے روسے بخاری الاصل ہیں۔

(۱۷) ہاشم بن قاسم، ابو نصر لیثی بغدادی متوفی ۲۰۶ھ، اہل بغداد ان کے وجود پر فخر کرتے تھے۔

(۱۸) ہشیم بن بشیر، ابو معاویہ بن ابی حازم واسطی متوفی ۱۸۳ھ مولی بنی سلیم ایک قول کے مطابق بخاری الاصل ہیں۔

(۱۹) ہوذہ بن خلیفہ، ابو الاشہب ثقفی بصری متوفی ۲۱۵ھ. امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں،

(۲۰) انس بن عیاض، ابوحمزہ لیثی مدنی متوفی ۲۰۰ھ، نہایت ثقہ کثیر الحدیث عالم ہیں۔

(۲۱) فضل بن دکین، ابونعیم کوفی متوفی ۲۱۹ھ نے امام ابوحنیفہ سے بہت زیادہ روایت کی ہے۔

(۲۲) سلیمان بن داؤد، ابوالربیع زہرانی بصری متوفی ۲۳۴ھ بغداد میں قیام کرتے تھے۔

(۲۳) محمد بن معروف، ابوغسان لیثی مدنی متوفی ۱۶۳ھ، عسقلان میں رہتے تھے۔

(۲۴) حجاج بن محمد الاعور، ابو محمد مصیصی متوفی ۲۰۶ھ مولیٰ سلیمان بن مجالد، ترمذی الاصل، بغداد میں رہتے تھے، بعد میں مصیصہ چلے گئے تھے۔

(۲۵) محمد بن ابومعشر سندی، ابوعبد الملک بغدادی متوفی ۲۴۷ھ اپنے والد ابومعشر کے تمام الاصحاب ہیں[1]

(۲۶) علی بن مجاہد کابلی، ابو مجاہد کندی متوفی ۱۸۰ھ صاحب کتاب المغازی مولی کندہ۔

(۲۷) اسحاق بن قیس، طبری نے تاریخ میں اسحاق بن قیس عن ابی معشر کی سند سے متعدد روایات بیان کئے ہیں۔

امام ابومعشر کے تذکرہ نویس علماء نے روی عنہ کے ذیل میں ان کے بعض تلامذہ کے نام لکھ کر طائفۃ واٰخرون اور وغیرہم لکھ دیا ہے، سر دست یہ چند نام سامنے کے ہیں ورنہ ان کے تلامذہ اور اصحاب کی فہرست طویل ہے۔ (باقی)

---

[1] ان حضرات کے حالات کے لیے تہذیب التہذیب، طبقات ابن سعد، معارف ابن قتیبہ وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کے نزدیک نبوت اور وحی کے دلائل

رابطۂ عالم اسلامی سے ایک کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین"

مؤلفہ استاذ نذیر حمدان موصول ہوئی ہے، مذکورۂ بالا عنوان اس کتاب کے پہلے باب کا ایک حصہ ہے

اس کی تلخیص ذیل میں درج ہے۔

مستشرقین نے نبوت اور وحی کے جو دلائل بیان کیے ہیں ان میں پہلی دلیل کا تعلق ایمان باللہ کے عقیدہ سے ہے۔

اسلام میں ایمان باللہ کی اولین بنیاد توحید کا عقیدہ ہے، یہ اپنی خصوصیات اور تفصیلات کے ساتھ اس قدر ستھری اور نکھری ہوئی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایسی صورت میں نہیں تھا، یہاں تک کہ ان حنفاء کے یہاں بھی امتداد زمانہ سے توحید کا عقیدہ خالص نہیں رہ گیا تھا جو ملت ابراہیمی کے تبع سمجھے جاتے تھے، وہ اگرچہ خدائے واحد کو زمان و مکان اور جسم و جہت سے منزہ سمجھتے تھے لیکن اس کی حاکمیت، تشریع اور تجرید کے بارہ میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا،

اسی طرح تورات میں الٰہ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ عام اور ہمہ گیر نہیں ہو سکا، بلکہ یہ صرف بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔

موجودہ اناجیل کی توحید میں تثلیث کا تصور ہے، ان میں تین اقانیم کا اعتبار کیا گیا ہے جو الگ

ہو جاتے ہیں اور ان کا مجموعہ بھی خدا کہلاتا ہے، اسی لیے حضرت مسیح کی ذات کے متعلق عیسائی فرقے ہو گئے ہیں۔

بعثت نبویؐ سے قبل توحید سے متعلق اسی قسم کے تصورات لوگوں میں رائج تھے، لیکن اسلام اور اسلامؐ نے ان سے الگ توحید کا ایسا نیا تصور پیش کیا جس کو نہ آپؐ نے تورات و انجیل میں پڑھا اور نہ کسی حنیفی (ملت ابراہیمی کے تبع) سے سیکھا تھا، چونکہ یہ تصور اور عقیدہ عین بشری میلانات انسانی فطرت کے مطابق تھا، اس لیے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور نبوت کی ایک ہے۔

اسی حقیقت کو مشہور مستشرق کونٹ ہنری ڈی کاسٹری نے اپنی کتاب "اسلام شخصیات اور رات" میں بھی بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اس بات کو باور کرنا محال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فکر و تصور کے داعی تھے، اسے آپؐ نے تورات اور انجیل کے مطالعہ سے حاصل کیا تھا، کیونکہ آپؐ نے یہ کتابیں پڑھی ہوتیں تو آپؐ نے تثلیث کی تردید ضرور کی ہوتی، کیونکہ یہ آپؐ کی فطرت اور ان کے سراسر خلاف چیز تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عقیدہ کا ظہور خود آپ کی زندگی کا نہایت عالیشان واقعہ ہے جو بذات خود آپ کے سچے اور صادق و امین نبی ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے آپ اور اسلام ص ۴۲) نیز یہی اسلام کے برحق ہونے کی غالباً سب سے واضح دلیل بھی ہے کیونکہ اسلام میں توحید کا جو عقیدہ ہے اس سے یہ دوسرے مذاہب سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے۔

اسلام میں معبود صرف ایک ہی ہے، اسی کی ہم عبادت اور پیروی کرتے ہیں، ہمارے نزدیک سب سے اہم اور مقدم یہی عقیدہ ہے، کوئی ہستی بھی اتنی مقدس اور پاکیزہ نہیں ہے کہ ہم اس کو خدا کا مثیل اور ساجھی بنائیں، یہ کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے ایسی پستی بے وقوفی پر اتر آئے اور ایسے اوہام و خرافات کو اپنا عقیدہ بنائے جو اس کی نگاہوں سے

اس کے اس مقدس باپ (خدائے قہار) کو اوجھل کردیں، جو اپنے بندوں اور مخلوقات سے ہر وقت متصل اور جڑا ہوا رہتا ہے، خواہ یہ بندے اس کے نافرمان اور باغی ہوں یا مطیع و فرمانبردار۔

۲. قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں ہے

عربی زبان وادب کے ماہر مستشرقین اسلوب اور مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ان کا اسلوب بیان بھی مختلف ہے، اور معانی و محتویات کے اعتبار سے دونوں کے مضامین بھی جدا جدا ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے ایسا معجزانہ ہے جو اس کے کلام ربانی ہونے کا پتہ دیتا ہے، اور حدیث کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک فائق و برتر انسان کی قوت بلاغت کا نمونہ ہے، اسی طرح قرآن کے مضامین و مطالب زیادہ تر عام اور کلی نوعیت کے ہوتے ہیں، جب کہ حدیث کے مندرجات و مشمولات قرآن کے بنیادی احکام کی تفصیل، توضیح اور تشریح پر مبنی ہوتے ہیں گو کہیں کہیں اس میں بعض نئے احکام و قوانین بھی پائے جاتے ہیں، قرآن مجید نے برابر چیلنج کیا ہے اور ہمیشہ کرتا رہیگا کہ لوگ لفظاً و معناً اس کے جیسی کوئی کتاب پیش کریں، اس سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسی وحی ہے جس کا سرچشمہ کوئی بالاتر ہستی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ڈاکٹر لورا ویشیا واگلیری نے بھی ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا معجزہ اس کی بلاغت ہے اور اس کی وہ خبریں ہیں جو اس کی سورتوں اور آیتوں میں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، جو تواتر و تسلسل کے ساتھ نقل ہوتا چلا آرہا ہے اور اس کے واقعات پورے یقین اور کامل وثوق کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس برحق کتاب کی نقل و حکایت کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی تمام آیتیں بلاغت کے یکساں معیار پر ہوتی ہیں، اور وہ ایک موضوع چھوڑ کر دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہوجاتا ہے، مگر اس کا زور بیان برقرار رہتا ہے، ہم کو اس کے اندر گہرائی کے ساتھ شیرینی بھی ملتی ہے حالانکہ عموماً یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتیں، ایسی معجزانہ کتاب کے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اختراع قرار دینا بعید از عقل ہے، کیونکہ آپ ایک عرب امّی تھے۔"

(اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۵)

مستشرق ایٹین ڈینہ لکھتا ہے کہ :

"قرآن کا اعجاز اس انداز کلام ہے جس کو اختیار کرنا بڑی سی بڑی علمی وادبی اکیڈمی کے امکان سے باہر ہے، اور یہ اس کے اعجاز ہی کا نتیجہ ہے کہ گو عربی زبان ساری دنیا میں پھیل چکی ہے لیکن اگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صحابی دوبارہ تشریف لائیں تو انھیں عربی زبان بولنے والوں کی باتیں سمجھنے اور مختلف قبیلوں سے باتیں کرنے میں کوئی دقت اور دشواری نہ پیش آئے گی، اس کے برخلاف اگر پندرھویں صدی کے فرانسیسی رابیلے کا کوئی معاصر آج کے فرانسیسی لوگوں کی بڑی تعداد سے تخاطب کرے تو اسے بڑی دشواری پیش آئے گی، حالانکہ پندرھویں صدی قرآن کی صدی کے مقابلہ میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔

گو قرآن کی زبان کے اصول وضوابط صدیوں پہلے مرتب و مدون کیے جا چکے ہیں، مگر اس میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ موجودہ ایجادات اور نئی نئی اختراعات کی تعبیر سے نہ تو عربی زبان قاصر ہے اور نہ اس کی وجہ سے اس کی روانی اور سلاست میں کوئی فرق آ سکتا ہے۔

(اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۵) -

قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی تاریخ بھی تائید کرتی ہے۔

جس طرح بعض مستشرقین کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونا اور گذشتہ آسمانی کتابوں سے کوئی خوشہ چینی نہ کرنا ثابت ہے، اسی طرح وہ اسے بھی تسلیم کرتے ہیں اور تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ قریش میں سے اکثر لوگ قرآن کی اثر انگیزی اور دلآویزی کی وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے، انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر پر اتاری گئی ہے، اس لیے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے، گذشتہ طویل تاریخ اس کی بھی شہادت دیتی ہے کہ قرآن مجید کا نقل نہایت صحیح ہے،

اور ہر قسم کے مادی انقلابات اور گوناگوں فکری رجحانات کے رونما ہونے کے باوجود وہ ہر قسم کے تغیر و تحریف سے محفوظ ہے، آج مسلمان جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جو آنحضرتؐ پر اتارا گیا تھا، کیا یہ بات خود ایک معجزہ نہیں ہے کہ تاریخ کے گوناگوں واقعات وحوادث کے باوجود مسلمان قرآن کی تلاوت میں اس کے اسی طریقہ کو مشروع سمجھتے ہیں جس طریقہ پر یہ آنحضرتؐ پر وحی کے ذریعہ سے اتارا گیا تھا، یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ موجودہ دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی کا اس کے ایمان ہے، اور اس تعداد میں برابر اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

قرآن مجید کے اس اعجاز کی طرف بہت سے مستشرقین بھی مائل ہوئے اور انھوں نے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی ہے، کاؤنٹ ہنری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ عقل حیران ہے کہ اس طرح کی آیتیں بھلا ایک امی شخص کس طرح بیان کرسکتا ہے، سارے مشرق کو اعتراف ہے کہ لفظاً و معنیً ایسی آیتیں پیش کرنے سے انسانی فکر قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ عتبہ بن ربیعہ نے قرآن کی جب آیتیں سنیں تو وہ مبہوت ہوگیا، قرآن کی عظمت کے لیے یہ کافی ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب اس کے سامنے سرنگوں ہوگئے اور خدا پر ایمان لائے، اور جعفرؓ بن ابی طالب نے جب نجاشی کے سامنے قرآن کی ایک سورہ کی تلاوت کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، کوزان ڈی بیر سوبچال نے اس طرح کی تمام روایتوں کو نقل کیا ہے۔ (یورپ اور اسلام ص ۴۲)

ڈاکٹر لورا ویزیا قرآن کے الہامی اور امتداد زمانہ کے باوجود اب تک ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتی ہیں "ہمارے نزدیک قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نازل کیے جانے کے بعد سے اب تک ہر قسم کی تحریف و تغیر سے محفوظ ہے اور اللہ کے حکم سے وہ آیندہ بھی ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۷)

۴. <u>قرآن کے قوانین کی جامعیت</u> | قرآن مجید کا مکمل وجامع قانون و دستور ہونا بھی نبوت محمدیؐ کی تائید کا ایک

ہے، کیونکہ خواہ کوئی شخص حیرت انگیز قانونی ذہن و دماغ اور غیر معمولی قانونی مہارت ہی رکھتا ہو، اس درجہ مکمل شریعت اور جامع قوانین پیش نہیں کرسکتا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، آپؐ نے نہ تو شرائع و قوانین کی کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی انسانی حقوق ت کی کسی کتاب سے آپؐ کو واقفیت تھی، ایسی صورت میں آپؐ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ایسا یش کر دیں جو انسان کی دنیوی و اخروی زندگی کے لیے مکمل لائحۂ عمل اور جامع دستور ہو۔

آپؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں متعدد آسمانی و انسانی قوانین رائج تھے، قانونِ حمورابی سے انون روما تک موجود تھے، گذشتہ انبیاؑ کی شریعتیں بھی تھیں، جن میں حق، عدل، نظام حکومت، اور فرائض کے کلی و جزئی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی تھی، اور ان کے علاوہ بہت سے قوانین ح محو اور معدوم ہو جانے کے قریب ہو گئے تھے، ان کے مقابلہ میں اسلام کے نظام قضاء، حکومت اور اس کی اقتصادی، مالیاتی اور فوجی تنظیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی قانون و ت کسی شخص کے ذہن و فکر کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر خدا کے سارے احکام موجود ہیں، الہام رسول اللہؐ پر ہوا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت و صداقت کی یہی دلیل ہے کہ آدمی کے احترام، مساوات، رواداری، مسلم و غیر مسلم کے تعلقات اور امن و جنگ کے زمانے کے احکام کے اسلامی حکومت کے متعلق ضوابط چودہ سو برس سے دنیا میں رائج چلے آرہے ہیں، اور آئندہ بھی ، رہیں گے۔

تمدنی اور تہذیبی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم، مکارم اخلاق، عقل، اثبات حق اور عام انسانی معاملات کی جانب توجہ کرنے کی جو دعوت دی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے احکام اور تمدنی افکار آپؐ کو خدا کی جانب سے عطا کیے گئے تھے۔

ویانا یونیورسٹی کے لا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شیرل نے ۱۹۲۷ء میں قانون دانوں کی ایک کانفرنس میں کہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے امی ہونے کے باوجود کئی صدی پیشتر دنیا کو ایک ایسا مکمل قانون اور جامع دستور عطا کیا تھا جس کی بلندی پر اگر ہم یورپ والے دو ہزار برس بعد بھی پہونچ جائیں تو خوش قسمت ہوں گے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۹۶)

ایک ولندیزی مستشرق ڈاکٹر کرسٹان اسنوک ہرجرنج نے ہالینڈ کی حکومت کے کونسلر کی حیثیت سے ستر برس مشرقی ہند میں گذارے، اور تقریباً ربع صدی تک اس نے اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی، اس عرصہ میں اس کو اسلامی قوانین کے مطالعہ کا موقع بھی ملا، اس نے ان ملکوں کی دینی تحریکوں کا جائزہ بھی لیا، وہ رقمطراز ہے کہ "عیسائی مشنریوں کو امید ہے کہ تمام مذاہب ان کے اندر ضم ہو جائیں گے لیکن اسلام کے بارہ میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ ایک طاقتور، متحرک اور فعال مذہب ہے اور اس کے احکام و قوانین انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے سے متعلق ہیں، ڈاکٹر شبلی شمیل کا کہنا ہے کہ قرآن نے جو اجتماعی اصول بیان کیے ہیں وہ عام اور ہمہ گیر ہیں، اور ان کے اندر نرمی اور لچک بھی ہے، اس لیے وہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے مناسب اور موزوں ہیں۔

قرآن مجید نے انسان کے لیے دنیا و آخرت دونوں کے دروازے وا کر دیے ہیں، اور اس کے جسم و روح دونوں کی ترقی کے اسباب و وسائل مہیا کر دیے ہیں، جب کہ دوسرے مذاہب نے علم و ترقی کے دروازے مسدود کر کے آدمی کو اس دنیائے فانی سے بالکل دامن کش اور بیزار رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۱۲)

۵. اسلام کی دوامی اور استمراری حیثیت اور اس کی مقبولیت صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اپنی اصلی حالت اور حقیقت پر اسلام کا باقی اور پائدار رہنا در اصل اس کے ہر زمانہ کے لیے مناسب اور سازگار ہونے کی دلیل ہے، اس کی دعوت ماضی کی طرح حال و مستقبل میں بھی قائم اور پائیدار رہے گی،

لوگ گرم جوشی سے قبول و اختیار کرتے ہیں، اور اس کے آئین و احکام کی پابندی کرنے کے لیے
نار رہتے ہیں، یہ اس کے کامل و مکمل دین ہونے کا ثبوت ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ
کے سوا دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی دعوت کو شوق، رغبت اور محبت کے
بول کرنے والوں کی تعداد میں اس طرح روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہو اور وہ اس کی تبلیغ و اشاعت
ر اپنی جان تک قربان کر دینے میں کوئی دریغ محسوس نہیں کرتے، مستشرق اٹین ڈینہ نے اس
زیادہ موثر طریقہ پر بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے: "گذشتہ چند برسوں میں یورپ کے مختلف علاقوں
ت سے عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، لندن اور لیور پول میں صحیح اسلامی
ا رکھنے والی بعض جماعتوں کے اندر سرکردہ نومسلم انگریز بھی شامل ہیں۔ (مشرق مغرب کی نظر میں
یورپ اور اسلام ص ۲۱۲) اس کا یہ بھی خیال ہے کہ جو عیسائی دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں
وہ یورپ کے یا امریکہ کے ہوں، ان سب کا تعلق خواص کے طبقے سے ہے، ان کے اخلاص اور
یتی میں کوئی شبہ نہیں، ان کے پیش نظر کوئی مادی غرض نہیں ہے، اس نے مثال میں ایک انگریز
ہیڈلی اور ایک مسیحی شر مسنی کا نام بھی دیا ہے، عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں اب ایسی کتابیں
ب کی جا چکی ہیں، جن میں ہزاروں افراد اور جماعتوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کے ناموں
ہرست درج ہے، اس فہرست میں مرد اور عورتوں دونوں کے نام ہیں۔

گستاپ لیبان کہتا ہے کہ قرآن کی حیثیت ایک دینی، سیاسی اور اجتماعی قانون کی ہے، اس کے
م کا نفاذ دس صدیوں سو زیادہ عہد سے ہے گبن کہتا ہے کہ بحر اوقیانوس اور اٹلانٹک کے ساحلوں سے
لر دریائے جانجس تک قرآن کو ایک اساسی دستور کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے، اس کے اندر
ت دین کے اصول ہی بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ جنایات اور شہری زندگی کے احکام اور وہ
نین بھی بیان کیے گئے ہیں جن پر اسلامی طرز زندگی کا دار و مدار ہے (اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۰۰)

جو لوگ اسلام کو جھوٹا اور غلط مذہب قرار دینے پر مصر ہیں ان پر اظہار تعجب کرتے ہوئے کارلائل لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پیغام کی دعوت دی ہے وہ کروڑوں انسانوں کے لیے چودہ سو برس سے آفتاب درخشاں کے مانند جگمگا رہا ہے، بھلا کیسی جھوٹے کا جھوٹ اور مکار کا فریب ہو سکتا ہے، اگر جھوٹ، فریب، گمراہی اور ضلالت کا اتنے بڑے پیمانے پر رواج ہو جائے تو زندگی بے سود، عبث اور معدوم ہو جائے گی۔

۲۔ بعثت سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور امانت کی اس قدر شہرت ہو گئی تھی کہ آپؐ امین کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، مستشرقین نے آپؐ کے اس لقب پر اتنا زور دیا ہے کہ بعض لوگوں کو آپؐ کا نام ہی مشتبہ ہو گیا ہے اور وہ آپؐ کے اصلی نام (محمدؐ) کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔

جھوٹ خواہ اپنے اوپر گھڑا جائے یا دوسروں کے خلاف افترا پردازی کی جائے یہ دونوں ہی صورتیں ایک ایسی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں جو دنیا کو اپنی روشنی سے منور کرنا چاہتی ہے، اور کسی بھی داعی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت کی کامیابی کی خاطر اپنے لوگوں میں یا دوسروں کے سامنے مستقل اور مسلسل کذب و دروغ سے کام لے، کارلائل کہتا ہے :۔

"کیا کوئی جھوٹا آدمی جو تعمیر کے مختلف قسم کے ساز و سامان اور ان کی خصوصیات سے ناواقف ہو اینٹوں کا کوئی مکان بنا سکتا ہے، اگر وہ بنائے بھی تو بے ڈھنگے ساز و سامان کا ایک ڈھیر ہی تو ہوگا، ایسی صورت میں تمہاری اس شخص کے متعلق کیا رائے ہوگی جس نے ایسی عمارت بنائی ہے جس کے ستون گذری ہوئی متعدد صدیاں ہیں اور اس کے اندر لاکھوں کروڑوں انسان رہ رہے ہیں، اس بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا، ریاکار، نمائش پسند اور حیلہ ساز سمجھنا انتہائی غلط ہے، آپؐ نے کسی مقصد یا لالچ کی خاطر کبھی غلط وسائل و ذرائع نہیں اختیار کیے، آپؐ نے جو پیغام دنیا کو پہونچایا

وہ سچا اور برحق تھا، اور آپ کا کلام بھی ایک صدائے حق تھا جو ناصلم عالم سے ظاہر ہوا تھا، اس نے ساری دنیا کو روشن کر دیا تھا، یہ سب کچھ خدا کے حکم اور فضل سے ہوا، اور اللہ اپنا فضل جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔"

دوسری جگہ کارلائل آپ کے اوصاف و خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رہن سہن، اکل و شرب، لباس اور پوشاک اور دوسرے تمام معمولات و معاملات میں نہایت سادگی پسند تھے، آپ کی غذا عموماً پانی اور روٹی ہوتی، مہینوں گذر جاتے مگر آپ کے گھر میں چولھا بھی نہیں جلتا تھا، کیا اس سے بڑھ کر بھی عزت و فخر کے لائق کوئی بات ہوسکتی ہے، محمد قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایسی سادہ زندگی بسر کی اور اللہ کے دین کی اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا اور لوگ جن چیزوں کی حرص و طمع کرتے ہیں، یعنی عہدہ، منصب، حکومت اور دولت اِن، انھوں نے ان چیزوں کی کبھی طمع نہیں کی۔"

مستشرقین نے ان کے علاوہ بھی آپ کی نبوت کے دوسرے دلائل بیان کئے ہیں جو احادیث سے ماخوذ و مستنبط ہیں، یا ان کا تعلق ان بشارتوں سے ہے جن کا ذکر گذشتہ آسمانی کتابوں میں ہے، یا غیب کے بارہ میں آپ کی پیشین گوئیوں سے ہے۔

وحی الٰہی کی صورتیں اور قسمیں

دلائلِ نبوت اور اقسام وحی کے مسئلہ میں معتبر اور اعتدال پسند مستشرقین ان اسلامی مصادر و مآخذ پر اعتماد کرتے ہیں جو کتب احادیث و سیر سے ثابت ہیں، اور گذشتہ نبیوں اور پیغمبروں کے حالات و سوانح کے سلسلہ میں ان کا دار و مدار تاریخ کے واقعات و حقائق پر ہوتا ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے نفسیات اور علم الاجتماع کے مطالعہ اور ذاتی رائے کو بھی شامل کر دیتے ہیں، پس جن مباحث میں ان کا اعتماد ثابت اور تسلیم شدہ اسلامی مآخذ پر ہوتا ہے وہ یقیناً قابلِ قبول ہیں، ان میں کسی بحث و کلام یا اختلاف و نزاع کی گنجائش نہیں، رہا نبوت کے بارہ میں ان کا

تاریخی حقایق پر اعتماد تو اس سے بھی ان کے دلائل وشواہد کو تقویت حاصل ہوتی ہے، مگر جب وہ ان اندر اپنے ذاتی اجتہاد و تاثر اور جائزہ و مطالعہ کو بھی شامل کر دیتے ہیں تو اس وقت قیل وقال، رد و اور بحث و نزاع کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے، اسی بنا پر نبوت اور وحی کی قسموں کے بارہ میں مستشر کے کئی موقف ہو گئے ہیں۔

۱۔ محمد رسول اللہؐ | مستشرقین کی کتابوں میں رسولؐ کی نبوت اور وحی کی مختلف قسموں جیسے رویاے صا اور حضرت جبرئیلؑ کی لائی ہوئی وحی پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، ایٹین ڈینیہ نے رسول اللہؐ کی خلوت ا تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آپؐ کے قلب کو مصفّٰی و مجلّٰی بنا دیتی تھی، اور دنیا کے مشاغل اسے پاک وصاف کر دیتی تھی،..... رویائے صادقہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی ا علیہ وسلم سچے اور روشن خواب دیکھتے تھے، اور آپ کو ایسی ندا سنائی دیتی تھی جس کے متعلق آپ کو نہیں ہوتا تھا کہ یہ کہاں سے آرہی ہے ..... وحی کے بارہ میں وہ بیان کرتا ہے کہ جب خدا رحمان کی رافت و رحمت اپنے بندوں پر نازل ہوتی ہے تو وہ ان کے پاس اپنے رسول کے ذر سے وحی بھیجتا ہے، ..... ایک یادگار رات یعنی شب قدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے دنی آسمان پر نازل کیا گیا ...... اسی مبارک شب میں قرآن کی پہلی آیتیں حضرت محمد صلی اللہ ع وسلم پر اتاری گئیں..... حضرت جبرئیلؑ کو حضرت محمدؐ نے دیکھا، یہ وہی فرشتے ہیں جو خدا نبی حضرت دانیالؑ اور حضرت مریمؑ کے پاس بھی آئے تھے، ...... حضرت جبرئیلؑ آنحضر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف شکل وصورت میں تشریف لاتے تھے۔

پھر وہ صحیح حدیثوں کی روشنی میں حضرت جبرئیلؑ کی ان سب مختلف صورتوں کا ذکر کرتا۔

قرآن مجید حضرت محمدؐ کی تصنیف نہیں ہے۔ | قرآن مجید کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہ ہونا ایک مسلمہ تا حقیقت ہے، لیکن اس کے برعکس بعض مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ آنحض

صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ قرآن کا اختراع ہے، یا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی جولانی طبع اور باطنی عقل وبصیرت کے فیضان کا ایک مظہر ہے، اور وہ خدا کی وحی والہام نہیں ہے۔

اٹین ڈینیہ لکھتا ہے کہ میرے لیے یہ سخت تشویش اور پریشانی کی بات ہے کہ بعض مستشرقین یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ نے غار حرا کی تنہائی اور فرصت میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کیا اور اسی میں آپ کو قرآن کی تصنیف وتالیف کا خیال ہوا، کیا واقعی انھوں نے ایسا کیا؟ تو پھر کوئی اور کتاب اس سے پہلے کہاں ایسی مرتب ہوئی، خود اس کی ہر سورہ دوسری سورہ سے الگ ہے، اور اس کی سورتیں آپ کو نبوت ملنے کے بعد کسی خاص واقعہ کے سلسلہ میں بیس برس سے زیادہ طویل مدت میں نازل ہوئی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کا پہلے سے متوقع رہنا اور ان کا مشاہدہ کر لینا کیسے ممکن تھا، .... درحقیقت قرآن مجید ایک اعجاز ہے جو رسول اللہ صلعم کو بخشا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاء کو وقتی معجزات عطا کیے گئے تھے، اور وہ بہت جلد فراموش بھی کر دیے گئے، مگر قرآنی آیات کا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، اس کی اثر آفرینی دائمی ہے، اور یہ ہمیشہ موثر رہے گا، بندۂ مومن کے لیے کسی بھی جگہ اور کسی بھی زمانہ میں محض قرآن کی تلاوت کر کے اس معجزہ کا مشاہدہ کر لینا آسان ہے، .... قرآن ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں، یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس کی واضح اور روشن آیتوں کو اللہ نے املاء کرایا۔ (محمد رسول اللہ۔ مصنفہ اٹین ڈینیہ حصہ اول، ص ۱۰۹)

ول ڈیورانٹ سیرت وحدیث کی کتابوں پر اعتماد وانحصار کرنے کے باوجود ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی نقل کر دیتا ہے، نیز بعض دور از کار اور جہالت پر مبنی چیزیں تحریر کرنے میں بھی اسے تکلف نہیں ہوتا، جو قاری کو شک وخلجان میں مبتلا کر دیتی ہیں، وہ لکھتا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب چالیس برس کے قریب ہوئی تو آپ کا دینی امور میں انہماک بہت بڑھ گیا، جب رمضان کا مہینہ آتا جو اشہر حرم[1] میں ہے تو آپ تنہا اور کبھی پورے خاندان کے ساتھ حرا پہاڑ پر تشریف لے جاتے، یہ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا، یہاں پہونچ کر شب و روز قیام فرماتے اور روزہ، نماز اور غور و فکر میں وقت گذارتے۔ اسی اثناء میں جب کہ آپ غار میں تنہا معتکف تھے کہ ۱۱۰ء کو شب میں وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جو پوری اسلامی تاریخ کا محور بنا۔"

پھر ول ڈیورانٹ نے نزولِ وحی کی ابتداء کے بارہ میں ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے اور اس کے بعد کی چیزیں سیرت ابن ہشام کے حوالے سے تحریر کی ہیں۔ (قصۃ الحضارۃ ج ۲ ص ۲۴)

نبوت اور وحی کے مسئلہ میں مستشرقین کے مختلف نہج

نبوت اور وحی کے مسئلہ میں مستشرقین کی بحث و تحقیق کا نہج جدا جدا ہے، کبھی ان کا انداز خالص روایتی ہوتا ہے، کبھی وہ اپنی بحث کو دقیق و غامض بنا دیتے ہیں اور کبھی صرف ذاتی احساسات و تاثرات کا اظہار کرتے ہیں، بعض مستشرقین وحی کی صرف ایک ہی صورت پر بحث کرتے ہیں، مثلاً رویائے صادقہ کو مانتے ہیں، مگر حضرت جبرئیلؑ کے وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کو مستبعد قرار دیتے ہیں۔

(الف) بیڈلی کا بیان ہے کہ عمر زیادہ ہونے کے بعد غور و فکر کی وجہ سے آپ کے اندر عصبیت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، نیز کھانے پینے، چلنے پھرنے اور آزاد زندگی ترک کرنے اور روزے اور شب بیداری کے نتیجہ میں آپ کی صحت متاثر ہو گئی تھی، اس لیے نیم خوابی میں آپ کو عجیب و غریب

---

[1] یہ غلط ہے، اشہر حرم مندرجہ ذیل ہیں: ذو قعدہ، ذو الحجہ، محرم، رجب۔ رمضان ان میں شامل نہیں، سیرت ابن ہشام میں ہے کہ آپ ہر سال ایک مہینہ غار حرا میں مقیم رہتے، ابن ہشام نے رمضان کے مہینہ کی صراحت نہیں کی ہے۔

خواب دکھائی دیتے تھے، جو غنودگی اور غفلت کی کیفیت زائل ہونے کے بعد آپ کو اچھی طرح یاد آجاتے تھے۔" یہ بیان کرنے کے بعد وہ آپ کے پیغام کو اس طرح برحق ثابت کرتا ہے: "کسی یہودی، عیسائی اور بودھ نے اپنی نگاہ کے سامنے اپنے دین کو اس قدر معجزانہ سرعت کے ساتھ نشوونما پاتے نہیں دیکھا ہوگا، اور نہ کسی دوسرے دینی رہنما کو اپنی زندگی ہی میں اپنی دعوت کی کامیابی کو اس طرح دیکھنا نصیب ہوا ہوگا جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، بیڈلی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول اور اسلام آپ کا آخری دین ہے'.....آپ کا اصلی امتیاز وحی ہے، آپ جو کچھ کرتے تھے اس کی ہدایت آپ کو خدا کی طرف سے ہوتی تھی، آپ نہ فرشتہ تھے اور نہ آپ کی حیثیت عیسائیوں کے قدیس (سینٹ) کی طرح تھی، آپ کی زندگی طرز رہائش کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے ممتاز اور مختلف نہیں نظر آئے گی، آپ کے نام کا سکہ نہیں چلتا تھا، اور نہ آپ کے پاس دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔

(ب) فلپ ہٹی کے نزدیک وحی، خواب اور فکر کا نام ہے، مگر آخر میں وہ اسے حضرت جبرئیلؑ کی آواز بتاتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پے درپے ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے جن کی وجہ سے فکر و تامل آپ کی عادت ثانیہ بن گئی تھی، اسی غرض سے آپ ایک غار میں تشریف لے جاتے تھے جو مکہ کے شمال میں دو فرسنگ کے فاصلہ پر حرا پہاڑ کی بلندی پر تھا، یہاں آپ غور و فکر میں منہمک رہتے، اور وحی و الہام کے بھی منتظر رہتے تھے، چنانچہ اسی غار میں ایک روز آپ نے سونے کی حالت میں یہ آواز سنی:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. پڑھ اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ (علق: ۱)

یہاں تک کہ جب مدنی سورتیں نازل ہونا شروع ہوئیں تب بھی یہی آواز آپ کو سنائی دیتی تھی۔

اس کو مسلسل سننے کی وجہ سے آپ سمجھ جاتے تھے کہ یہ حضرت جبرئیلؑ کی آواز ہے" (تاریخ العرب ۱۵۰)

ہٹی کی کتاب کی ایک فصل کا عنوان ہے: "قرآن خدا کی کتاب ہے" اس میں وہ لکھتا ہے

"قرآن کا مطالعہ کرنے والے جدید علوم کے مبصرین اس کے موجودہ متداول نسخہ کے صحیح ہونے پر متفق ہیں، آج کے سارے قرآنی نسخے تقریباً حضرت زیدؓ کی اصل کے مطابق ہیں، نیز قرآن اپنی موجودہ شکل وصورت میں بعینہٖ وہی ہے جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوا تھا، مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید خدا کا وہ کلام ہے جس کو حضرت جبرئیلؑ نے حضرت محمدؐ کے سامنے پڑھا، اور یہ کلام لوح محفوظ میں تھا جو ساتویں آسمان پر ہے۔

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت نبوت کے کمالات کی طرح قانون سازی کے اوصاف کی جامع تھی، آپؐ میں امانت ودیانت کی خوبیاں بھی تھیں، اور آپؐ قضا اور قوت فیصلہ کے مالک بھی تھے، آپؐ فوجوں کے سپہ سالار اور ریاست وحکومت کے سربراہ بھی تھے۔"

(ج) ایک مستشرق ڈرمنگھم نے وحی کا ذکر بالکل افسانوی انداز میں کیا ہے، اس نے اپنی کتاب "حیات محمدؐ" میں بہت سی گمراہ کن اور باطل چیزیں جمع کی ہیں اور روایتوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ بھی کیا ہے، اس طرح خود اس کی کتاب میں افسانوی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

ڈرمنگھم نے وحی اور نبوت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں گو بعض باتیں صحیح ہیں مگر اکثر غلط اور بے بنیاد ہیں، اس نے صحیح اسلامی مآخذ ومصادر اور مستند تاریخی حقائق وواقعات پر انحصار واعتبار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی اجتہاد وتاثر پر زیادہ بھروسہ کیا ہے، نیز اس نے صحیح اور غلط حدیثوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

"تحریکِ خلافت"

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

مذکورہ بالا کتاب ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، وہ بستی کے نہ صرف ایک نامور وکیل تھے، بلکہ اپنی دینی حمیت کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اپنی ایمانی حرارت سے انجمن تعلیمات دین کی تنظیم کے ذریعہ سے اس ریاست میں دینی مکاتب کا جو جال بچھوا دیا، وہ ان کی زندگی کا بڑا روشن کارنامہ ہے، اس کام کے سلسلہ میں حکومت سے بھی بڑی دلیری کے ساتھ قانونی ٹکر لی اور اپنی بات منوائی، وہ شروع سے کانگریس کے وفادار اور گاندھی جی کے پرستار رہے، اس لیے ان کا شمار نیشنلسٹ مسلمانوں میں ہوتا تھا، جن کی خوبی یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان چاہے جتنی بھی پولیٹیکل کروٹ لیتے رہیں، وہ ہر حال میں کانگریس کی ہمنوائی کرکے اپنے کردار کی پختگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں، اس پختگی اور وضعداری کا نمونہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم بھی تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد نیشنلسٹ مسلمانوں نے اپنی خدمات کا صلہ مختلف طریقوں سے پایا، مگر قاضی صاحب مرحوم نے اپنے اعلیٰ کردار کا یہ بھی ثبوت دیا کہ حکومت سے اپنی خدمت اور قربانی کا صلہ وصول کرنا اپنی خودداری اور شان کے خلاف تصور کیا، اس حیثیت سے بھی وہ اپنے معاصروں اور ہم چشموں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

انھوں نے اپنی مذکورہ بالا کتاب خالص نیشنلسٹ مسلمان بن کر لکھی ہے، وہ شروع میں ایک صحافی تھے، پھر وکالت شروع کی تو آخر وقت تک وکیل ہی رہے، اس لیے اس کتاب میں ایک صحافی اور ایک وکیل ہی کا استدلالی رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس سے تصنیفی رنگ ماند پڑ گیا ہے، تصنیفی تقاضا تو یہ تھا کہ کتاب میں پہلے خلافت کی تاریخ لکھ کر اس کی نوعیت اور اہمیت بتائی جاتی، پھر ترکی میں خلافت کے خطرہ میں پڑ جانے سے ہندوستان میں جب تحریک چلی تو اس سلسلہ میں جو خلافت کانفرنس قائم ہوئی اس کی ابتدا کب ہوئی، اس کے خاتمہ تک اس کے کتنے کل ہند اور کتنے صوبائی اجلاس ہوئے ان اجلاسوں کے کون کون صدر ہوتے گئے، انھوں نے اپنے صدارتی خطبوں میں کن کن طریقوں سے مسلمانوں کو اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے ابھارا، ان اجلاسوں میں کیا کیا تجویزیں منظور ہوتی رہیں ان کو عمل میں کس طرح لایا گیا، عمل میں لانے کے سلسلہ میں مسلمانوں نے کیا کیا قربانیاں دیں، کتنے جیل گئے، کتنے گولی کا نشانہ بنے، اس تحریک کا تال میل تحریک ترک موالات سے کیوں اور کن کن طریقوں سے ہوتا رہا، اور پھر اس کی ناکامی کے اسباب کیا ہوئے، ان سب کی پوری تفصیلات لکھی جاتیں تو کتاب مکمل سمجھی جاتی۔

فاضل مؤلف نے ان سب کی طرف تھوڑے تھوڑے اشارے ضرور کیے ہیں لیکن ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اصل موضوع پر کتاب لکھ رہے ہیں یا اس سے ہٹ کر اپنے خاص خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، چنانچہ پہلے باب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک خطبۂ صدارت سے خلافت کی شرعی حیثیت ضرور بتائی گئی ہے، لیکن اس کی تاریخ نہیں لکھی گئی، حالانکہ فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ماضی اور حال کی تاریخ اور دونوں کی قدروں کا جائزہ نہ لیا جائے (ص ۱۹) دوسرے باب میں اس جائزہ کی کچھ جھلکیاں ضرور ہیں لیکن اس میں تاریخ نہیں، خلافت کی شرعی حیثیت دکھا کر یہ چونکا دینے والا بیان ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا

"تحریک خلافت کی قیادت ابتدا سے انتہا تک مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں رہی، بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہوگا کہ اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہوکر اس کا کل بار اپنے کندھوں پر نہ لے لیتے تو تحریک خلافت میں جو زور پیدا ہوا، وہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ (ص ۱۷)

یہ لکھ کر اور اسی کو بار بار دہرا کر فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب کو متنازعہ فیہ بنا دیا ہے اور اپنے ناظرین کو بہت کچھ کہنے کا موقع دے دیا ہے، وہ لکھتے ہیں، اور بالکل صحیح لکھتے ہیں کہ خلافت کا مسئلہ مذہبی تھا، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے ایک مذہبی مسئلہ کا کل بار اپنے کندھوں پر کیوں لے لیا، اگر انھوں نے مسلمانوں کی بے چینی سے متاثر ہوکر ان کے ایک مذہبی مسئلہ کی قیادت قبول کر لی تو پھر تحریک خلافت کے بعد مسلمانوں کے کسی مذہبی مسئلہ کی قیادت کرتے ہوئے تو نظر نہیں آتے اور نہ پھر مسلمانوں نے اپنے کسی مذہبی مسئلہ میں ان کی قیادت قبول کی۔

گاندھی جی کو خلافت تحریک کا مرد میدان (ص ۲۷) بتانا فاضل مصنف کی اس بے پناہ عقیدت کا خراج ہے جو ان کو گاندھی جی کی ذات سے تھی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس آزمائش میں ان کے محض معاون، حامی، ہمدرد، ہمنوا اور دوست بنے رہے، اس میں ان کے مصالح بھی تھے، وہ سچائی کے پرستار رہے، ان کے دل میں جو بات ہوتی وہ اپنے ہفتہ وار ینگ انڈیا میں برابر لکھتے رہتے، اسی لیے تحریک خلافت پر ینگ انڈیا میں لکھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ صحیح ہے، ہندوؤں کا اس کی پوری پوری حمایت نہ کرنا برادری کی ایک بزدلانہ عہد شکنی ہوگی، پھر وہ مسلمانوں کی حمایت سے کئی رعایتوں کے حق کو بالکل تلف کر دیں گے، اس لیے پبلک کے ایک خدمت گذار ہونے کی حیثیت سے میں ہرگز اس پوزیشن کا مستحق نہ ہوں گا جس کا میں دعویٰ کرتا ہوں (ینگ انڈیا ۶ر اپریل ۱۹۲۰ء) جہاں اس کی حمایت کرنے میں طرح طرح کے دلائل دیے، وہاں ہندوؤں کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے یہ بھی لکھا کہ میں دعوی سے کہتا ہوں کہ میرے اور مولانا محمد علی کے

نزدیک مسئلہ خلافت مرکزی اہمیت رکھتا ہے، مولانا محمد علی کا تو یہ مذہب ہے، میرے نزدیک اس کی مرکزی حیثیت اس وجہ سے ہے کہ خلافت کی خاطر میں اپنی جان پیش کرکے گائے کو جو میرا دھرم ہے، مسلمانوں کی چھری سے محفوظ رکھ سکوں گا۔" (ینگ انڈیا۔ ۱۱رمئی سنہ ۱۹۲۰ء) اس مقصد میں گاندھی جی کو کامیابی بھی ہوئی، ان کا خود بیان ہے کہ ہمارے مسلمان ہموطن اس سلسلہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کام کر رہے ہیں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا وہ اعلان دہرانا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ جب تک ان کے مقلدین گائے کی حفاظت کے لیے تیار نہ ہوجائیں گے، وہ مسئلۂ خلافت میں برادرانِ وطن کی کسی پیش کردہ امداد کو قبول نہ کریں گے، انھوں نے اس بات کی پابندی کی ہے، وہ گائے کے متعلق ہمدردانہ اور سودمندانہ نوعیت کی تلقین کرکے ایک موافق فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، حکیم اجمل خاں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہر قسم کی مخالفت کے باوجود یہ تجویز منظور کرائی ہے کہ کسی تہوار کے موقع پر گائیں ذبح نہ کی جائیں گی، علی برادران نے اپنے گھر میں گائے کا گوشت منگوانا بند کر دیا ہے، اس میں ان شریف دل مسلمانوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے کہے سنے بغیر یہ طرز اختیار کیا، ہمیں چاہیے کہ اس اہم مسئلہ کو ان پر چھوڑ دیں کہ وہ اپنے طریقے پر اس کو حل کرلیں، ہندو بھائیوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ معاوضہ کا خیال کیے بغیر فیاضانہ طور پر مسلمانوں کی مدد کریں، نتیجہ میں گائے کی حفاظت خود بخود ہوجائے گی، اسلام ایک شریف مذہب ہے، اس لیے اس پر اور اس کے پیروؤں پر اعتبار کرو۔ (ینگ انڈیا۔ ۴ر اگست سنہ ۱۹۲۰ء)

گاندھی جی کے ان صداقت آمیز بیانات کو پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ تحریک خلافت کے ساتھ کیوں ہوئے، اسی روشنی میں ان کی معاونت اور حمایت کا مطالعہ کرنا تھا۔

فاضل مؤلف کسی لحاظ سے اپنے ناظرین کو یہ یقین دلانا نہیں چاہتے تھے کہ مولانا محمد علی اس تحریک کے اصلی روحِ رواں تھے، حالانکہ ان کو اس کا اقرار ہے کہ "مولانا محمد علی نے اپنے بے مثال درد دل

ماتحت اپنی صحت کو نظر انداز کرکے تحریک خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا۔" (ص ۴۸) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی چوائس آف دی ٹرکس لکھنے پر جب نظر بند ہوئے تو وہ مسلمانوں کے ہیرو بن گئے، ان کی شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگ گئے، ڈیڑھ لاکھ تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجے گئے، جس میں ان کی نظر بندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ (ص ۱۷) وہ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، لوگوں نے آنکھیں بچھائیں، پبلک ٹوٹ پڑی، گاندھی جی پانچ سات منٹ سے زیادہ تقریر نہ کرتے تھے، مگر مولانا محمد علی دو ڈھائی گھنٹے سے کم وقت نہ لیتے تھے، روتے اور رلاتے تھے، موقع بموقع قرآن کی آیتیں پڑھ کر ایسی شرح کرتے تھے کہ ان پر مولانا کا خطاب پوری طرح صادق آتا تھا۔ (ص ۱۷) ان کے ناظرین ان کی کتاب میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بیتول جیل سے رہا ہوئے، اسی وقت امرتسر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس مقرر تھا، اور اسی کے ساتھ خلافت کانفرنس بھی ہو رہی تھی، دونوں بھائیوں کو کانگریس کی طرف سے دعوت دی گئی، دونوں بھائی براہ راست جلسہ گاہ میں پہونچے، مولانا محمد علی نے ایک طویل تقریر کی جو بے حد جذباتی اور پُر اثر تھی، بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کی شرکت گویا تمام مسلمانانِ ہند کی شرکت تھی، کیونکہ وہ اپنے علم و فضیلت، اسلام نوازی، جرأت، حق گوئی و بے باکی، عظیم ایثار و قربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے، رہائی کے بعد وہ جن اسٹیشنوں سے گذرے وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا" (ص ۱۰۲) اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ "مولانا محمد علی کی علمیت و فضیلت، ان کا اندازِ خطابت، ان کے الفاظ کی شوکت اور سب سے زیادہ ان کے دل کا سوز و گداز، ان سب نے مل کر عوام و خواص کے دلوں میں ایک انقلابی جذبہ بھر دیا اور انھوں نے سمجھا کہ ایک گرتی ہوئی دیوار آزادی ہندوستان سے پھر سنبھل سکتی ہے۔" (ص ۱۵۹) اسی کتاب میں فاضل مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ (ص ۱۹۰-۱۸۹)

کراچی کے مقدمے کے فیصلے کے بعد مولانا محمد علی اور زیادہ ہیرو بن گئے، اگرچہ سزا تو بہت لوگوں کو، مگر زیادہ ذکر مولانا محمد علی کا تھا کیونکہ وہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیڈر (یعنی مسلم لیڈر تھے)"..... گھر گھر یہ صدا پہونچ چکی تھی ؂

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اور ایک دل گداز نظم بھی پڑھی جاتی جو اس طرح شروع ہوتی :

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کراچی کی عدالت میں علی برادران کو جو سزا دی گئی اس کے ردعمل میں فاضل مولف کا بیان ہے

"علی برادران کی وحشیانہ سزا یابی کے مقابلہ کا عزم آسمان سے باتیں کرنے لگا" (ص ۲۲۶)

یہ ساری باتیں لکھی ضرور گئی ہیں مگر ان کا ذکر اجمالی اور ضمنی طور پر آیا ہے، ان کو نمایاں طور پر کتاب میں پڑھنے کے بجائے اس کے اور واقعات کے انبار میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے، اگر ان کی پوری تفصیلات فراخدلی سے لکھ دی جاتیں تو یہی تحریک خلافت کی جاندار اور باوقار تاریخ بن جاتی۔ جان تو مولانا محمد علی خلافت پہ دیں، مگر ان کو اس کا مرد میدان اور روحِ رواں بنانے سے احتراز کیا جائے، یہ تسلیم کہ مولانا محمد علی تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے بجائے شکستوں سے معمور رہے اپنے بعض بزرگوں کے کچھ الفاظ کا سہارا لے کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انھوں نے جس طرح ایک ٹوٹی ہوئی تلوار بکھری ہوئی ہلاکت، بہتے ہوئے لہو، مگر دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرے سے یہ لڑائی لڑی یا جس طرح ان کا پر درد آواز اسلام کے اس قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوئی یا جس طرح بے قرار دل مسلمانوں کی اس مصیبت کے وقت بے تاب ہوا، اور دوسروں کو بھی بے قرار کیا، یا جس طرح اس رزم میں ان کی آتشیں زبان تیغ بیاں بن کر چمکی یا جس طرح اس مہم میں ایک نغمۂ بے نوا

پیکر شاہانہ میں نظر آئے، یا جس طرح شمع دیں پر پروانہ وار گرے وہی در اصل تحریک خلافت کی تاریخ ہو۔

مولانا محمد علی بقول مصنف جذباتی قسم کے آدمی تھے، گاندھی جی سے ان کو محبت ہوئی تو اپنی تحریک خلافت ان کے سپرد کر دی اور ایک موقع پر تو یہاں تک کہہ گئے کہ رسول اللہ کے بعد میرے اوپر گاندھی جی کا حکم نافذ ہے (ص ۸۰) اور خود گاندھی جی ان سے اور مولانا شوکت علی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ کہا کہتے کہ میں نے اپنے آپ کو علی برادران کی گود میں ڈال دیا ہے، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سچے اور خدا ترس لوگ ہیں (ص ۲۳۰) ان بیانات سے ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے تعاون کی آگ برابر لگی ہوئی تھی، دونوں ایک دوسرے کا تعاون چاہتے تھے، مگر دونوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قائد تو ہو سکتے تھے لیکن مقتدی ہونا پسند نہیں کرتے تھے، مساویانہ حیثیت سے ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتے تھے اور اس زمانہ میں دیا، مولانا محمد علی کے بیان کے مطابق انھوں نے دس سال تک گاندھی جی کے ساتھ گھل مل کر کام کیا، تحریک خلافت میں مسلمانوں کے جو جذبات ابھرے ان سے فائدہ اٹھا کر گاندھی جی نے ان کے جذبات کو تحریک آزادی کے لیے استعمال کرنا چاہا، خود فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ لوکمانیہ تلک کا خیال تھا کہ پنجاب کے خونیں واقعات اور تحریک خلافت سے جو عظیم جذبات ابھرے ان کا استعمال مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم میں کیا جائے (ص ۱۶۱) گاندھی جی نے اس کا استعمال مانٹیگو چیمسفورڈ کے بجائے آزادی کی جنگ میں کیا اور پھر مولانا محمد علی نے گاندھی جی کی حمایت اس لیے کی کہ ان کے خیال میں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے خلافت کی گرتی ہوئی دیوار آزادیٔ ہندوستان سے پھر سنبھل سکتی ہے (ص ۱۶۱)

اس طرح گاندھی جی نے مولانا محمد علی اور مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو استعمال کیا، اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ فائدہ پہونچا؟ اس کتاب میں ہے کہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی جا تما گاندھی کے ساتھ دورہ کر رہے تھے، ہر جگہ عظیم الشان جلسے ہوتے تھے، آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی، مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش و خروش پیدا ہوتا، گاندھی جی کی عظمت آسمان کو

چھوڑ رہی تھی (ص ۱۸۱) کیا گاندھی جی کی اس عظمت کو آسمان تک پہونچانے میں مولانا محمد علی معاون نہیں ہوئے؟ ضرور ہوئے، مسلمانوں میں گاندھی جی کی مقبولیت علی برادران ہی کی وجہ سے ہوئی اس وقت علی برادران کی جو محبوبیت مسلمانوں میں تھی، وہ کسی ہندو لیڈر کی ہندوؤں میں نہ تھی، اور جتنی زبردست تنظیم خلافت کانفرنس کی تھی، وہ کانگریس کی نہ تھی، گو یہ پرانی ضرور تھی، خود مصنف کو اس وقت کے مولانا محمد علی کی مذہبیت، دینداری، علم و فضل، انگریزی اور اردو کی بے مثال انشاء پردازی، فن شعرگوئی کی مہارت، خطابت کے زور، خلوص و دیانت داری کا اعتراف ہے، اور وہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی کا مذہبی جوش، ان کی شخصیت، ان کے اصرار کا طریقہ اور ان کے منطقہ ودلائل سب کو مبہوت کر دیتے (ص ۲۵۷) ان کے لیے قوم آنکھیں بچھاتی تھی، چراغاں کرتی تھی (ص ۲۶۲) گاندھی جی کو مولانا محمد علی کے ان محاسن سے ضرور فائدہ پہونچا، اور جب ان کی عظمت آسمان کو چھونے لگی تو پھر ان کو مولانا محمد علی کی ضرورت نہیں رہی، وہ ان سے دور ہوگئے، مولانا نے بھی گاندھی جی کی مہاتمائیت کو تحریک خلافت میں اچھی طرح استعمال کیا، مگر جب ان کی یہ تحریک ختم ہوگئی تو پھر وہ بھی گاندھی جی سے دور ہوگئے، جس کے بعد گاندھی جی کی قیادت مسلمانوں میں اتنی موثر نہ رہی جتنی تحریک خلافت میں علی برادران کی معیت میں تھی، حالانکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی بہت جلیل القدر شخصیتیں ان کی ہمنوائی کرتی رہیں۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب 'باپو کے قدموں میں' تحریک خلافت پر جو تبصرہ کیا اس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

"ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ میں مدد دے کر گاندھی جی اور ان کی لیڈری میں کام کرنے والے دوسرے نیتاؤں نے زبردست غلطی کی، ان لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہوئی، اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ وہ لوگ

زیادتی کرنے لگے۔"

اس سلسلہ میں کچھ اور لکھنے کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد لکھتے ہیں:

"علی برادران کا کہنا تھا کہ کانگریس اور ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری نہیں پیدا ہوئی، بلکہ اس بیداری کا سبب یہ تھا کہ ان کے مذہبی عقیدوں پر برٹش گورنمنٹ نے اپنے اقتدار سے گہری چوٹ دی تھی، اگر کانگریس یا گاندھی جی ان کا ساتھ نہ دیتے تو بھی وہ اس مسئلہ کو لے کر برٹش گورنمنٹ سے ضرور لڑتے، چاہے اس لڑائی کا طریقہ کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہوتا، اور اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا، کانگریس اور ہندوؤں نے جو مدد کی تھی اس کے وہ شکر گذار تھے لیکن ہندوؤں اور کانگریس کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمانوں کے آجانے سے ان کی بھی طاقت کتنی بڑھ گئی اور اب وہ اس قابل ہوئے کہ برٹش گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ('باپو کے قدموں میں' اردو ترجمہ، ص ۷ - ۲۰۵-۲۴۴)

اس تبصرہ کی روشنی میں اگر یہ کتاب قلمبند کی جاتی تو اس کی نوعیت کچھ اور ہوتی، مگر مولانا محمد علی کے مصنف محبوب قائد گاندھی جی سے دور ہو گئے، تو وہ ان سے ایسے بدظن ہوئے کہ ضمنی اور اجمالی طور پر ان کی تعریف کرنے کے باوجود ان کو اپنی اس کتاب میں ہر طرح گھائل کرنے کی بھی کوشش کی ہے، وہ تو یہ بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ محمد علی کا ماضی حکومت برطانیہ سے وفادارانہ تھا (ص ۷۰) گو ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ انھوں نے حکومت کی وفاداری کو اپنی بے مثال قربانی اور بے نظیر جرأت مردانگی اور اسلامی جذبہ سے دھو ڈالا (ص ۱۷۳) مولانا محمد علی خلافت کانفرنس کی طرف سے جو وفد انگلستان لے گئے اور وہاں برطانوی حکومت کے فرعونوں کے سامنے جس جرأت، بے باکی اور مذہبی حمیت کے ساتھ تقریریں کیں، اس کی مثال ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت میں اب تک نہیں مل سکتی، خود فاضل مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے رئیس وفد کی کارکردگی کا حق ادا کر دیا، یہ انہی کا حصہ تھا، اور انھوں نے برطانوی وزراء اور برطانوی پبلک، دول متحدہ کے مدبرین، فرانس کی حکومت کے

سربراہ، عراق و عرب کے لیڈروں، امیر فیصل وغیرہ سب کو ملا ڈالا (ص ۱۲۵) مگر ان کے اس کارنامہ پر یہ لکھ کر پانی پھیر دیا گیا ہے کہ مولانا محمد علی جیسا کہ ان کی عادت تھی (یہی سی کہتے گئے، ان کی یہ عادت تمام عمر قائم رہی، (ص ۱۲۱) پھر لکھا ہے کہ وفد سے واپسی کے بعد ان سے وفد کے اخراجات کا حساب مانگا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ خدا کو بروز قیامت حساب دوں گا، اس پر شریروں نے کہا: اگر وہ نہ لے اور بے حساب آپ کو بخش دے؟ حساب نہیں دیکھیے، اس کے بعد فاضل مصنف رقمطراز ہیں کہ اس سلسلہ میں جو کچھ اچھلا، اس کے مولانا محمد علی خود ذمہ دار تھے، ان کے اندر دو بڑی کمزوریاں تھیں، ایک تو یہ کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتے، جو دل میں آتا کہہ دیتے جس سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی تھی، مولانا محمد علی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور وہ اسے ان کی خوبی تصور کرتے ہیں، اس سے ان کی صاف دلی اور بے باکی کے نتائج نکالتے ہیں، مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں ...... دوسری کمزوری مولانا محمد علی میں یہ تھی کہ وہ درگذر سے کام لینا تو جانتے ہی نہ تھے جہاں ان کے خلاف کوئی بات آتی پھر ان کا قلم تھا اور ان کی شوخ نگاریاں (ص ۱۲۴ - ۱۲۳)

کراچی کی خلافت کانفرنس کا اجلاس مولانا محمد علی کی صدارت میں ہوا، اس میں مولانا نے پورے زور خطابت کو کام میں لاتے ہوئے اور آیات و احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے بقول مصنف انتہائی گرم اور طویل تقریر کی اور صرف برطانوی فوج کی ملازمت ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ تمام سامعین کو زبردست ترغیب دی کہ وہ فوجیوں کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے سلسلہ میں پوری کوشش کریں۔ (ص ۱۸۳) کتاب میں اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ اس تجویز سے انگریزی حکومت کی چولیں ہل گئیں (ص ۱۸۴) مگر اس سلسلہ میں بھی مولانا محمد علی کو یہ لکھ کر مجروح کیا گیا ہے کہ یہ تجویز منجانب صدر پیش ہوئی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدر جلسہ مولانا محمد علی اس پر تقریر کرنے کے لیے بے تاب رہے ہوں گے، (ص ۱۸۴) اس احتمالی کے استعمال کی کیا ضرورت تھی۔

کراچی کے مقدمہ کے جج کے سامنے مولانا محمد علی نے جو بحث کی اس کو پڑھ کر ہر مسلمان کا ایمان ہو سکتا ہے، مگر اس پر یہ تبصرہ لکھ کر اس کی ساری اہمیت زائل کر دی گئی ہے :

"مسٹر کا مقدمہ شروع ہوا تو بقیہ لوگوں نے خاموشی اختیار کی، مگر مولانا محمد علی الجھ گئے، زور دے کر کہنا شروع کیا کہ اگر خدا کا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا تو میں خدا کا فرماں بردار ہوں گا برطانوی قانون کو نظر انداز کروں گا، جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس کو قرآن کے حکم کا پابند ہونا چاہیئے اگر وہ قرآن کی کسی آیت کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ' ایک پورا وعظ دے ڈالا جو قطعی بے موقع اور غیر متعلق بات تھی۔ (ص ۱۸۶)

مولانا محمد علی کے انتہائی استہزا کی مثال یہ بھی ہے :

"مولانا محمد علی نے ...... ایک تقریر کے دوران کہہ دیا کہ اگر ہندو میری بیوی یا میری ماں کی عصمت دری کریں تب بھی میں ہندوؤں سے نہیں لڑوں گا، اس جلسے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا، جلسہ ختم ہونے کے بعد میں تھوڑی دیر ٹھہر گیا، دیکھا کہ حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی سے کہہ رہے ہیں کہ جب یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی تقریر نہیں کرے گا' تو آپ نے کیوں تقریر کی؟ مولانا محمد علی جھلا گئے اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کہا: میں ایسا ذلیل نہیں ہوں کہ آپ بچے ڈانٹیں، میں یہ جواب سن کر سکتہ میں رہ گیا، عصر کی نماز کے لیے مولانا عرفان' مولانا عبدالحلیم، مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ جمعیۃ علماء کے دفتر کے قریب ہی کی مسجد میں گئے ..... وہاں مولانا عبدالحلیم نے مولانا مدنی سے کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنی بیوی کی عصمت دری کے بارے میں تو خیر لیکن ماں کے لیے کیوں کہا، کیونکہ وہ تو ہم سب کی بھی ماں ہیں۔ مولانا مدنی پھر مسکرا دیئے اور کہا کہ ان کو بھی تو آپ کہہ دیجیے کہ ہماری بہن ہیں" (ص ۲۵۱)

اوپر کے مختلف بیانات میں اس شخص کا مذاق اڑایا گیا ہے جس کے متعلق فاضل مصنف کا خود بیان ہے کہ اس نے اپنے بے مثال دور وجدل کے تحت اپنی صحت کو نظر انداز کر کے تحریکِ خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا اور جو ہندوستان کے مسلمانوں کا ہیرو بن گیا تھا، جس کے لیے لوگ آنکھیں بھی بچھاتے، جو اعلان بھی کرتے اور جو مسلمانوں کے

مسئلہ پیدا ہوتا تو خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔

ممکن ہے کہ یہ کہہ کر مدافعت کی جائے کہ یہ سارے بیانات معروضیت پر مبنی ہیں مگر یہ معروضی انداز ان لیڈروں کے ساتھ اختیار نہیں کیا گیا جن کو مصنف نے اپنا محبوب بنا لیا ہے، عام مسلمانوں کو نیشلسٹ مسلمانوں سے شکایت رہی ہے کہ وہ جس بے تکلفی، بے باکی اور ان کے خیال میں سچائی سے مسلمان اور مسلمان لیڈروں کی تنقید اور تنقیص کرتے ہیں، برادران وطن اور ان کے لیڈروں پر نہیں کرتے۔ اس کتاب میں مولانا محمد علی کو جس طرح مجروح کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ مثالیں ملیں گی، مثلاً ملاپ کانفرنس کی جو تفصیلات لکھی گئی ہیں (ص ۲۵۲) ان میں پنڈت مدن موہن مالوی کو مفتی کفایت اللہ سے اونچا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس ملاپ کانفرنس میں جو معاہدہ ہوا اس کو توڑنے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر یہ لکھ کر عائد کر دی گئی ہے کہ

"مفتی صاحب پہلے تو اڑے مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی، آخر کار مان گئے اور پنڈت مالوی جی کی تجویز پاس ہو گئی، افسوس کہ بعد میں کوئی اس پر قائم نہ رہا، شاید اس عہد کو توڑنے کی پہل مسلمانوں ہی نے کی" (ص ۱۶۲)

شاید کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ فاضل مصنف کو پورے طور پر یقین نہ تھا کہ مسلمانوں نے اس عہد کو توڑنے میں پہل کی، پھر اس اظہار حق کی ضرورت کیا تھی۔

پرنس آف ویلز کی آمد پر بمبئی میں جو بلوے ہوئے اس میں گاندھی جی کا حسب ذیل بیان نقل کر کے مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے:

"میرا یقین ہے کہ گذشتہ دو دن کے بلووں میں مسلمانوں نے پیش از پیش حصہ لیا، اس سے مجھ کو سخت صدمہ ہوا" (ص ۲۴۰)

پنڈت مدن موہن مالوی کے لیے مصنف کے دل میں بڑا نرم گوشہ رہا، ان کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے:

"پنڈت مدن موہن مالوی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے، ان کا دامن ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک تھا، ہندو دھرم کے ایک سچے اور باوقار رہبر ہوتے ہوئے ان پر تعصب یا تنگ نظری کا الزام کبھی عائد نہیں ہوا..... ان کے خیالات انتہا پسندانہ نہیں رہے، وہ اپنی انتہا پسندی کی مخالفت پر بھی کبھی آمادہ نہیں ہوتے" (ص ۲۴۶)

واضح رہے کہ پنڈت مدن موہن مالوی ہندو مہا سبھا کے بانیوں میں سے تھے اور انھوں نے ہندو مہا سبھا کی تاسیس کے جلسہ کی صدارت کی اور شدھی سنگھٹن قائم کرایا، ان کی سیاسی رائے سے مولانا محمد علی ہمیشہ اختلاف کرتے رہے۔

فاضل مؤلف کو مولانا محمد علی سے یہ شکایت رہی کہ وہ اپنی سی کہتے رہتے تھے (ص ۱۲۱) وہ وعظ دے ڈالتے تھے جو قطعی بے موقع اور غیر متعلق ہوتا (ص ۱۴۹) مؤلف کی اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی سی کہتے جا رہے ہیں، اور کہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ وعظ دے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں بعض اوقات تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم تحریک خلافت یا ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ پڑھ رہے ہیں یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس میں کون سی بات تحریک خلافت سے متعلق ہے اور کون قطعی غیر متعلق ہے مسز بسینٹ، لوکمانیہ تلک، اندرا گاندھی، مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی، الہلال کے مضمون نگار، نیم شبی کا تعلق کتاب کے اصل موضوع سے کیا ہے، اور جن کا تعلق تحریک خلافت سے رہا ان میں بہت سے کتاب میں زیادہ متحرک نظر نہیں آتے، مثلاً بقول مصنف پہلی خلافت کانفرنس دہلی میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ہوئی (ص ۱۲۷) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالباری اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ قائد تھے اور عوام ہوں یا خواص انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا علماء سب میں مولانا کا وقار تھا۔۔۔۔ (ص ۱۳۰) مگر مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ذکر اس کتاب میں ایسا ضمنی طور پر آیا ہے کہ کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس وقت مسلمانوں کے مسلمہ قائد تھے غیر متعلق باتوں کا تو انبار کتاب میں لگا ہوا ہے جن میں سرسید احمد خان کا بھی ذکر آ گیا ہے اور جب وہ سرسید احمد خان، علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک کے متعلق لکھتے نظر آتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ ان کے کچھ دبے ہوئے جذبات تھے جو اس کتاب کے لکھتے وقت ابھر آئے، تحریک خلافت سے ان کا تال میل کیا ہے پھر ان کی تحریروں میں سرسید احمد خان جس طرح نظر آتے ہیں اس کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے یا ایک مخلص نیشنلسٹ مسلم کی تحریر ہے، سرسید کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"علی گڑھ تحریک سرسید نے چلائی، اس نے برطانیہ کی عظیم وفاداری کا سبق دے کر ان کو حکومت کا پختہ حامی بلکہ غلام بنا دیا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ان کی بقا کا انحصار برطانوی حکومت کے قیام میں مضمر ہے۔" (ص ۵۵)

"سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہیں، اور صرف تعلیم تک اپنے کو محدود رکھیں سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دینے میں سرسید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریزکی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں، انگریز ہندوستان سے نہ جائیں، کیونکہ وہی مسلمانوں کا تحفظ کر سکتے ہیں" (ص ۵۸)

"بعض لوگ سرسید کے بعض جستہ جستہ فقروں سے سرسید کو نیشنلسٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تاریخ کو مسخ کرنا ہے ..... انھوں نے ایک عظیم الشان مجمع میں اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دو علحدہ علحدہ قومیں ہیں اور ہندوستان نمایندہ حکومت کا اہل نہیں۔" (ص ۵۹)

"سرسید انگریزوں کو بہت مہذب، شریف اور ہندوستانیوں کو غیر مہذب اور گنوار سمجھتے تھے مثلاً وہ انگریزوں کی میز پر چھری کانٹے سے کھانے کی مدح سرائی کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کو غیر مہذب اور گنوار سمجھتے تھے۔" (ص ۲۶۹)

"مذہب کے معاملہ میں ان کی مرعوبیت کا یہی عالم تھا کلام پاک کی تفسیر لکھی تو اس میں ملائکہ، اجنہ، معجزات، معراج جسمانی کا انکار تھا، جبریل کا بھی انکار کیا۔" (ص ۶۰)

سرسید کی شخصیت و سیرت کی اس مرقع آرائی کے ساتھ ساتھ ناظرین فاضل مصنف کی یہ تحریریں سے بھی محظوظ ہوں:

"سرسید ایک بڑے ذی علم، روشن خیال، ذہین اور عالی دماغ انسان تھے، ان کو اگر نابغہ بھی کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔" (ص ۵۵)

"سرسید ایسے روشن ضمیر اور دانا تھے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کوئی اس کا خواب بھی

نہ دیکھ سکتا تھا، آج کا منظر دیکھ لیا تھا، اور اس کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی تھی؛ (ص ۵۵)

" سرسید نے دینداری اور مذہب کو جدید علوم اور جدید تہذیب سے ملا کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کیا،

وہ انتہائی مخلص انسان تھے، استقلالِ مزاج، صبر، بردباری، سنجیدہ شعور میں یکتائے روزگار

تھے، انھوں نے مراسم کی زنجیریں توڑیں اور نئے تہذیب و تمدن مرتب کیے، جو آج بھی رائج ہیں؛

سرسید ایک عظیم انسان تھے، ایسے انسان جن کا مثل صدیوں میں پیدا ہوتا تھا، انھوں نے قوم کو ایک

فکر دی اور ایسی فکر جس نے مسلم قوم پر قبضہ کر لیا؛ اور بے شمار دانشور اُن کے گرد جمع ہو گئے" (ص ۶۲)

" سرسید نے قوم کو ہمت دلائی، کام کرنے کے لیے اکسایا، نا امیدی میں امید کا چراغ جلایا، ان سے

کہا کہ اپنی خامیوں کا احساس کرو اور ان کو دور کرو کیونکہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک

کہ وہ اپنے اندر انقلاب پیدا نہ کرے؛ خود شناسی، خود اعتمادی اور قول و عمل میں راست بازی کی

تعلیم دی اور اپنے صبر و استقامت سے قوم مسلم کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑا دیا۔" (ص ۵۷)

" سرسید کی عظیم شخصیت ایک انقلاب آفریں شخصیت تھی، انھوں نے کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے داہنے

ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر؛ وہ

انھوں نے کر دکھایا۔" (ص ۵۷)

دونوں قسم کے اقتباسات میں جو عظیم تضاد ہے اس کی تصریح کرنے کی ضرورت نہیں لیکن مصنف نے ایک ماہر وکیل اور صحافی کی حیثیت سے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں؛ اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ علی گڑھ کالج میں سرسید نے ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور سیکولرزم کوٹ کوٹ کر بھر دیا (ص ۶۷) اس لیے سرسید کو یہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ جہاں تک ان کی تعلیمی خدمتوں کا معاملہ ہے وہ آسمانِ عظمت کے مہر و ماہ نظر آتے ہیں (ص ۵۸) اس رائے سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے؛ اسی کے ساتھ فاضل مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ

کم و بیش نوے سال سے زائد گذرنے کے بعد آج ہم سرسید کی تقریر پڑھتے ہیں تو جہاں تک سیاسی فکر کا سوال ہے ہمیں سرسید عظیم نظر نہیں معلوم ہوتے (ص ۵۹) اگر مصنف کی اس رائے سے اتفاق کر لیا جائے تو پھر ان کی اس رائے سے کیسے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ سرسید عالی دماغ انسان، عہد آفریں، روشن ضمیر دانا، یگانۂ روزگار، ناامیدی میں امید کا چراغ جلانے والے، مسلمانوں کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑانے والے اور انقلاب آفریں تھے، اور اگر اس تضاد کو دکیلانہ استدلال اور صحافت نگاری کی کھینچا تانی سے دور کر بھی لیا جائے تو پھر کیا مسلمان اور سرسید کی تحریک کے حامی ان کی اس رائے سے اتفاق کرنا پسند کریں گے کہ

"وہ یعنی سرسید چاہتے تھے کہ انگریز اسی طرح ملک پر حکمراں رہے اور مسلمان کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہ لیں اور اسی کا نام علی گڑھ تحریک ہے" (ص ۶۱)

اس قسم کی باتیں مناظرانہ مباحث میں تو کہی جا سکتی ہیں، یا اخبار کے کالم نگار تو مزے لے لے کر لکھ سکتے ہیں، یا کسی سیاسی پلیٹ فارم پر کہہ کر تالیاں تو بجوائی جا سکتی ہیں لیکن با وقار تصنیف کے لیے باعث زیب و زینت نہیں ہو سکتیں۔

فاضل مصنف ترکی کے سلطان عبدالحمید سے بھی خوش نہیں ہیں، وہ ان کو انگریزوں کا غلام، ترکی کا ایک ذرہ رہن کرنے والا، فوج میں عیسائیوں کو بھرنے والا، جدید طریقۂ حرب کو نظرانداز کر کے ترکی عسکریت کا خاتمہ کرنے والا، درۂ دانیال کے قلعوں پر سے توپیں اور اسلحہ ہٹانے والا بڑا زمیندار، محبان وطن کا قاتل، روباہ صفت اور غدار وغیرہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں (ص ۱۰) مگر انہی کے فاضل ترین اور محبوب ترین معاصر مولانا ابوالحسن علی ندوی سلطان عبدالحمید ثانی کے متعلق یہ لکھتے ہیں:

"اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت اور کر و فر کے ساتھ موجود تھی مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید ثانی متمکن تھے جن کی ذات چنیویں صدی کے وسط تک سخت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنی رہی، مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے

چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کر دی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین مو قر عربی و ترکی رسائل میں شایع ہوئے ہیں، نیز ان کے روزنامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود جو موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہیں اور اندرونی و بیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا ردعمل بھی) ایک نہایت باحمیت اور صاحبِ غیرت مسلمان حکمراں تھے جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کر کے یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور انھوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیش کشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، اور زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لیے تیار نہیں، اور جنھوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں ایک نئی روح اور عالم اسلام میں وحدت اسلامی اور جامعہ اسلامیہ کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا (پندرھویں صدی ہجری ماضی و حال کے آئینہ میں) اگر فاضل مصنف زندہ ہوتے اور کہتے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس بیان کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ان سے یہی کہا جاتا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کو رد کرنے کے حق سے دوسروں کو بھی محروم نہیں کر سکتے،

مصنف مصطفیٰ کمال کے بڑے شیدائی نظر آتے ہیں، ان سے ان کو جو عقیدت ہے اس کا سیلاب ان کی تحریروں میں امنڈتا نظر آتا ہے، جس زمانہ میں مولانا محمد علی خلافت کا وفد لے کر لندن گئے تھے، وہاں مصطفیٰ کمال کی طرف سے بھی ایک وفد آیا ہوا تھا، اس وفد کی تعریف چاہے جتنی کی جاتی یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی:

"اس کا مقابلہ محمد علی کے وفد سے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک غلام کی عرضداشت اور ایک جانباز مردِ مجاہد کی للکار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ (ص ۲۱۵)

مولانا محمد علی نے لندن میں جو پُر جوش اور ایمان پرور تقریریں کیں وہ ایک مردِ مجاہد کی للکار سے کم نہ تھی، فاضل مصنف کو اپنے مردِ مجاہد کا بھی سرسری مطالعہ اسی طرح کرنا چاہیے تھا جس طرح کہ انھوں نے ایک

غلام" لکھا گیا ہے" یہ غلام تحریک خلافت میں ناکام ہونے کے باوجود اپنی اسلام نوازی کے بے مثال ورد دل کے ساتھ سپردخاک ہوا، مگر مصنف کے مرد مجاہد نے زریں کارنامے انجام دیے، اپنی کامیابی پر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں گھوڑے پر سجدہ کرنے اور اپنی کامیابی میں اللہ تعالیٰ کی نصرت ساتھ رہنے کا اعتراف کرنے (ص، ۲۱) کے باوجود ترکی سے اسلام کو خارج کرنے کا التزام بھی اپنے سر لیا، اور جب فاضل مصنف یہ لکھتے ہیں کہ

"یہی مصطفےٰ کمال جو مسلمانوں کا اب تک ہیرو تھا لعن طعن کا نشانہ بننے لگا، کچھ لوگ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ اسے اسلام سے منحرف بلکہ اسلام کا دشمن قرار دینے لگے" (ص ۲۵۴)

تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مصطفےٰ کمال نے اسلام سے انحراف نہیں کیا، بلکہ ترکی سے اسلام کو خارج کرنے کے بعد بھی وہ اس کے مستحق تھے کہ ان کے لیے یہ راگ الاپا جائے کہ

ہمارا غازی کمال پاشا اپنا کمال دکھا رہا ہے۔

اس کتاب میں جس طرح سرسید کا معروضی مطالعہ کیا گیا ہے اسی طرح مصطفےٰ کمال نے اپنی فتحمندی اور کامرانی کے بعد اسلام کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر بھی معروضیت کا اظہار ہونا چاہیے تھا، مگر جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑا دیا' یا جو اسلام کے نام پر مرا اس کے لیے تو تحریر غیر محتاط ہوگئی، مگر جو اسلام سے منحرف ہوگیا اس کی مداحی میں قلم سے جو تحریر نکلی وہ شاہکار بن کر نمودار ہوئی ہے' اور جب ہندوستان کے مسلمان خلافت کو برقرار رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے تو مصطفےٰ کمال نے اس کو ختم کرکے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، معروضیت سے کام لے کر مصطفےٰ کمال پر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے ڈاکٹر کے۔ کے۔ عزیز مصنف کمالسٹ ٹرکی اینڈ دی مڈل ایسٹ کے ایک بیان کا سہارا لیا گیا ہے، جس میں اس نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ مسئلۂ خلافت محض خیال رہ گیا تھا، اس کا کوئی ماننے والا باقی نہیں تھا، صرف وہی لوگ اس کو مانتے تھے جو اس سے

فائدہ اٹھا رہے تھے، اس لیے قدرتہً مصطفیٰ کمال نے سلطان اور خلافت کا خاتمہ کر دیا (ص ۱۹۰) اور جب اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال نے ترکی کے ایک جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا اور سلطان عبدالوحید خود وہاں سے ایک انگریزی جہاز پر بقول مصنف الٹا بھاگ گئے تو اس پر یہ شعر لکھ کر استہزاء کیا گیا ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ استہزاء اس کے متعلق ہے جس کے متعلق اس کتاب میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مسلمان یہ خیال کرتے تھے کہ یہ خلافت عثمانیہ کا جھلملاتا ہوا چراغ گل ہو گیا تو مسلمانوں کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہیں رہے گا، اور مسلمان دنیا کے صحرائے ریگ زار میں ایک گم کردہ کارواں کی شکل اختیار کر لیں گے (ص ۲۲)

اس کتاب میں تحریک خلافت کے انعامات و تاثرات کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس کا سیر حاصل حصہ ہے، یہ ان لوگوں کے لیے قابل مطالعہ ہے جو بقول مصنف خوب بغلیں بجاتے اور مضحکہ اڑاتے تھے کہ آخر یہ سب کرنے سے کیا حاصل ہوا۔ (ص ۲۵۴)

کتاب پر یہ تبصرہ ذرا طویل ہو گیا ہے، جب یہ دارالمصنفین میں آئی تو اس کو پڑھ کر تکلیف ضرور ہوئی، یہاں کے لوگوں کے دلوں میں فاضل مصنف کی ذات کا جو احترام تھا اس بنا پر اس پر کچھ لکھنے سے احتراز کیا گیا، مگر مرادآباد کے ایک دیندار بزرگ نے لکھا کہ معارف میں اس پر تبصرہ شائع نہیں ہوا، تو قیامت کے روز اس کا مواخذہ کیا جائے گا، اسی کے بعد یہ تبصرہ بادل ناخواستہ قلمبند کیا گیا ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

فہرست نسخہ ہائے خطی مرتبہ، جناب احمد منزوی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، کتابخانہ گنج بخش جلد اول و دوم طباعت ٹائپ مجموعی صفحات ۸۰۰، مجلد قیمت درج نہیں،

پتہ:۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد،

فارسی زبان و ادب کی خدمت اور اس سے متعلق علوم کی اشاعت کی غرض سے اسلام آباد میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی شائع کردہ کتاب خانہ ہائے پاکستان کا چند ماہ قبل ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، یہ کتاب بھی اسی مرکز نے شائع کی ہے، اس میں کتاب خانہ گنج بخش کے مخطوطات کی فہرست مع تعارف درج ہے، یہ کتب خانہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش (م ۴۶۵ھ) صاحب کشف المحجوب کے نام نامی پر قائم کیا گیا ہے، فہرست کی پہلی جلد دس اور دوسری چھ حصوں پر مشتمل ہے، دونوں جلدوں میں حسب ذیل فنون کی کتابوں کا ذکر ہے، تفسیر، تجوید، علوم قرآن، ریاضی، موسیقی، نجوم، طبیعیات، کیمیا، طب، علوم تجربی، منطق، فلسفہ، فرق و مذاہب، کلام و عقائد، تصوف اور فلسفۂ عملی، پہلی جلد میں تین اور دوسری میں ایک مفصل فہرست دی گئی ہے، ان فہرستوں میں ہر مصنف کے نام کے تحت ان کی ان تمام کتابوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں جن کا کتاب میں کہیں ذکر ہوا ہے، تعارف میں مخطوطات کے موضوع، ابواب اور ان کے مباحث کا خلاصہ اختصار کے ساتھ درج ہے، اور جن کے مصنفین کے نام کا پتہ چل سکا ہے ان کا نام ذکر کرکے ان کے متعلق مختصر معلومات بھی پیش کئے گئے ہیں، ان دونوں جلدوں میں مختلف فنون کے [illegible] مخطوطات کا ذکر ہے، اس فہرست کی اشاعت پر مرتب اور ناشر دونوں تحسین کے مستحق ہیں،

[illegible] نمبر   اکتوبر ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس روپے سالانہ

دار المصنفین اعظم گڈھ

......

جلد ۱۲۶ ماہ ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

شذرات

اپنے اس عزیز اور وطن میں قومی بہاؤ کا جب مسئلہ اٹھتا ہے تو یہاں کا بعض انتہا پسند طبقہ ہم پر یہ الزام رکھتا ہے کہ وہ اس ملک کے خیر خواہ اور وفادار نہیں،

یہ الزام تراشی کسی نیک نیتی اور وطن دوستی پر مبنی ہونے کے بجائے مسلمانوں سے اعصابی جنگ اور اُن کو ذہنی حیثیت سے مفلوج رکھنے کی خاطر کی جاتی ہے، ایسے الزام رکھنے والے خود اپنی وطن دشمنی ملکی بدخواہی پر پردہ ڈالنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، اور قوموں کو وطن سے محبت تو ملکی مصالح کی ہوتی ہے لیکن مسلمانوں کی وطن دوستی میں خالص مذہبی عقیدہ کو دخل ہے، ان کے رسول صلی اللہ کی تعلیم ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نہ لگاؤ اس خیال کی وجہ سے بھی ہے کہ حضرت آدمؑ بہشت سے اسی سرزمین پر اتارے گئے، اور چونکہ نور حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا ظہور اسی سرزمین میں ہوا اسی لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سرزمین ربانی خوشبو آتی ہے،

مسلمان یہاں جب سے آئے، اس وقت سے اب تک ان کے تاریخی ادبی اور شعری ذ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہندوستان سے بے پناہ شیفتگی اور وارفتگی کے جذبات کا ایک بہ بھرا ملے گا، تیسری چوتھی صدی ہجری میں ایک ہندوستانی وضلع سندھی نے عرب میں بیٹھ عربی زبان میں یہ وطنی گیت گایا کہ اس سرزمین میں دودھ، موتی اور یاقوت اُگتے ہیں،

خاص چیزوں میں مشک، کافور، عنبر، جائے پھل، سنبل، صندل، طرح طرح کے عطریات، ہاتھی دانت، ساگون، توتیا کے پہاڑ، ناریل، آبنوس، سیاہ مرچوں کے درخت ہیں، ہتھیاروں میں تلوار ہیں جن کو کبھی صیقل کی حاجت نہیں، تو کیا بے وقوف کے سوا کوئی اور بھی ہندوستان کی خوبیوں سے انکار کرسکتا ہے ؟

تاج المآثر کا مصنف حسن نظامی نیشاپور کا رہنے والا تھا، وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوگیا، یہ شہر اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو ہندوستان کا ام البلاد کہنے لگا، ایک موسم بہار میں وہ لاہور گیا تو راوی کے کنارے کھڑے ہو کر وہاں کے موسم سے ایسا متاثر ہوا کہ اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ اس کی مٹی میں آذر کے سینکڑوں اثرات دکھائی دے رہے ہیں، اس کی ہوا سوسن اور گلاب سے چاندی اور سونے حاصل کر رہی ہے، اس میں مصور مانی کے سینکڑوں نقشے نظر آرہے ہیں، اس میں دم عیسیٰ ہے، اس کی نسیم سحری زندگی میں روح پھونک رہی ہے اور زمردیں جام میں مستانہ بلبل کو صبح کی شراب پیش کر رہی ہے،

سدید الدین عوفی نے لباب الالباب اور جوامع الحکایات شمس الدین التمش کے عہد میں مرتب کیں، ان میں رقمطراز ہے کہ اس ملک کے ادنیٰ شہری قیصر و کسریٰ اور تاتاری چین کے خان سے بہتر ہیں،

اسی زمانہ میں طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج نے دہلی کو مہبط الجمال آفاق کہا،

امیر خسرو کے اشعار اور نثری تحریریں تو وطن دوستی کا راس المال ہیں، وہ یہاں کی ہر چیز کے ساتھ اس کے پھولوں، پھلوں، پرندوں، جانوروں، حسین اور تمکین عورتوں کا راگ الاپتے ہوئے مطلق نہیں تھکتے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہاں حکمت ہے، دانائی ہے، علم ہے، ہنر ہے، وہ دہلی کے لوگوں کی ایسی محبت کرتے کہ ان کو فرشتہ صفت اور جنت والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو سمجھتے، دہلی کو عدن کی جنت اور باغ ارم قرار دے کر لکھتے ہیں کہ اس بوستان کا قصہ سن کر مکہ بھی ہندوستان کا

طواف کرے، اور اس کی شہرت سن کر مدینہ بھی بہرہ ور ہو جائے، اپنی غایت محبت میں اس کی گرم ہوا کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ آفتاب کو یہاں سے عشق ہے، اس عشق کی گرمی سے یہاں کی ہوا بھی گرم ہوگئی ہے، اپنی مثنوی نہ سپہر میں وارفتہ ہو کر پکارا ٹھتے ہیں، ع : کشور ہند است بہشتے بزمیں،

امیر خسرو کے قلبی دوست امیر حسن سجزی دہلی کو حسینوں کا شہر اور حوروں کی بہشت سمجھتے رہے، وہ دہلی چھوڑ کر دولت آباد میں آباد ہو گئے، تو اس کے لئے دعا کرتے رہے کہ اس کو وہی سب کچھ حاصل ہو جو آسمان کو ہے، چودھویں صدی عیسوی میں عصامی ایک بہت مشہور شاعر گزرا ہے، وہ دہلی ہی میں پیدا ہوا، مگر اپنے خاندان کے ساتھ دولت آباد چلا گیا تو وہاں حسن شاہ بہمنی کے دربار سے وابستہ ہو گیا، یہیں اس نے ۱۳۵۰ء میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا ایک شاہنامہ فتوح السلاطین کے نام سے لکھا، اس میں والہانہ انداز سے ہندوستان کی مدح بھی کرتا جاتا ہے،

وہ کہتا ہے کہ ہندوستان کی رونق کیسی اچھی ہے اس بوستان پر جنت کو بھی رشک آتا ہے، اس کی سرزمین تمام دنیا کے لئے زینت ہے، اسی طرح جیسے نازنین کے رخسار پر تل ہوتا ہے، یہاں قدم قدم پر ندیاں ہیں جن کا پانی آب حیات سے بھی زیادہ بہتر اور صحت مند ہے، یہاں کے موسم خزاں میں بہار کا لطف آتا ہے، یہاں اگر کانٹا بھی بویا جاتا ہے تو پھول اگتا ہے، اس کی ساری مٹی میں گلاب ملا ہوا ہے، اس کی مٹی پر شبنم بادل ہی کی طرح اثر کرتی ہے، یہ میووں اور پھولوں کی سرزمین ہے، جو درختوں کی شاخوں سے ٹھنڈی اور سایہ دار رہتی ہے، اس کی خاک بوئے گل سے معطر اور اس کا پانی گلاب سے معطر ہے، انسانیت کی اصل اسی کی خاک سے تو پیدا ہوتی ہے، جو کوئی بھی اس بوستان میں ہو ... عجم اور عرب سے آتا ہے، اس کا دل اس اچھے ملک میں ایسا لگتا ہے کہ پھر وہ اپنے وطن کو بھول جاتا ہے، ... اس ملک میں کوئی ایسا لگاؤ ہو جاتا ہے کہ اس کی جان بھی جاتی ہے تو وہ دل گیر نہیں ہوگا،

فیروز شاہی عہد کا ایک مشہور شاعر مطہر کڑہ فیروز شاہ کے ساتھ ٹھٹھہ گیا تو وہاں کو دیکھ کر لکھا،

کہ یہ شہر نہیں ہے، ایک آراستہ پیراستہ بہشت ہے، جہاں حوریں ہیں، سلسبیل ہے، ہزاروں نہریں ہیں، جن کا پانی گلاب اور سفید خالص چاندی کی طرح ہے، اس کا ہر منظر روح افزا ہے، اس کی نسیم میں مشک کی خوشبو ہے

اکبری دربار کے ملک الشعرا فیضی نے مثنوی نل دمن قلمبند کی تو رقمطراز ہے کہ وہ اس کو لکھ کر بزم عشاق میں ناز و نیاز کے سیکڑوں تحفے پیش کر رہا ہے جس کو پڑھ کر لوگ محسوس کریں گے کہ اس سرزمین میں عشق و عاشقی کے سرمست عشق کی راہ میں دل و جگر برباد کر کے کس طرح آتش عشق کے خاکستر بن کر رہ گئے ہیں، وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ ہندوستان میں جیسا جذبۂ عشق ہوتا ہے کہیں اور نہیں، اس کی خاک کا ذرہ ذرہ آفتاب ہے، اور ہر ذرہ نہ سپہر کا چراغ ہے، یہاں کے عشق کی نیاز گرمی ہی کی وجہ سے یہاں آفتاب میں بھی گرمی پیدا ہوتی ہے،

فیضی اکبر کے ساتھ کشمیر گیا تو اس کی رعنائی اور دل آویزی دیکھ کر مست ہو گیا، ایک طویل قصیدہ میں لکھا ہے کہ اس کی ہوا میں ایک نقاش کی خیال آرائی کا تنوع ہے، اس کی سرزمین میں صفحۂ تصویر کی رنگارنگی ہے، اس کی فطری بوقلمونی اور نقاشی کارخانۂ قدرت کے عجائب میں سے ہے، اس کا غبار آنکھوں کی دوا ہے، اس کی غذا روح کے لئے اکسیر ہے، اس کا پانی بدن کے لئے ایسا ہے جیسا گلاب اور اس کی شراب ہے، اس کی ہوا روح کے لئے ایسی ہی ہے جیسے دودھ کے لئے شکر ہے، اس کی نسیم سحر کے مقابلہ میں دم عیسیٰ بھی سموم ہے، اس کے آب رواں کے نزدیک زلال خضر بھی تالاب کا محض بہتا ہوا پانی ہے، اس کے پانی میں ارغنوں کی صدا سنائی دیتی ہے، اس کی صندلی زمین کافوری برف سے نم رہتی ہے، اس میں گلاب عنبر کی بھی آمیزش ہے، یہاں گھاس کے بجائے زعفران ہوتا ہے، اس کی مٹی میں بھی تاثیر ہے، قدرت کی فیاضی سے یہاں ہزاروں چشمے ابلتے ہیں، ہر جگہ قدرت ازلی کی صناعی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ، فیضی کی طرح ابوالفضل، عرفی، جہانگیر، حاجی جان محمد قدسی، ظفر خان احسن، ملا [illegible] میر حیدری، طغرائی اور ان گنت شاعروں اور ادیبوں نے کشمیر پر اپنی نظمیں [illegible] اور ایسی تحریریں لکھیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون زیادہ [illegible] اس پر فریفتہ رہا،

[illegible] ہندوستان کے ہر [illegible] کی کسی نہ کسی چیز کے بارے میں اپنی کچھ نہ کچھ اچھی رائے

لکھی ہے، مثلاً بنگال کے متعلق لکھتا ہے کہ یہاں آم کے درخت خوب پھلتے ہیں، اس کی پیداوار میں چاول کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، اگر ہر قسم کے چاول کا ایک ایک دانہ چن کے اکٹھا کیا جائے تو ایک بڑا برتن ان دانوں سے بھر جائے گا، یہاں کی چھالیہ چبانے سے لب سرخ ہو جاتے ہیں، اڑیسہ کی آب و ہوا معتدل اور خوشگوار اور اس کا موسم بہت اچھا ہوتا ہے، الہ آباد کا موسم بھی صحت بخش ہے، جہاں مختلف قسم کے پھول ہوتے ہیں، اس کے قصبہ موداما میں ہر خاص و عام اپنے حسن و جمال میں یگانۂ روزگار ہے اودھ کی زراعت اس کی خوشگوار آب و ہوا کی وجہ سے بہت عمدہ ہوتی ہے، یہاں کے چاول کی قسموں میں سکھداس جنود اور سفیدی خوشبو نزاکت اور ذائقہ میں بے مثل ہوتے ہیں، مالوہ میں دو دو تین تین کوس کے فاصلے پر صاف اور نفیس چشمے بہتے ہیں، جن کے دونوں کنارے سنبل کے خودرو اور سایہ دار درختوں کی قطار اور سرخ و سیاہ رنگ کے خوشنما پھولوں کی بیل کے دلکش مناظر ہیں، جھیل اور چراگاہیں بھی بکثرت ہیں، بلند اور عالیشان عمارتوں کی وجہ سے یہ صوبہ بیشک مدن ہے،

خاندیس کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہاں عمدہ قسم کے چاول پھل، اور پان بکثرت ملتے ہیں، کپڑے اعلیٰ قسم کے بنے جاتے ہیں، بہار کی زراعت بہت اچھی ہوتی ہے، گجرات میں نقاش اور کن اور دوسرے پیشے والے بکثرت ہیں، جو روم، فرنگ، ایران اور توران کے کپڑوں کے بہت عمدہ نمونے تیار کرتے ہیں، اس کا شہر احمد آباد بہت خوبصورت اور آباد ہے، صوبہ اجمیر میں بے شمار قلعے ہیں جن میں چتور، جودھپور، جیسلمیر، امرکوٹ، ابوگڈھ اور جالور کے قلعے بہترین شمار کئے جاتے ہیں، صوبہ لاہور کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اس کی زمین کھیتی کے لئے بے نظیر ہے، شہر لاہور میں بے شمار بلند اور عمدہ محل، اور دلکشا باغات ہیں، اس کے باشندے طرح طرح کے ہنر جانتے ہیں، آبادی وسعت کے لحاظ سے اس شہر کی خوبی کا اندازہ کرنا مشکل ہے،

طالب آملی ایران سے ہندوستان پہنچ کر آیا کہ اس کا بخت سیاہ ایران ہی میں پیچھے چھوٹ جائیگا

اور ایسا ہی ہوا، وہ جہانگیر کے دربار کا ملک الشعراء بنایا گیا، اسی زمانہ میں مرزا صادق نے بنگال کے متعلق لکھا کہ یہاں اتنے پھول ہوتے ہیں کہ ایران کے بادشاہ پشنگ کے لڑکے کا خزانہ معلوم ہونے لگتا ہے، اس کے لئے دریائے گنگا ایسا ہی ہے جیسے خزانے کے لئے اژدہا ہو، ایک اور شاعر قاسم منجہ تو بنگال کے بارہ میں یہاں تک لکھ گیا کہ جو کوئی بنگال کے سبزہ زار سے لطف اٹھا چکا ہو وہ اگر جنت کی خواہش کرتا ہو تو وہ دوزخی ہے، یہ تعریف تو کفر کی حد تک ہے،

برہان پور کے بارہ میں ماثر رحیمی کے مصنف نے لکھا کہ یہاں ماہ و مشتری برج آسمان سے اترتے دکھائی دیتے ہیں، اس کے باغات میں معشوق کی گلیوں کا لطف ملتا ہے، شاہجہانی دور کے ملک الشعراء کلیم نے ہندوستان کو بادۂ عشرت اور اقلیم راحت قرار دیا، وہ اکبرآباد کی شان و شوکت سے متاثر تھا، اس کے باغات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اُن میں جب چمپا کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شعلۂ بے دود دکھائی دے رہا ہے، اس نے اس شہر کے دھوبیوں تنبولیوں بزازوں، اور طبیبوں پر بھی اچھے اچھے اشعار کہے، شاہجہانی دور ہی کے ایک شاعر بینش کشمیری نے پنجاب، لاہور، دہلی اور بنارس پر بہت ہی دل آویز اشعار کہے ہیں، بنارس کے متعلق کہتا ہے کہ محبت میں یہاں کی عورتیں زلف لیلیٰ اور مرد زنجیر مجنوں ہیں، وہ بنارس کو ہندوستان کے گلستاں کا سنبلستاں قرار دیتا ہے، علی حزیں تو پری رخان بنارس کے صد کرشمہ و رنگ کے فریفتہ رہے، غالب بنارس کو بہشت خرم اور فردوس معمور سمجھتے رہے، اس کے غبار کو روح کا جوہر اور آسمان کی شفق کی رنگینی کو اس کا تمک بتایا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بنارس ایک معشوق ہے، گنگا اُس کا آئینہ ہے جس سے وہ اپنی آرائش صبح و شام کرتا رہتا ہے، اور اس پری چہرہ کا عکس فلک پر سونے کے سورج میں پڑتا رہتا ہے،

حالی یہ کہہ گئے ہیں کہ ہندوستان کے باغوں کی فضاؤں کی وجہ سے ہم سمرقند و دمشق

اور اصفہان کے شب کو بھول گئے، گنگا جل نے ہمارے کام و دہن تر کئے، تو پھر نہ دجلہ اور فرات کی یاد باقی رہی، یہاں کے نیشکر کی خاطر بصرہ اور طائف کے نخلستان اور خرمستان ذہن سے جاتے رہے، یہاں کی فصل گل دیکھ کر مرو اور شیراز کے چمن بھلا دیئے گئے، یہاں کے پہاڑوں کو دیکھ کر نہو کنا باد و گلگشت مصلیٰ کا سمان جی سے اتر گیا،

ہندوستان کے مسلمانوں کی شیفتگی کے جذبات کی انتہائی ترجمانی اقبال نے یہ کہہ کر کی

ع، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ اور پھر انھوں نے ایک گیت میں بچوں کو اس پر فخر کرنا سکھایا کہ یہی سرزمین ہے جہاں چشتی نے پیغام حق سنایا تھا، اسی چمن میں نانک نے وحدت کا گیت گایا، اسی کو تاتاریوں نے اپنا وطن بنایا، اسی نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا، اسی نے یونانیوں کو حیران کر دیا تھا، اسی نے سارے جہان کو علم و ہنر دیا، اس کی مٹی میں حق نے سونے کا اثر دیا ... کا سفینہ آکر ٹکا ... اس کی زمین کی رفعت بام فلک کا زینہ ہے، اس کی فضا میں جینا جنت کی زندگی ہے، اور جب اقبال شاعر اسلام ہوئے تو اپنے آخری وقت میں یہ بھی کہا کہ یہ ملک قادیانی مشرق کی امیدوں کا مرکز ہے، انھوں نے خود اپنے اشکوں سے اس کو سیراب کیا ہے، اس کی خاک سے مٹی پردیدہ کا چشم روشن ہے، اس کا خزف در ناب ہے، اس کی خاک سے غواص معانی اٹھتے رہتے ہیں،

عربی فارسی اور اردو میں مسلمانوں نے اس قسم کی وطنی شیفتگی کے جتنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور تحریک آزادی کے سلسلے میں جتنی ولولہ انگیز اور پرجوش نظمیں کی ہیں، اُن کو یکجا کر دیا جائے تو ہندوستان کی اور دوسری زبان کے بولنے والوں کے وطنی جذبات کا لٹریچر بالکل ہی ماند پڑ جائے گا،

ع ا۔ پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

مقالات

حکیم سنائی کے قصائد اور اسلامی افکار و عقائد

از پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

حکیم سنائی کے دور میں معاشرہ جس اخلاقی انحطاط سے دوچار تھا، اس کا ذکر ان کے اکثر قصیدوں میں تفصیل سے ملتا ہے، ایک قصیدہ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

پادشا را ز پے شہوت و آز — رخ بہ سیمیں بر و سیمیں صنم است
امرا را ز پے ظلم و فساد — دل بہ در و زر و خیل و حشم است
فقہا را غرض از خواندن فقہ — حیلۂ بیع ربا و سلم است
علما را ز پے وعظ و خطاب — جگر از بہر تعصب بدم است
صوفیان را ز پے راندن کام — قبلہ شان شاہد و شمع و شکم است
زاہدان را ز برای زہ و زہ — قل ہو اللہ احد دام و دم است
حاجیان را ز گدائی و نفاق — ہوس و ہوش بطبل و علم است
غازیان را ز پے غارت و سہم — قوت از اسپ و سلاح و خدم است
فاضلان را ز پے لاف فضول — روئے در فتح و جر و جزم و ضم است
ادبا را ز پے کسب بجاہ — اند نصب لن و جزم لم است

متکلم را ز راهِ خیال — غم اثبات حدث و قدم است
مرد طب را ز پی خلعت و نام — همه اندیشهٔ او بر سقم است
... دهقان از پی کسب معاش — از ستور و زر و خرمن خرم است
خواجهٔ معطی ز پی لاف و ریا — تازه از مدحت و لرزان نعم است
باز سائل را در هر دو جهان — دوزخش لا و بهشتش نعم است
همگان شیفتهٔ صید اند و حرام — کو کسی کز پیِ حق در حرم است
این همه مشغله در بسم هوس — طالبان رهِ حق را صنم است
... برگشته و عذر همه این — گر بدم من نه فلان نیز نه هم است
... دانی که چرا است — زانکه بوالقاسم[1] ثان بوالحکم است

(دیوان ص ۱۸)

آخر سے پہلی بیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ لوگ اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ ان میں برائی نہیں بلکہ اگر وہ برا ہے تو دوسرا بھی تو برا ہے۔ سنائی کے نزدیک ان تمام اخلاقی بدحالی کی وجہ یہ ہے کہ وہ دین کی روح سے نا واقف ہو چکے ہیں، وہ راہِ سنت سے ہٹ گئے ہیں، وہ وہی کر رہے ہیں جو ابوجہل کا وطیرہ تھا۔[2]

قرآن کے بارے میں حکیم سنائی نے دلچسپ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

قرآن ایک حسین دلہن ہے جس سے وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جن کا دل مکروہات دنیا سے

---

[1] ابوالقاسم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب اور ابوالحکم ابوجہل کا ابتدائی لقب تھا۔

[2] شکایت و بے وفائی روزگار کا مشہور قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

فسخ شد مروت و معدوم شد وفا — زین هر دو مانده نام چو سیمرغ و کیمیا

(دیوان ص ۴۰)

پاک ہے، قرآن کا چہرہ دیکھنے کے بعد عاشقِ دین ذکرِ الٰہی میں مستغرق ہو جاتے ہیں :

عروسِ حضرتِ قرآن جمال آنگاہ بکشاید — کہ دار الملکِ ایماں را مجرد بیند از غوغا
عجب نبود گر از قرآن نصیبت نیست جز نقشے — کہ از خورشید جز گرمی نہ بیند چشمِ نابینا

(ص ۵۲)

بہ بینی بے نقاب آنگہ جمالِ چہرۂ قرآں — چو قرآن روی بنماید زبانِ ذکر گویا کن

(ص ۴۹۵)

قرآن خدا کی رسی ہے، جس کے سہارے چاہِ ادبار سے نکل سکتے ہیں، اس خیال کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے، مثالیں درج ذیل ہیں :

گرد قرآن گرد زیرا ہر کہ در قرآن گریخت — آں جہاں رست از عقوبت ایں جہاں رَست از فتن
چوں ہمی دانی کہ قرآن را رسن خواندہ است حق — پس تو در چاہِ طبیعت چند باشی با وسن
چرخ گرداں ایں رسن را می رساند تا بچاہ — گر ہمی صحرات باید چنگ در زن در رسن
گرد ستم اسپِ سلطانِ شریعت سرمہ کن — تا شود نورِ الٰہی با دو چشمت مقترن
گر عروسِ شرع او از رخ براندازد نقاب — بے خطا گردد خطا و بے خطر گردد حسن

(ص ۴۵۵)

سنائی کے یہاں قرآن کا اثر مختلف انداز سے ملتا ہے، انھوں نے ایک قصیدہ میں جو حضور کی مدح میں ہے، سورۂ 'واللیل' کی تفسیر نظم کر دی ہے، اس کے چند شعر اوپر درج ہو چکے ہیں، قرآن میں قدیم قوموں کے عبرتناک انجام کا ذکر کر کے لوگوں کو متنبہ کیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِنْ قَرْنٍ الخ، سنائی اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں :

در جہاں شاہاں بسے بودند کز گردوں ملک — تیر شاں پروین گسل بود و سناں جوزا شگاف

بنگر ید اکنوں بنات النعش وار از دستِ گرگ — نیز باشان شاخ شاخ و تیر باشان تار تار
سر بخاک آورده امروز آنکہ افسر بود ے — تن بہ دوزخ برد امسال آنکہ گردن بود پار

(ص ۱۸۳)

یوں تو سنائی کے دیوان کا معتد بہ حصہ قرآن کی تفسیر ہے' اور اس کے جائزے کے لیے بڑی دقت نظری درکار ہے، لیکن جہاں تہاں واضح نشان ملتے ہیں' ان کا ذکر کر دیا گیا ہے، ایک قصیدہ کے سارے قوافی قرآنی کلمات ہیں، یہ قصیدہ طویل ہے، صرف چند ابیات نقل کیے جاتے ہیں:

اے منزہ ذاتِ تو عما یقول الظالمون — گفت علت جملہ را ما لم تکونوا تعلمون
چوں منزہ باشد از ہر عیب ذاتِ پاکِ تو — جائے استغفار شاں باشد وہم یستغفرون
امر امر تست یارب با پیمبر در پنج — گفتۂ ان ابرموا امراً فانا مبرمون
گوش حس باطنم کر باد اگر نشنودہ ام — باند ایت ارجعی کلٌ الینا یرجعون
در ازل ماں گفتۂ لا تقنطوا من رحمتی — دیگراں را گفتۂ منہم اذا ہم یقنطون

دوسری آیات و فقرات جو نظم ہوئے ہیں' وہ اس طرح پر ہیں:

نسارع لہم فی الخیرات بل لا یشعرون، ہذا الذی کنتم بہ تستعجلون، مما یکسبون، انا الیکم مرسلون، آمنا برب العالمین، انا لنحن الغالبون، وہم لا یخلقون، وہم لا ینصرون، وہم لا یسمعون، وانتم تکفرون، وکانوا یعبدون، وہم لا یہتدون، وما یجحدون، فیہا خالدون، وانتم معرضون، کنتم تکتمون، الا وانتم مسلمون، انہم لا یذکرون، ما تشتہون، ما یعرشون، انہم لا یعجزون، فہم لا یؤمنون، فہم لا یتقون، فہم لا یشکرون، یفعلوا ما یؤمرون، وہم لا یحزنون، وہم لا یظلمون، انا عاملون۔ اور آخری بیت یہ ہے ؎

شعر بخواں التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون

(ص ۵۳۴ - ۵۳۶)

حکیم سنائی سچے دیندار مسلمان تھے، روزہ کا بڑا اہتمام کرتے، اس کے گذرنے پر ان کو قلق ہوتا، ان کے دیوان میں ایک قطعہ ہے جو ماہ رمضان کے ختم پر نظم ہوا تھا، چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے ماہِ صیام ارچہ مرا خود خطرے نیست — حقا کہ مرا ہچو تو مہمان دگرے نیست
از دردِ تو اے رفتہ بناگہ ز برِ ما — یک زاویۂ نیست کہ پر خون جگرے نیست
آں کیست کہ از ہجر تو یک قطرہ ببارید — کاں قطرہ کنوں در صدف دیگہرے نیست
اے وائے بر آں کز غم وقتِ سحرِ تو — او را بجز از وقتِ صبوحی سحرے نیست
بسیار تو آئی و نہ بینی ہمہ را زانک — ما بر گذریم از تو ترا خود خبرے نیست
آں دل کہ ہمی ترسد از شعلۂ آتش — واللہ کہ بجز روزہ مر او را سپرے نیست
بس کس کہ چو ما روزہ ہمی داشت ازیں پیش — امروز بجز خاک مر او را مقرے نیست
اے داوہ بیاد ایں مہ با برکت و با خیر — ما ناکت ازیں آتش در دل شررے نیست
اشکے دو سہ امروز دریں بقعہ فرو بار — کاندر چمن عمر تو زیں بہ مطرے نیست

(دیوان ص ۹۹)

اب میں ایک قطعہ کے چند شعر نقل کرنا چاہتا ہوں، جو سنائی کے دینی افکار کا نچوڑ ہے، اس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے، سیف الدین باخرزی (متوفی ۶۵۹ھ) کا ایک قول فوائد الفواد حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے نقل ہے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں سنائیؒ کے ایک قصیدہ کا مسلم کردہ ہوں:

(۱) شغل سرہنگان دین از مردِ متواری مجوے سیرتِ ابرار را در طبعِ اضراری مجوے

(وہ آدمی جو خلق سے گریزاں ہو، وہ دینی سپاہی نہیں بن سکتا، جس کی طبیعت میں ایذارسانی ہو، وہ اگر سیرتِ ابرار کا دعویٰ کرے تو غلط ہے)

(۲) از ہوائے فقر مرداں کاخِ فغفوری مخواہ در سرائے سوزِ سلماںؓ تختِ جباری مجوے

(مردانِ خدا کو کاخِ فغفوری سے کیا مناسبت، اور سلمانؓ کو جو دردِ عشق میں جلتے تھے، شان و شوکت سے کیا تعلق؟)

(۳) در میان دو کداں لافِ ہر تر دامنی نیزہ و گرز و کمان و تیر عیاری مجوے

(ہر دعویدار میدان دین کا سپاہی نہیں ہو سکتا،

... ...

(۴) خصلت بوذرؓ نداری گام دیں داری منہ قوتِ حیدرؓ نہ داری نامِ کراری مجوے

(ابوذر غفاریؓ کی خصلت کے بغیر دین کی راہ میں کامیابی ممکن نہیں، کراری کا لقب اسی کو زیب دیتا ہے، جو حیدرؓ جیسی طاقت رکھتا ہو)

(۵) خارہائے راہِ درویشانِ آں درگاہ را درکفِ دستِ عروسِ مہدِ عماری مجوے

(راہِ عشق بڑی پُرخطر ہے، عیش و عشرت میں پلے ہوئے اس راہ کی تاب نہیں لاسکتے)

(۶) ہر کسے را نورِ صدقِ عشق ایں رہ کے دہد صورتِ خورشید را اندر شبِ تاری مجوے

(عشق کا نور اسی دل میں آسکتا ہے جس میں ایمان کی دولت موجود ہے، جس دل میں بے ایمانی کی تاریکی ہوگی وہ خورشید کی روشنی سے محروم رہے گا)

(۷) برسر طویلۂ ہوا طنبور شہوت می زنی	عشق داری لن ترانی را بیا خواہی بجوے

(ہوا و ہوس میں گرفتار انسان اگر دعویٰ عشق کرے تو جھوٹا ہے، اس کا دعویٰ جواب لن ترانی کا متقاضی نہیں ہوسکتا)

(۸) ور تو خواہی نفس شیطانی ز تو بیزاری کند	نام عشقِ دوست راجز از سر زاری مجوے

(محبوب حقیقی کے نام کا زاری کے ساتھ ورد شیطان کی بیزاری کا موجب ہوتا ہے)

(دیوان ص ۱۴ھ - ۵۱۵)

حکیم سنائی کے دو قصیدوں کے منتخب اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں یہ قصائد شروع سے آخر تک دینی اور اخلاقی تعلیم کے بہترین نمونے ہیں، ان کا شمار سنائی کے بلند ترین منظومات میں ہوتا ہے، پہلا قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

شرط مرداں نیست در دل عشقِ جاناں داشتن	پس دل اندر بندِ وصل و بندِ ہجراں داشتن

بلکہ اندر عشقِ جاناں شرطِ مردان آں بود	بر در دل بودن و جاں پیشِ فرماں داشتن

شرطِ مومن چیست اندر خویشتن کافر شدن	شرطِ کافر چیست اندر کفر ایماں داشتن

ہرچہ دست آویز داری جز خدا آں ہیچ نیست	چوں عصا چند داشتن در دستِ ثعباں داشتن

کے تواں با ہمرہانِ خطۂ کون و فساد	جانِ خود را محرمِ اسرار فرقاں داشتن

بگذر از نفسِ بہیمی تا نباید جانت را	صورتِ تخییل ہر بے دیں ببرہاں داشتن

تا کے از کاہل نمازی اے حکیم زشت خوے	ہمچو دوناں اعتقاد اہلِ یوناں داشتن

صدقِ بوبکری و صدقِ حیدری کردن رہا	بس دل اندر زمرۂ فرعون و ہاماں داشتن

عقل نبود فلسفہ خواندن ز بہر کاہلی	عقل چہ بود جاں پنی خواہ دینی خلا داشتن

دین و ملت سفینے دیر جہاں نقش حکمت دوختن	نوح و کشتی نے و بر جاں عشقِ طوفاں داشتن

دیں نباشد با مراد و با ہوا در ساختن ‌ ‌ ‌ دیں چہ باشد خویشتن در حکم یزداں داشتن
آخرت داں عشوہ دہ را ستر شرع آموختن ‌ ‌ ‌ فتنہ داں دیو را مہر سلیماں داشتن
زہد چہ بود ہر چہ جز حق روے ازاں برتافتن ‌ ‌ ‌ زہد نبود روئے چوں طاعوت و قطراں داشتن
فقر نبود یاد را از خاک خفتاں دوختن ‌ ‌ ‌ فقر چہ بود یاد را از بود عریاں داشتن
دشمنِ خود باش زیرا جز ہوا نبود ترا ‌ ‌ ‌ تا تو یار خویش باشی عشقِ یاراں داشتن
اہل دنیا اہل دیں نبوند از یرا راست نیست ‌ ‌ ‌ ہم سکندر بودن و ہم آبِ حیواں داشتن
چوں ز راہِ صدق و صفوت نز من آید نز شما ‌ ‌ ‌ صدقِ بوذر رض داشتن یا عشقِ سلمان رض داشتن
بو ہریرہ رض وار باید یاری اندر اصل و فرع ‌ ‌ ‌ گہ دل اندر دین و گہ دستے در انباں داشتن
دیں ز درویشاں طلب زیرا کہ شاہاں را مقیم ‌ ‌ ‌ رسم باشد گنجہا در جائے ویراں داشتن

(ص ۴۵۷ ببعد)

ذیل میں چند اشعار اس قصیدے سے منتخب ہیں جو سنائی کے مشہور ترین قصیدوں میں ہے، یہ قصیدہ دینی و عرفانی مطالب سے پُر ہے، اس کی پیروی میں متعدد شاعروں نے قصیدے لکھے ہیں، عرفی شیرازی کا بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے، جس کی یہ مشہور بیت ہر صاحبِ ذوق کی زبان پر ہے

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی ‌ ‌ ‌ حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

سنائی کا جو قصیدہ اس زمین میں ہے، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

دلا تا کے دریں زنداں فریب ایں و آں بینی ‌ ‌ ‌ یکے زیں چاہِ ظلمانی بروں شو تا جہاں بینی
جہانے کاندرو ہر دل کہ یابی پادشا یابی ‌ ‌ ‌ جہانے کاندرو ہر جان کہ بینی شادماں بینی
درو گر جامہ دوزی ز فضلش آستیں یابی ‌ ‌ ‌ درون گر خانہ سازی ز عدلش آستاں بینی
نہ بر اوجِ ہوا او را عقابِ دل شکر یابی ‌ ‌ ‌ نہ اندر قعر بحر او را نہنگے جاں ستاں بینی

اگر در باغِ عشق آئی ہمہ فرّاشِ دل یابی — وگر در راہِ دین آئی ہمہ نقّاشِ جاں بینی
سبک رو چوں توانی بود سوئے آسمان تا تو — ز ترکیبِ چہار ارکاں ہمی خود را گراں بینی
گر از میدانِ شہوانی سوئے ایوانِ عشق آئی — چو کیواں در زمانِ خود را بہ ہفتم آسماں بینی
دریں رہ گرم رو می باش لیک از روئے نادانی — نگر زنہار یک ساعت ہرگز کہ ایں رہ را کراں بینی
دگر زی حضرتِ قدسی خراماں کردی از عزت — ز دار الملکِ ربّانی جنیبتہا روان بینی
ز حرص و شہوت و کینہ بہر زاں کہ پس خود را — اگر دیوی ملک یابی وگر گرگی شباں بینی
در امروز اندریں منزل ترا جانے زیاں آمد — نہے سرمایہ و سود ار کہ فردا زاں زیاں بینی
گر او باش طبیعت را بروں آری ز دل زاں پس — ہمہ رمز الٰہی را ز خاطر ترجماں بینی
مر ایں مہمانِ علوی را گرامی دار تا روزی — چو زیں گنبد بروں پرّی مر او را میزباں بینی
نظرگاہِ الٰہی را یکے بستان کن از عشقے — کہ در وے رنگ و بوئے گل زخونِ دوستاں بینی

ایسے حکیمانہ اشعار نہ صرف فارسی ادبیات میں شاذ ہیں، بلکہ دوسری زبانوں میں مشکل ہی سے نظر آئیں گے، یہ قصیدہ دراصل اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

اب یہاں سنائی کے بعض خیالات کو بطور اختصار پیش کیا جاتا ہے۔

علم بے عمل بیکار ہے، مگر علم کے لیے اخلاص بہت ضروری شرط ہے، علم سے انسان میں فروتنی آنا چاہیے، اگر ایسا نہ ہو تو گویا علم بے سود رہا، عالم کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے، اس کے بگاڑ میں عالَم کا بگاڑ ہے، بے دین عالم کی مثال چور کی سی ہے جس کے ہاتھ میں چوری کرتے وقت ایک چراغ ہے اور وہ چن چن کر اچھی چیزیں چراتا ہے۔

ز بار فقہ و باد فقر دیں را ہیچ نکشاید — میاں در بند کاری را کہ ہیں نکہت آں آید
چو علت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ نفع آید — گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

چو علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد

(دیوان ص ۵۴)

علم کز تو ترا بستاند جہل ازان علم بہ بود صد بار
آبِ حیواں شدہ گرہ در حلق زہر گشت ار چہ بود نوش گذار
نہ بداں لعنت است بر ابلیس کہ نداند ہمی یکیں ز یسار
بل بداں لعنت است کاندر دیں علم داند بعلم نکند کار
دوری از علم تا ز شہوت و خشم جانت پر بیکر است دیر پیکار

(ص ۲۰۰)

حکیم سنائی نے موت کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا ہے، دنیا قابل ترک ہے، اس میں دل لگانا چاہیے، موتوا قبل ان تموتوا کے یہی معنی ہیں، دنیا کے یہ جھگڑے انسان کو راہ دین سے روکنے کے لیے کافی ہیں، ایسی زندگی سے موت بہتر ہے، دراصل زندگی کے پُرپیچ مسائل کے پیش نظر موت کو پسند کرنا چاہیے، یہی موت دروازۂ زندگی ہے، موت ہی سے انسان زندہ ہوتا ہے، اس لیے اس سے ڈرنے کے بجائے اس کی پذیرائی کرنی چاہیے، اب اس سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بمیر اے حکیم از چنیں زندگانی کز ایں زندگانی چو مُردی بمانی
ازیں زندگی زندگانی نخیزد کہ گرگست وناید ز گرگاں شبانی
بہ پیش ہمائے اجل کش چو مرداں بقیاری ایں خانۂ استخوانی
ازیں مرگ صورت نگر تا نترسی ازیں زندگی ترس کاکنوں درانی
کہ از مرگ صورت ہمی رستہ گردد اسیر از عوان و اسیر از عوانی
بدرگاہ مرگ آے ازیں عمر زیرا کہ آنجا امان است و اینجا امانی

بجز پیچ مرگ یابت زخستو — زعشق سنگِ کابل کا بد ا.نی
بجز مرگ در گوش جانت که خواند — که بگذر ازین منزلِ کاروانی
بجز مرگ با جان عقلت که گوید — که تو میزبان نیستی میهمانی
بجز مرگ اندر حیات که گیرد — ازین شوخ چشمانِ آخر زمانی
اگر مرگ نبود که بازت رهاند — ز درس گرانان و درسِ گرانی
اگر مرگ خود هیچ راحت ندارد — نه بازت رهاند همی جاودانی

(ص ۶۷۶-۶۷۷)

سنائی کے نزدیک عشق کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہے، عقل تدبیر کے تابع ہے، عشق کے نزدیک تدبیر بے اثر ہے، صحرائے عقل میں ہر تدبیر بازیچۂ تقدیر ہے، لیکن عشق ایسا عیار ہے جو تقدیر کی تہ دیر سے بچ جاتا ہے، جبکہ عقل کا مدار تدبیر ہی پر ہے، بازارِ عقل کے سودا خور و خواب ہیں، جہاں عاشقی میں کچھ نہیں، اقبال کا حسب ذیل شعر سنائی کی تفصیل کا اجمال ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

بہرام شاہ کے مدحیہ قصیدہ میں عشق کے مضمون کا بیان سوائے آخری بیت کے شروع سے آخر تک ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عقل را تدبیر باید عشق را تدبیر نیست — عاشقان را عقل تر دامن گریبان گیر نیست
عشق بر تدبیر خندد زانکہ در صحرائے عقل — ہر چہ تدبیر است جز بازیچۂ تقدیر نیست
عشق عیار است بر تہ دیر تقدیرش چہ کار — عقل با حفظ است کو با کار جستہ بیر نیست
علم خورد و خواب در بازار عقل است و حواس — در جہانِ عاشقی ہم خواب و ہم تعبیر نیست
کار عقل است اے سنائی شیر دادن طفل را — خون خورد چون شیر عشق اینجا حدیث شیر نیست

مرد عشق از صد ہزاراں دل بہ یکدم بہ دست   حامل اندر دستش از تقصیر چون تشویر نیم
عاشقی با خواجگی خصمت زداں در کوئے عشق   ہر کجا چشم افگنی تیر است یکسر تیر نیم
عین شین و قاف را آنجا کہ در سِر عاشقی ست   جز کہ عین و غین و قاف آنجا دگر تفسیر نیم

(دیوان ص ۹۴۴)

مختصر یہ کہ دیوان سنائی ایک سمندر ہے، جس میں عرفان و حکمت کے لاکھوں گوہر نایاب ہیں ان کے حصول کے لیے علم و فن کے بڑے غواص درکار ہیں، سنائی کے کلام کے یہی امتیازات ہیں جو ادیبوں، شاعروں اور دانشمندوں سے خراجِ تحسین لیتے رہے ہیں، وہ اپنے ہی دور میں شہرت کے مالک بن چکے تھے، چنانچہ شاعروں اور ادیبوں نے ان کی صرف تعریف ہی نہیں کی بلکہ ان کے اشعار (بالخصوص قصیدہ اور قطعات سے) اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے، ان کے معاصرین میں تین شخصیتیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اول ابوالفضل رشید الدین میبذی، دوم عین القضاۃ ہمدانی اور تیسرے نصر اللہ غزنوی، اول الذکر نے اپنی تفسیر کشف الاسرار میں جو دس جلد[1] طبع ہو چکی ہے، سنائی کے قصیدوں سے کئی سو اشعار نقل کیے ہیں، کشف الاسرار کی تالیف سنائی کی زندگی ہی میں یعنی سنہ ۵۲۰ھ میں شروع ہوئی، اور آخری جلد کی تکمیل کے وقت بھی سنائی بقیدِ حیات تھے، میبذی کا انداز اس طرح پر ہے:

اگرت ایں روز آرزو ست از خود بیروں آئی چنانکہ مار از پوست جز از درگاہ او خود کہ قرارگاہ دلِ دوستاں فنائے او ست:

چہرۂ عذرات باید بر در دامن نشیں   عشق بود دولت با بدگام سلمان را
(ج ۱۰، ص ۳۳)

[1] اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو راقم کا مضمون بعنوان "حکیم سنائی غزنوی کی مقبولیت خود اپنے زمانے میں" مجلۂ علوم اسلامیہ ۱۹۷۹، ص ۱۷ - ۱۰۰۔

اسی قصیدہ کی دوسری بیت دوسری جلد ص ۴۷ا پر درج ہے :

راز دوستی با کس مگوئید و سرِ دوستی بر نا اہلاں اظہار مکنید، و چہرۂ جمالِ حقیقت را بتیغ تعزز زود مگذارید تا دیدۂ ہر نامحرم بدو ننگرد :

چوں خوری مے با حریفِ محرم پرّ دردخور   چوں زنی گم با ندیم زیرک ہشیار زن

اسی قصیدہ کی ایک تیسری بیت اسی جلد کے ص ۳۵۴ پر اس طرح آئی ہے :

ہر کہ خویشتن را پسندید و بعادت و خود نگرید در تو بہ بر وے فرو بستند و آب فلاح از وے باز گرفتند :

دور شو از صحبتِ خود پرور عادت پرست   بوسہ بر خاک کفِ پائے ز خود بیزار زن

یہ بیت بہت مقبول تھی چنانچہ ج ۳ میں ص ۲۹۸ اور ص ۴۳۸ پر دوبار، ج ۵ ص ۴۳۴ پر ایک بار اور ج ۸ ص ۱۳۳ - ۱۳۴ پر ایک بار نقل ہوئی ہے، ج ۸ میں منقول ہے: اگر در یک ذرہ ہستی خود بینی در باطن تو ساکن شود حجابیت رسد کہ ہمہ دریا ہائے عالم زائل نگردد :

ع   دور باش از صحبتِ خود پرور عادت پرست الخ

سنائی کے حکیمانہ قصیدہ سے جس کی ردیف بینی ہے متعدد اشعار نقل ہوئے ہیں، انداز بیان اس طرح پر ہے :

در راہ جوانمردی خود را در طاعت دیدن گبرکی است و از آن نگریستن عین دوگانگی :

اگر صد بار در روزی شہید راہِ حق گردی   ہم از گبراں یکی باشی چو خود را در میاں بینی

(ج ا ص ۴۳۶)

پھر فرماتے ہیں : فکرت کہ کند بحکمت کند، بازو اہ پرواز کند در ملکوت الٰہی جولان کند در حضرت حدیث آشیاں نسازد :

بحکمتها توی پر کن تو مر طاؤس عرشی ما | کہ تا این دام گاہ او در انشا جا آشیان بینی
وگر زین حضرت قدسی خرامان گردی از قربت | ز دار الملک ربانی جنیبتها روان بینی

(ج ١ ص ٧٤٩)

عین القضاۃ ہمدانی نے جن کی وفات ٥٢٥ھ میں ہوئی، اپنے کلام میں سنائی کے اشعار نقل کیے ہیں، ان کے مکتوب میں سنائی کے اشعار جس طرح نقل ہوئے ہیں، ان کی دو ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

اے عزیز ندیدی کہ چون عجب براہ آید ترک طاعت بہ بود، اگر نہ چرا گفت ضلیلك بتركها

بہر چہ از راہ باز مانی چہ کفر آن دین وچہ ایمان | بہر چہ از دوست وا مانی چہ زشت آن نقش و چہ زیبا

با این ہمہ نشاید کہ تو با کامل یا عامی دیگر .... ہمہ در راہ دین در دائرۂ عوام مقام دارید۔
(بخش اول ص ٤٣٠)

یہ بیت سنائی کے مشہور قصیدہ بمطلع زیر سے ماخوذ ہے:

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا | قدم زین ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باش و نہ آنجا

(دیوان ص ٥١)

اے دوست بلال حبشی می گفت: اشہدان لا الہ الا اللہ، بہ سین گفت، بہ شین معجمہ نمی توانست گفت، پس سید صلعم گفت: سین بلال عند اللہ شین، اما ابوجہل و ابولہب اشہد راست توانستند گفت، چہ گوئی اہل قرآن اہل اللہ و خاصتہ ابوجہل بود یا بلال؟ لا بل ترکت الرای بالرای، عالمی نہ آنست کہ تو دانستہ، تا این غایت سنائی گوید:

امامت گر ز کبر و حرص و بخل و کین بہ در آید | بدوزخ دانش از معنی ودش در گلستان بینی
وگر چہ طیلسان دارد مشو غرہ بدان کانجا | یکے طوقیست از آتش تو آن کش طیلسان بینی
(بخش ٢ ص ٤٩ - ٥٠)

نصراللہ غزنوی (متوفی [illegible]ھ) نے کلیلہ و دمنہ میں سنائی کے قصائد سے استشہاد کیا ہے۔ نصراللہ سنائی کا معاصر تھا، اور کلیلہ و دمنہ حکیم کی حیات ہی میں مکمل ہوئی تھی، نصراللہ کے استفادہ کی صورت یہ ہے:

باز باید گشت و آسایش داد تا باہم مجلس انس خرامیم کہ راست نیاید چنیں:

دو جہاں شاہدی و فانی | در قدح جرعۂ دما ہشیار
خیز تا آب روے بنشانیم | باد ایں خاک تودۂ غدار
ترکتازی کنیم و برشکنیم | نفس رنگی مزاج را بازار

یہ ابیات سنائی کے مشہور و معروف عارفانہ قصیدہ مطلع ذیل سے ماخوذ ہیں:

کلیلہ و دمنہ طبع استاد قریب ص ۳۰۲

طلب اے عاشقانِ خوش رفتار | طرب اے نیکوانِ شیریں کار

(دیوان ص ۱۹۶)

دو دریں مجمع آں بوم کہ بکشتن او اشارت می کند حاضر بود، گفت:

گرچو نرگس زمستی شوخ و چو لالہ تیرہ دل | پس دور روده زبان ہمچو گل و سوسن مباش

(کلیلہ و دمنہ ص ۱۹۰)

یہ بیت سنائی کے ایک قصیدہ سے منقول ہے جس کا مطلع یہ ہے:

اے سنائی خواجۂ جانی غلامِ تن مباش | خاک را گر دوست بوی پاک را دشمن مباش

(دیوان ص ۳۲۹)

ہندوستان میں بھی حکیم سنائی کا کلام کافی مقبول تھا، حسن نظامی کے تاج المآثر میں ان کے اشعار مل جاتے ہیں، محمد عوفی نے جامع الحکایات میں حکیم کے قصیدوں کے اشعار سے جابجا کلام کو

مرتب کیا ہے، مثلاً ایک جگہ مذمتِ حرص کے ذیل میں آیا ہے:

ہر چیز کہ فرزند آدم را باشد پیر شود و ضعیف گردد جز دو چیز: امل و حرص و سنائی گوید:

چو حرص اندر شرہ آید، دم گیر از من کہ در منزل | بیابان بود و تا بستان و آبِ سرد و استسقا
گرداں عمرِ من چوں گل کہ در طفلی شود کشتہ | گرداں حرصِ من چوں گل کہ در پیری شود برنا

(قسم ۳، جز ۱ ص ۵۸)

یہ اشعار سنائی کے مشہور قصیدہ سے ماخوذ ہیں جس کا مطلع یہ ہے:

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں والا | قدم زیں ہر دو بیروں نہ، نہ اینجا باش نہ آنجا

(دیوان ص ۵۱)

ایک جگہ مرگ کو آسائش بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

چنانکہ زبانِ نبوت علیہ السلام بیان می فرماید کہ "الموت راحۃ" ..... و حکیم عجم سنائی گوید:

اگر مرگ خود ہیچ راحت ندارد | نہ بازت رہاند ہمی جاودانی
اگر خوش خوئی از گراں قلتبانان | اگر بد خوئی از گراں قلتبانی

(قسم ۳ جز ۱ ص ۳۱۶)

یہ اشعار حکیم کے قصیدے سے منقول ہیں جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

بمیر اے حکیم از چنیں زندگانی | کزیں زندگانی چو مردی بمانی

(دیوان ص ۶۷۵)

حکیم سنائی کے قصائد ہندوستانی صوفیہ کے ملفوظات میں نقل ہوتے رہے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاؒ کی روایت سے فوائد الفواد میں ایک حکایت نقل ہوئی ہے:

"تھوڑی دیر خواجہ حکیم سنائی (خدا ان کی مٹی پاک کرے) کے بارے میں گفتگو ہوئی، حضرت نے

فرمایا کہ شیخ سیف الدین باخرزی (خدا ان کے مرقد کو روشن کرے) نے بارہا کہا ہے کہ میں سنائی کے ایک قصیدے کا مسلمان کردہ ہوں طیب اللہ ثراہ، ایک صاحب تشریف رکھتے تھے، سنائی کے ایک قصیدے کی ایک بیت پڑھی اور ایسا ظاہر کیا کہ یہ بیت اسی قصیدے کی ہے (جس کی طرف شیخ باخرزی نے اشارہ کیا تھا) ان بزرگ نے جو بیت پڑھی وہ یہ تھی:

برسرطنبورِ ہوا طنبورِ شہوت می زنی   عشق مردان ترانی را بدین خواری مجوے

اس کے بعد حضرت خواجہ ذکرہ اللہ نے فرمایا کہ حسب ذیل بیت مذکورہ بالا بیت کے متصل ہے:

خاک پائے راہ عیارانِ این درگاہ را   درکفِ دست عروس ہید عاری مجوے

..... پھر فرمایا کہ شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا کہا ہے کاش کوئی مجھے وہاں لے جاتا جہاں سنائی کی خاک ہے یا ان کی خاک لاتا کہ میں اس کو سرمہ بناتا۔

یہ بیت سنائی کے ایک مختصر قصیدے کی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

شغلِ سرہنگانِ دین از مردِ متواری مجوے   سیرت ابرار را در طبع اضراری مجوے

(دیوان ص ۱۴۷)

سنائی کا ایک دوسرا مشہور قصیدہ یہ ہے:

بسکہ شنیدی صفتِ روم وچین   خیز بیا ملکِ سنائی ببین

اس قصیدہ میں عارفوں اور خدا والوں کی بلند حوصلگی اور سیر دلی کا اجمالی بیان ہے اور اس کا ہر شعر سنائی کی شخصیت کا مظہر ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

تا ہمہ دل بینی بے حرص و بخل   تا ہمہ جاں بینی بے کبر و کیں

زرہ وکان ملکے زیر دست   جونہ و اسپ فلکے زیر زیں

پائے نہ و چرخ بزیر قدم   دست نہ و ملک بزیر نگیں

رختِ کیانی نہ، و او روح دار — تخت برآوردہ بچرخ بریں
رستہ زترتیب زمین و زمان — جستہ زترکیب شہور و سنین
بود چو یوسف بچہ ورفتہ باز — تا فلک از جذبۂ حبل المتین
زیر قدم کردہ ز اقلیم شک — تا بہ نہانخانۂ عین الیقیں
با دلِ او خاک مثال ینال — با کفِ او سنگ نگین تگیں

(ص ۵۴۵)

اس قصیدے کی نسبت سے خیر المجالس (ص ۱۴۳ - ۱۴۶) (تالیف ۷۵۶ھ) میر طویل حکایت نقل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ روم کے شہزادہ کو جب اس قصیدے کے م اطلاع ملی تو اس نے وزیر سے ملک سنائی کی حقیقت جاننی چاہی، وزیر نے کہا کہ اس سے ملک نہیں بلکہ ملک فقر یا عرفان مراد ہے، جس کی حقیقت صرف اہل فقر و اہل عرفان ہی ج شہزادہ کو تشفی نہ ہوئی تو اس نے غزنی کا رخ کیا، اور سنائی کو دیکھا کہ ایک مزار میں خرقہ چھپائے قبلہ رو بیٹھے ہیں، شاہزادہ ان کے پاس گیا اور زمین پر سر رکھ دیا، حکیم نے سر شاہزادے سے مخاطب ہوا، شاہزادے نے اپنا مقصد بیان کیا، سنائی نے کہا کہ اگر ہما ملک کو دیکھنے کی تمنا ہے تو اپنے باپ کے ملک کی خواہش ترک کر دو اور یہ خرقہ پہنو، شاہزادے خرقہ پہنا بے ہوش ہو گیا، ہوش میں آیا تو سنائی نے پوچھا کہ میرا ملک دیکھ لیا؟ شہزادے نے دیکھ لیا، آپ نے اس بیت میں کسر چھوڑ دی ہے، ملک روم و چین کی کیا حقیقت ہے سارا اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے، وہ حکومت اور دولت سے دستبردار ہو گیا اور ایک کملی اوڑھ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے ملک کا ایک حصہ اس کو عنایت کر دیا، اس طرح عارفوں کی صف میں جگہ مل گئی۔

مختصر یہ ہے کہ سنائی کے کلام خصوصًا ان کے قصائد کی مقبولیت صرف ادیبوں اور شاعروں
لں محدود نہ تھی، صوفیوں اور عارفوں کے یہاں وہ یکساں مقبول تھے، اور ان کی یہ مقبولیت اسلامی
ُنیا کے بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، جو خود ان کے زمانے سے شروع ہوکر صدیوں تک باقی رہی،
ور اس غیر معمولی مقبولیت کی وجہ ان کی سیرت کے وہ بلند پہلو ہیں جو ان کی شاعری میں پوری طرح
نمایاں ہیں۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سنائی کے قصائد عرفانی اور دینی افکار کے ایسے نمایندہ ہیں جن کی
مثال فارسی میں نہیں ملتی، سنائی عام طور پر صوفی شاعر سمجھے جاتے ہیں، جن کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے
ٔ وہ خانقاہ میں بیٹھے مریدین کی اصلاح میں مصروف ہوں گے، وہ صوفی ضرور تھے، مگر ان کا میدان
ٔدہ پورا معاشرہ تھا، ان کے مخاطب صرف ان کے مریدین ہی نہ تھے، بلکہ معاشرے کا ہر فرد تھا، اور
ُن کے خطاب میں جرأت و بے باکی ملتی ہے، وہ ہر شخص کی کوتاہیوں کا بے جھجک اظہار کر دیتے
اسی بنا پر ان کی شاعری ایک پیغام ہے، ان کے یہاں حرکی عنصر کا غلبہ ہے، ان کے یہاں دین کا
ایک وسیع تصور ہے، وہ عمل کے قائل تھے، باطل سے تعاون نہیں کرنا چاہتے تھے، ان کا برملا اظہار
وہ ضروری سمجھتے، اسی وجہ سے ان کے یہاں طنز سے زیادہ تنقید کا رنگ نمایاں ہے، اور اسی کا
نتیجہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی بہت تھے، یہی وہ خصوصیت ہے جس میں ان کا کلام سارے
عارفانہ کلام سے ممتاز ہے، سطور بالا میں اسی خصوصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے،
اور چونکہ اب تک حکیم سنائی کے کلام کے اس رخ کو نمایاں نہیں کیا گیا ہے ممکن ہے کہ میرے بیانات
کچھ عجیب معلوم ہوں، لیکن میرا یقین یہی ہے کہ سنائی کے کلام کا غائر مطالعہ اسی نتیجے پر
پہونچائے گا۔

امام ابو معشر سندی صاحبُ المغازیؒ

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

(۲)

کوفہ میں امام اعمش سے ملاقات اور علمی گفتگو

ابو معشر سنہ ۱۶۱ھ میں خلیفہ مہدی کی دعوت پر بغداد گئے اور وہیں فوت اس سے پہلے کسی روایت سے ان کا مدینہ منورہ سے نکلنا معلوم نہیں؛ اس درمیان میں ایک بار کوفہ میں امام اعمش (ابو محمد سلیمان بن مہران مولیٰ بنی کاہل المعروف بہ ا سنہ ۶۱ھ ۔ سنہ ۱۴۸ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک دینی و علمی گفتگو میں شریک ہوئے، ا نے میزان الاعتدال میں ابو معشر کے تلمیذ سعید بن منصور کی زبانی ان کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک اعمش کے پاس بیٹھا تھا، انھوں نے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں سے ہوں، اسپر انھوں نے پوچھا کہ نبیذ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ میں نے ان کے جواب

حدثنی نافع عن ابن عمر ان	مجھ سے نافع نے بیان کیا کہ ابن عمرؓ نے کہا؛
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ
قال ما اسکر کثیرًا فقلیلہ حرام،	جو چیز زیادہ نشہ پیدا کرے اس کا کم بھی حرام ہے
وحدثنی موسیٰ بن عقبۃ عن سالم	اور مجھ سے موسیٰ بن عقبہ نے بھی سالم صحابی
عن ابیہ مرفوعًا مثلہ [1]	اسی کے مثل بیان کیا ہے۔

[1] میزان الاعتدال ج ۳، ص ۲۴۹۔

امام اعمش اپنے زمانہ میں علی الاطلاق محدث اہل کوفہ تھے، بقول ابن مدینی انھوں نے کوفہ میں علم دین کو امت کے لیے محفوظ کیا ہے، اپنے اقران و معاصرین میں فہم قرآن حفظ حدیث اور علم فرائض وغیرہ میں سب سے آگے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی رکاب تھامنے اور ان کی دعا لینے کا شرف رکھتے تھے، وہ دین ہی دین اور علم ہی علم تھے، امام ابومعشر نے ان کے سوال کا جواب جس حکیمانہ اور مؤدبانہ انداز میں دیا ہے، وہ ان کے تفقہ فی الدین اور بصیرۃ بالحدیث کی دلیل ہے، اپنی دو سندوں سے جو سلسلۃ الذہب کا درجہ رکھتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سنادی جس میں مسکر کے بارے میں اصولی اور عام حکم ہے، نہ نبیذ کی حلت و حرمت کی بحث چھیڑی اور نہ اس کی کیفیت و کمیت کے بارے میں کوئی بات کی، امام اعمش بھی یہ جواب سن کر خاموش ہوگئے، اور ان کو معلوم ہوگیا کہ نبیذ کے بارے میں ابومعشر کا مسلک کیا ہے۔

خلیفہ مہدی کی دعوت پر بغداد میں قیام

معلوم ہو چکا ہے کہ امام ابومعشر بچپن میں غلام بن کر مدینہ منورہ آئے اور ایک مخزومیہ عورت کی غلامی کے بعد خلیفہ مہدی کی والدہ ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ کی ولاء میں چلے گئے، جس سے آزادی کے بعد بھی ان پر ایک قسم کی پابندی تھی اور سنہ ۱۶۰ھ تک جب کہ ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی، یہیں متاہل زندگی بسر کی، صرف ایک بار کوفہ جانے کا ثبوت ملتا ہے، مگر آخری عمر میں مدینہ منورہ چھوڑ کر بغداد جانا پڑا، یا یوں کہیے کہ نسبتِ ولاء نے ابومعشر کو مدینہ منورہ کی مسند علم و فضل سے اٹھا کر بغداد کے قصر جاہ و حشم میں پہونچا دیا۔

خلیفہ مہدی نے سنہ ۱۶۰ھ میں حج ادا کیا، اس کے بعد مدینہ منورہ حاضری دی، اور اپنے حق ولاء کی بنا پر خواہش اور فرمائش کی کہ ابومعشر اس کے ساتھ بغداد چلیں اور دربار خلافت سے وابستہ لوگوں کو دینی تعلیم دیں، ساتھ ہی سامانِ سفر کی تیاری کے لیے ایک ہزار دینار پیش کیے، صاحبزادے محمد کا بیان ہے:

قدم المهدی بعد خلافته فی سنة ستين فاشخصه يعنی ابامعشر معه الی العراق وامر له بالف دينار وقال تكون بحضرتنا فتفقه من حولنا فشخص ابومعشر معه الی مدينة السلام سنة احدی وستين[1]

خلیفہ مہدی ۱۶۰ھ میں مدینہ منورہ آیا، اور ابومعشر کو اپنے ساتھ لے گیا، ایک ہزار دینار پیش کرکے کہا کہ آپ ہمارے پاس رہیں گے اور ہمارے حلقہ کے لوگوں کو دینی تعلیم دیں گے، چنانچہ ابومعشر ۱۶۱ھ میں مہدی کے ساتھ مدینۃ السلام (بغداد) چلے گئے۔

امام ذہبی اور حافظ ابن حجر نے بھی اختصار کے ساتھ یہی لکھا ہے۔[2] ابومعشر نے مدینہ منورہ میں ہوش کی آنکھ کھولی، یہیں پروان چڑھے اور یہیں کے علماء و مشائخ سے کسب فیض کرکے کہنا چاہیے کہ پوری زندگی یہاں کی دینی و علمی فضا میں بسر کی، اس مقدس سرزمین کے چپے چپے سے ان کو محبت تھی جس میں پیوند خاک ہونے کی تمنا ہر مسلمان کو ہوتی ہے، اس لیے مدینہ منورہ کی گلی کو چھوڑ کر بغداد کے قصر خلافت میں جانا بطیب خاطر نہیں تھا، بلکہ اپنے مولا و آقا مہدی کے حکم پر اس کے ساتھ بغداد کا سفر کیا اور دس سال کے بعد یہیں پیوند خاک ہوئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بغداد آنے کے بعد بھی ابومعشر کے حالات پردۂ خفا میں ہیں اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مہدی کے دربار سے منسلک رہے بھی یا نہیں، البتہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ان کے خاندان کو فتنۂ معاصرت سے سابقہ پڑا جس سے ان کی اولاد نے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر عالی نسبی کا دعویٰ کیا تھا۔

وفات: ابومعشر کو عمر کی آخری منزل میں ترک وطن کرکے بغداد آنا پڑا، اس وقت ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ رہی ہوگی، یہاں چند ماہ کم دس سال زندہ رہ کر رمضان ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۱۔

قیام بغداد کی یہ مدت پیرانہ ضعف و اضمحلال کی نذر رہی، حتیٰ کہ انتقال سے دو سال پہلے ہوش و حواس میں شدید تغیر پیدا ہو گیا تھا، محدثین کے نزدیک اس عمر کی مرویات معتبر نہیں مانی جاتی ہیں، ان کے شاگرد محمد بن بکار کا بیان ہے:

کان ابو معشر تغیر قبل ان یموت	ابو معشر انتقال سے پہلے شدید اختلال و تغیر
تغیراً شدیداً حتی کان یخرج	میں مبتلا ہو گئے تھے، حتیٰ کہ بعض جسمانی حالات
منه الریح و لا یشعر به [1]	کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

اور خلیلی نے بیان کیا ہے:

و تغیر قبل ان یموت بسنتین تغیراً	ابو معشر انتقال سے دو سال پہلے سخت ذہنی
شدیداً [2]	اختلال میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ابن سعد، خلیفہ بن خیاط، ابن قتیبہ، خطیب بغدادی اور بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے تصریح کی ہے کہ امام ابو معشر بغداد میں ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے، خطیب نے محمد بن بکار کی روایت میں رمضان بھی لکھا ہے، یہ مہدی کے بعد ابو جعفر منصور کی خلافت کا ابتدائی دور تھا۔

ذاتی حالات اور ذکاوت و ذہانت امام ابو معشر کا بدن فربہ، رنگ سیاہ، اور ایک روایت کے مطابق گورا، اور زبان میں لکنت تھی، ذریعۂ معاش خیاطت یعنی کپڑے کی سلائی تھا، نہایت باوقار، مودب اور عابد و زاہد بزرگ تھے، ذکی الحس، فہیم اور فطین آدمی تھے، اس بارے میں مدینہ منورہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، دوسرے کمالات میں بھی بے مثل تھے، ان کے شاگرد ہشیم بن بشیر کا بیان ہے:

ما رأیت مدنیاً اکیس من	میں نے مدینہ کے کسی باشندہ کو ابو معشر سے
ابی معشر و ما رأیت	زیادہ چالاک نہیں پایا، اور نہ کسی مدنی کو

[1] تاریخ بغداد ص ۴۲۹ ج ۱۳۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۲۔

... محدثاً يشبهه [1] — ان کے مشابہ پایا۔

دوسرے شاگرد ابونعیم کا بیان ہے:

كان ابو معشر كيسا حافظاً [2] — ابومعشر نہایت چالاک، معاملہ فہم اور حافظ حدیث تھے۔

حافظ ابن حجر نے یہ دونوں اقوال تہذیب التہذیب میں بھی نقل کیے ہیں۔

لکنت اور ضعف حفظ ذکاوت و کیاست کے باوجود ان میں دو غیر اختیاری کمزوریاں تھیں، ان کے لیے ان کو اپنی مرویات کی صحیح اور مستقیم سند کے ساتھ بیان کرنے میں دقت ہوتی تھی، ایک زبان میں لکنت و عجمیت، جس کی وجہ سے حروف اور الفاظ کو صحیح طور سے ادا نہیں کر سکتے تھے، مثلاً کاف کو قاف کہتے تھے، دوسری کمزوری ضعف حفظ کی تھی (سوئے حفظ کی نہیں) امام ترمذی نے کہا ہے:

وقد تكلم فيه بعض اهل العلم من قبل حفظه [3] — بعض اہل علم (محدثین) نے ان کے حافظہ میں کلام کیا ہے۔

اور امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے:

وكان من اوعية العلم على نقص في حفظه [4] — ابومعشر حافظہ میں نقص کے باوجود علم کا خزانہ تھے۔

اسی کے ساتھ انتقال سے دو سال پہلے شدید قسم کے ذہنی انتشار و اختلال کا شکار ہوگئے اور اس دور کی روایات محدثین کے نزدیک معتبر نہیں مانی جاتی ہیں۔

حدیث و فقہ اور تفسیر و مغازی میں جامعیت امام ابومعشر اپنے دور کے جملہ مدنی علوم و فنون کے جامع تھے، اور فقہ و فتویٰ، حدیث و تفسیر، سیر و مغازی اور اخبار و ایام میں ممتا

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ قسم ۱ ص ۴۹۴ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۹ [3] جامع ترمذی باب ما جاء فی حشاء صلی اللہ علیہ وسلم علی الهدیۃ۔ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۶۔

مقام رکھتے تھے۔

تفقہ فی الدین کی شہرت ان کو بغداد لے گئی، اور خلیفہ مہدی نے اسی کی تعلیم کے لیے یہ کہہ کر اپنے پاس بلایا تھا:

تکون بحضرتنا فتفقه من حولنا۔	آپ ہمارے یہاں رہیں گے اور ہمارے آدمیوں کو فقہ کی تعلیم دیں گے۔

ابن القیسرانی نے الانساب المتفقہ میں ان کا تذکرہ فقہاء میں کیا ہے[1]۔ اور امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں الفقیہ کے خطاب سے یاد کیا ہے[2]، ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے[3]، ابن قتیبہ نے اصحاب الحدیث کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے[4]، امام ذہبی نے حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، ان کے استاد محمد بن کعبؒ قرظی اعلم بتاویل القرآن تھے، شاگرد بھی تفسیر کے مستند عالم ہیں، امام احمدؒ نے ان سے محمد بن کعبؒ کی تفسیری روایات لینے کا مشورہ دیا ہے، اسی کے ساتھ امام ابومعشر سیر و مغازی اخبار و احداث میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، امام احمدؒ نے فرمایا ہے:

کان بصیرًا بالمغازی[5]	وہ مغازی کے صاحب نظر عالم تھے۔

ابن ندیم نے لکھا ہے،

عارف بالاحداث والسیر واحد المحدثین[6]	وہ تواریخ واحداث اور سیر و مغازی کے عارف اور محدث تھے۔

خطیب بغدادی نے ان کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے:

کان من اعلم الناس بالمغازی[7]	وہ مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے۔

---

[1] الانساب المتفقہ ص ۱۰۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶ [3] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۱۸۔
[4] المعارف ص ۲۲۰۔ [5] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۸ [6] الفہرست ابن ندیم ص ۱۳۷ [7] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۲۷

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب المغازی اور العبر میں صاحب المغازی و
لکھا ہے، خلیلی نے ان کی جامعیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

ابو معشر له مکان فی العلم و	علم اور تاریخ میں ابومعشر کا خاص مقام ہے
التاریخ وتاریخه احتج به	اور ان کی کتاب المغازی کو ائمہ نے قابل حجت
الائمة[1]	اور مستند قرار دیا ہے۔

اسی طرح زہد و رقاق کے باب میں علماء نے ان کی مرویات کو خاص اہمیت دی ہے، ا
روایت کی تلقین کی ہے۔

<u>کتاب المغازی</u> | مدینہ منورہ احادیث و آثار اور فقہ و فتوی کی طرح اخبار و احداث اور سیر و مغا
اہل درس اور اصحابِ تصانیف علمائے تابعین کا مرکز تھا، اور ابومعشر کے دور شباب میں ان حضرات کی
ایک بڑی جماعت موجود تھی، ان میں عروہ بن زبیر بن عوام مدنی متوفی ۹۱ھ، ابان بن عثمان بن
مدنی متوفی ۱۰۵ھ، عاصم بن عمر بن قتادہ مدنی متوفی ۱۲۰ھ، شرحبیل بن سعد مدنی متوفی [illegible]
محمد بن مسلم ابن شہاب زہری مدنی متوفی ۱۲۳ھ، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم مدنی متوفی ۱۳۵ھ
کثیر مدنی متوفی ۱۵۰ھ، موسیٰ بن عقبہ مدنی متوفی ۱۴۱ھ، عبداللہ بن جعفر مدنی متوفی ۱۷۰ھ
ابن اسحاق مدنی متوفی ۱۵۱ھ وغیرہ اصحاب السیر والمغازی تھے، ان میں موسیٰ بن عقبہ اور محمد
نے مغازی کے موضوع پر سب سے پہلے کتابیں تصنیف کیں، جو بعد میں اس موضوع کیلئے ماخذ ثا
ان میں کئی حضرات ابومعشر کے شیوخ ہیں اور تقریباً سبھی ان کے بزرگ معاصر ہیں، اور مو
اخذ و کسب کی تصریح کتابوں میں ہے، طبقۂ تابعین کے یہ علمائے سیر و مغازی عام طور سے ایک
بیٹھ کر اس موضوع پر مذاکرہ کیا کرتے تھے، اور ابومعشر غور سے سنتے تھے، اس طرح ان کے پا

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۲

نہایت معتبر و متنوع علم جمع ہو گیا تھا جس کو بعد میں انھوں نے کتاب المغازی کے نام سے مرتب کیا۔

ایک مرتبہ اہل علم نے محمد بن ابومعشر سے دریافت کیا کہ آپ کے والد نے علم مغازی کیسے محفوظ کیا، تو انھوں نے بتایا:

کان التابعون یجلسون الی	علمائے تابعین ان کے استاذ کے پاس بیٹھ کر
استاذہ فکانوا یتذاکرون	مغازی کے موضوع پر بحث و مذاکرہ کیا کرتے
المغازی، فحفظ [1]	تھے، اور ان کی باتوں کو انھوں نے یاد کر لیا۔

ہمارا خیال ہے کہ سیر و مغازی میں ابومعشر کے خصوصی استاد موسیٰ بن عقبہ مدنی ہیں جن کے پاس حضرات تابعین آکر اس موضوع پر بحث و مذاکرہ کیا کرتے تھے، امام مالک ابن اسحاقؒ کے سخت منکر تھے، اور ان کے مقابلہ میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کے قائل بلکہ مبلغ تھے، وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے، تم مرد صالح موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی پڑھو، کیونکہ وہ اصح المغازی ہے، موسیٰ ثقہ آدمی ہیں، انھوں نے کبرسنی میں یہ علم حاصل کیا ہے، اور دوسروں کی طرح اکثار و اطناب سے کام نہیں لیا ہے، ان کی کتاب المغازی میں جن شرکائے بدر کا تذکرہ ہے، وہ واقعی اس میں شریک تھے، محمد بن طلحہ بن طویل کا قول ہے کہ مدینہ میں موسیٰ بن عقبہ سے بڑا کوئی مغازی کا عالم نہیں تھا۔[2]

موسیٰ بن عقبہ اور دوسرے اصحاب مغازی کے ساتھ ابومعشر کے تلمذانہ اور معاصرانہ تعلقات تھے، اور ان ہی کی طرح وہ بھی اس فن کے مستند عالم مانے جاتے تھے، ایک ہی دور میں موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحاق اور ابومعشر اور ان کے تلمیذ قاضی علی بن مجاہد کابلی نے اپنی اپنی کتاب المغازی لکھی، ابن ندیم نے ابومعشر کی کتاب المغازی کا تذکرہ کیا ہے[3] اسی کو خلیلی نے ان کی تاریخ کہا ہے، جس کو ائمہ علم و فن نے حجت اور دلیل مانا ہے، ابومعشر سے ان کے تلامذہ نے کتاب المغازی کی سماعت و روایت کی ہے ان کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۳۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۱ [3] الفہرست ص ۱۳۶۔

صاحبزادے محمد بن ابومعشر نے بھی اس کی روایت کی ہے، خطیب نے لکھا ہے:

سمع من ابیه کتاب المغازی وغیرہ[1] — محمد بن ابومعشر نے اپنے والد سے کتاب المغازی وغیرہ کی روایت کی ہے۔

اور محمد بن ابومعشر سے ان کے صاحبزادے داؤد نے اس کی روایت کی، خطیب ہی نے لکھا،

حدث عن ابیه عن ابی معشر کتاب المغازی[2] — داؤد نے اپنے باپ محمد سے، اور انھوں نے اپنے باپ ابومعشر سے ان کی کتاب المغازی کی روایت کی ہے۔

اور ان سے اس کی روایت قاضی احمد بن کامل نے کی، ابومعشر کے شاگرد علی بن مجاہد کابلی۔ اپنے استاد کی کتاب المغازی کی ان سے روایت کرکے خود بھی کتاب المغازی لکھی۔

ابومعشر کی کتاب المغازی بھی ان کے استاد موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کی طرح نہایت معتبر تھی، اور ائمہ حدیث اس کو حجت مانتے تھے، یہ کتاب کئی صدیوں تک اہل علم میں متداول رہی سیر ومغازی اور رجال وطبقات کی کتابوں میں جستہ جستہ اس کی مرویات ملتی ہیں۔

ائمہ جرح وتعدیل کے آراء واقوال

عام طور سے محدثین نے احادیث کی مسانید وجوامع مدون کرنے کے ساتھ تواریخ وطبقات ورجال اور سیر ومغازی پر کتابیں لکھیں کیونکہ یہ علوم حدیث کے لیے ضروری ہیں متقدمین ومتاخرین میں شاید ہی کوئی مشہور محدث ہو جس نے تاریخ وطبقات میں کوئی کتاب نہ لکھی ہو، البتہ بہت سے اخبار وتواریخ میں کثرت تصانیف یا کثرت روایت کی وجہ سے اخباری کے لقب سے مشہور ہوئے اور محدثین کے نزدیک ان کی شخصیت مختلف فیہ ہوگئی، مگر امام ابومعشر صاحب المغازی اور اخباری ہونے کے باوجود ائمہ حدیث ونقد کے زمرہ ہی میں شمار کیے گئے، اور محدثین کے نزدیک ان کی روایات مستند

[1] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۲۷۔ [2] ایضاً ج ۸ ص ۳۷۶۔

مانی گئیں، البتہ دوسرے بہت سے ائمۂ حدیث کی طرح جرح و تعدیل کے اصول پر ان کو بھی پرکھا گیا۔ اکثر ائمۂ حدیث کے نزدیک ابو معشر صدوق و ثقہ اور کثیر الحدیث محدث ہیں اور بعضوں نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، کچھ علماء نے تفصیل سے کام لے کر کہا ہے کہ ابو معشر کے خلاف فلاں استاد کی مرویات ضعیف یا منکر ہیں، محتاط علمائے حدیث نے ان سے سند احادیث کی روایت میں احتیاط کی ہے، کیونکہ وہ صاف اور صحیح طور سے سند بیان نہیں کر سکتے تھے، امام احمد بن حنبل نے ان کے متعلق کہا ہے:

کان صدوقًا لکنه لا یقیم الاسناد	وہ صدوق تھے، مگر اسناد کو صاف و صحیح طور پر
لیس بذلک[1]	بیان نہیں کرتے تھے۔

لیس بذلک کی اصطلاح ائمۂ جرح و تعدیل کے نزدیک جرح کے پانچویں درجے پر ہے اور اس کے باوجود حدیث مقبول ہوتی ہے[2]

ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں پہلے ابو معشر کی حدیث سے گھبراتا تھا، مگر جب میں نے دیکھا کہ امام احمد بن حنبلؒ ایک واسطہ سے ان سے روایت کرتے ہیں تو میں نے بھی ان کی حدیث کی کتابت و روایت میں توسع سے کام لینا شروع کر دیا[3]۔ اثرم نے امام احمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

حدیثه عندی مضطرب	ان کی حدیث میرے نزدیک مضطرب ہے، وہ
لا یقیم الاسناد، ولکن	اسناد کو ٹھیک طور سے بیان نہیں کرتے ہیں پھر
اکتب عنه حدیثه، اعتبر به[4]	بھی میں ان کی حدیث کو لیتا ہوں اور ان کا اعتبار
	کرتا ہوں۔

محدثین کے نزدیک مضطرب وہ حدیث ہے جس کو کوئی راوی بیان کرنے اور اسی کو دوسرا راوی

---

۱ کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ قسم ۱ ص ۳۹۳ ۲ جواہر الاصول ص ۶۱ بیروت ۳ کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ قسم ۱ ص ۳۹۳ ۴ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۰۔

اس کے خلاف بیان کرے، امام الجرح والتعدیل عبدالرحمٰن بن مہدی ابو معشر کے شاگرد رشید ہیں، ان کا قول اپنے استاد کے بارے میں یہ ہے:

کان ابو معشر یعرف وینکر[1]	ابو معشر معروف اور منکر دونوں قسم کی حدیث روایت کرتے تھے۔

منکر وہ حدیث ہے جس کو غیر ثقہ راوی بیان کرے۔

ان کے تلمیذ امام عبدالرزاق صنعانی نے کہا ہے:

اکثر الناس ضعف ابا معشر و مع ضعفہ یکتب حدیثہ[2]	اکثر علماء نے ابو معشر کو ضعیف کہا ہے، ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیث روایت کی جائے گی۔

ابن عدی نے لکھا ہے:

حدث عن الثقات، ومع ضعفہ یکتب حدیثہ[3]	ان سے ثقات نے روایت کی ہے، ان کے ضعیف ہونے کے باوجود ان کی حدیث روایت کی جائے گی،

ایک اور مشہور تلمیذ ابو نعیم فضل بن دکین کا قول ہے:

ھو صالح لین الحدیث محلہ الصدق[4]	وہ صالح لین الحدیث اور صادق ہیں۔

امام ابو حاتم اور امام ابو زرعہ دونوں نے ابو معشر کو صدوق کہا ہے، ابو زرعہ نے صدوق فی الحدیث کے ساتھ لیس بالقوی بھی کہا ہے، الغرض عام محدثین کے نزدیک ابو معشر صدوق، ثقہ اور صالح ہیں، ساتھ ہی ان کو لین الحدیث، لا یقیم الاسناد اور ضعیف بھی کہا گیا ہے۔

امام بخاریؒ نے ابو معشر کو منکر الحدیث اور ابن سعد نے کثیر الحدیث ضعیف کہا ہے، یحییٰ بن سعید ان سے روایت نہیں کرتے تھے، ان کی تضعیف کرتے تھے اور ان کا تذکرہ کر کے ہنسا کرتے تھے، ابو

---

[1] کتاب الجرح والتعدیل [2] میزان الاعتدال ج ۳، ص ۲۲۹ [3] ایضاً [4] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۰

اور نسائیؒ نے ضعیف کہا ہے، امام یحییٰ بن معین سے ان کے بارے میں کئی طرح سے اقوال منقول ہیں :
(١) لیس بقوی فی الحدیث (٢) ضعیف، اسنادہ لیس بشیٔ یکتب رقاق حدیثہ (٣) لیس بشیٔ ابو معشر ریح (٤) ضعیف یکتب من حدیثہ الرقاق وکان امیّاً یتقی من حدیثہ المسند، یعنی ابومعشر ضعیف ہیں، البتہ ان سے زہد و رقائق کی حدیث روایت کی جائے گی، وہ امّی تھے، ان کی مسند حدیث سے بچنا چاہیے، ساجی نے بھی کہا ہے کہ ابومعشر منکر الحدیث، امّی صدوق تھے، البتہ وہ غلطی نہیں کرتے تھے[1] حافظ حدیث، فقیہ اور کتاب المغازی کے مصنف کو امّی، اَن پڑھ کے معنی میں کہنا عقل و نقل کے خلاف ہے۔ زبان میں لکنت اور ضعف حفظ کی وجہ سے احادیث کی سند صحیح اور مستقیم طور سے ادا نہ کرنے سے امّی نہیں کہا جا سکتا، امام ابن معین کی طرف اس قول کی نسبت میں ہمیں شبہ ہے۔

اس سے بڑھ کر ابو معشر کے ایک معاصر نے ان کو تمام زمین اور آسمان والوں سے زیادہ جھوٹا کہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قائل کو گمنام کر دیا اور ابو معشر کو عزت و رفعت بخشی، یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابو جزء نصر بن طریف کو کہتے ہوئے سنا :

ابو معشر اکذب من فی السماء	ابو معشر تمام زمین اور آسمان والوں سے زیادہ
ومن فی الارض، قال فقلت	جھوٹے ہیں، میں نے دل میں سوچا کہ زمین کے
فی نفسی ھذا علمت بالارض	بارے میں تمہارا یہ علم ہے، آسمان کے بارے
فکیف علمت بالسماء قال یزید فوضع	میں تم کو کیسے معلوم ہوا؟ انجام یہ ہوا کہ اللہ
اللہ ابا جزء ورفع ابا معشر[2]	تعالیٰ نے ابو جزء کو گرا دیا، اور ابو معشر کو اٹھا دیا

ابن ابی حاتم نے یزید بن ہارون کا تاثر ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

---

[1] تاریخ کبیر، کتاب الجرح والتعدیل، تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد، میزان الاعتدال وغیرہ ملاحظہ ہو۔ [2] تاریخ بغداد
١٣، ٤٤٩ [illegible] ٤٢۔

ثبت حدیث ابی معشر و ذهب حدیث ابی جزء	ابومعشر کی حدیث باقی رہی اور ابو جزء کی حدیث فنا ہوگئی۔

ابومعشر کے متعلق ابو جزء نے یہ بات بغداد میں ان کی مقبولیت و مرجعیت اور دربار خلافت سے وابستگی کو دیکھ کر کہی ہوگی جس کا وبال ان پر پڑا۔

علماء نے ابومعشر کے بارے میں ان کی مرویات کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ ان کے فلاں استاذ کی مرویات معتبر و صالح ہیں، اور فلاں استاد کی مرویات منکر ہیں، امام احمدؒ کا قول ہے کہ ابومعشر کی ان احادیث کی روایت کی جائے گی جو انھوں نے محمد بن کعب سے تفسیر میں بیان کی ہیں، علی بن مدینی کا قول ہے کہ ابومعشر محمد بن قیس اور محمد بن کعب سے احادیث صالحہ کی اور نافع اور سعید مقبری سے منکر احادیث کی روایت کرتے تھے، عمرو بن علی الفلاس نے اسی میں ہشام بن عروہ اور محمد بن منکدر سے ان کی روایات کو بھی شامل کیا ہے۔

ابونعیم نے کہا ہے کہ انھوں نے نافع، محمد بن منکدر، ہشام بن عروہ، اور محمد بن عمرو سے موضوعات کی روایت کی ہے، ابومعشر کی طرف موضوع احادیث کی نسبت ان کے ساتھ سخت ناانصافی ہے، کسی دوسرے نے یہ بات نہیں کہی ہے، اسی لیے حافظ ابن حجرؒ نے ان کا یہ قول نقل کرکے لکھا ہے:

قلت افحش فیه القول فلو یصب وصفه[2]	ابونعیم نے ابومعشر کے بارے میں بڑی سخت بات کہی ہے، وہ ان کی شناخت نہ کر سکے۔

خلیلی نے کہا ہے کہ ابومعشر کچھ احادیث میں منفرد تھے اور امام شافعیؒ ان سے روایت کرنے سے رکتے تھے۔

محمد بن ابومعشر سندی بغدادی | امام ابومعشر مدینہ میں متاہل زندگی بسر کرتے تھے اور یہیں ان کا خاندا

---

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ق ۱ ص ۴۹۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۲۔

رہتا تھا، اولاد و احفاد میں دینی و علمی ذوق تھا، ان کے صاحبزادے ابو عبد الملک محمد بن ابی معشر اجلۂ محدثین سے ہیں، اپنے والد کے علوم کے وارث اور خاتمۃ الاصحاب اور ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں۔

ان کی ولادت مدینہ منورہ میں سنہ ۱۳۰ھ کے حدود میں ہوئی، بارہ تیرہ سال کی عمر تک مدینہ منورہ میں رہے، پھر والد کے ساتھ بغداد چلے آئے، فقیہ مدینہ حضرت ابن ابی ذئب (ابو الحارث محمد بن عبد الرحمٰن بن مغیرہ بن حارث بن ابی ذئب ہشام بن شعبہ قرشی) مدنی متوفی سنہ ۱۵۹ھ اور امام ابو بکر ہذلی سلمی اخباری بصری) متوفی سنہ ۱۶۷ھ کی زیارت کی تھی، اپنے والد سے تعلیم حاصل کی، ان سے کتاب المغازی کی روایت کرکے ان کے خاتمۃ الاصحاب ہوئے، یعنی وہ اپنے والد ابو معشر کے آخری شاگرد ہیں، ان کے علاوہ ابو عبد الرحمٰن نضر بن منصور غزی کوفی اور ابو نوح انصاری سے روایت کی، اور ان سے ان کے دونوں صاحبزادوں داؤد اور حسین کے علاوہ ابو حاتم رازی، محمد بن لیث جوہری، ابو یعلیٰ موصلی، احمد بن علی بن مثنیٰ، امام ترمذی، ابن ابی الدنیا، محمد بن جریر الطبری، ابو بکر بن مجذر، ابو حامد حضرمی، اور دوسرے محدثین نے روایت کی۔

محمد بن ابو معشر ائمۂ حدیث کے نزدیک صدوق و ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے، ابو یعلیٰ نے ثقہ کہا ہے، ابن ابی حاتم رازی نے محلہ الصدق بتایا ہے۔ ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

شیخ الترمذی صدوق وثقہ ابو یعلی واشار ابن معین الی لین فیہ.	وہ امام ترمذی کے استاذ اور ثقہ ہیں، ابو یعلیٰ ان کو ثقہ کہا ہے، اور ابن معین نے ان میں لین اور نرمی کا اشارہ کیا ہے۔

ابن معین کے اس اشارہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حسین بن حبان نے یحییٰ بن معین سے محمد بن ابو معشر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے بتایا کہ محمد بن ابو معشر ہمارے شہر مصیصہ میں ایک مسجد کی بنیاد رکھنے کے موقع پر آئے، ہم نے حجاج بن محمد الاعور سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے

تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی، پھر کہا کہ میں اس سلسلہ میں کچھ کہنا پسند نہیں کرتا ہوں، مگر آپ کے سوال دینا ضروری ہے، محمد بن ابو معشر ایک مرتبہ میرے یہاں (بغداد میں) آئے اور مجھ سے ایک کتاب جسے میں نے ان کے والد ابو معشر سے پڑھا تھا، انھوں نے یہ مجھ سے لے کر لکھ لی اور مجھ سے اس:

ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ابو الحسین بن قطان نے محمد بن ابو معشر کو غیر معروف لوگوں میں شمار کیا (ھذا ابو الحسین بن القطان فی من لا یُعرف) یہ ان کا قصور ہے، اس سے تم کو دھوکہ نہ ابو الحسین بن قطان نے مشاہیر کی ایک جماعت کو بھی غیر معروف بتایا ہے، اور ان کی اقتدا میں بھی ایسا ہی کیا ہے، اگر یہ دونوں ایسے لوگوں کو لا یُعرف کے بجائے لا نعرفہ (ہم ان کو نہ کہتے تو بہتر ہوتا، البتہ محمد بن ابو معشر نجیح کے نام سے ایک اور عالم ہیں جن کا تذکرہ ابن عدی بمعروف لکھا ہے۔

محمد بن ابی معشر کو خلیفہ مہدی ان کے والد کے ساتھ بغداد لایا، جہاں انھوں نے مستقل اختیار کر کے متاہل زندگی بسر کی، ان کے دو صاحبزادوں داؤد اور حسین نے بتایا ہے کہ ان کے و بغداد میں فوت ہوئے، اس وقت ان کی عمر ننانوے ۹۹ سال آٹھ دن کی تھی اور ابن قانع کہ وہ سنہ ۲۴۴ھ میں فوت ہوئے [1]

امام ترمذیؒ نے باب ماجاء ان ما بین المشرق والمغرب قبلۃ میں ان سے:

حدثنا محمد بن ابی معشر، نا ابی	... ...
عن محمد بن عمرو، عن ابی سلمۃ	... ...
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے
صلی اللہ علیہ وسلم ما بین	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

[1] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۲۶، کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ق ۱، ص ۱۱۰، میزان الاعتدال ج ۳ ص

المشرق والمغرب قبلة[1]	مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔

اور خطیب نے تاریخ بغداد میں اپنی سند سے ان سے یہ روایت کی ہے:

محمد بن اللیث الجوھری قال	... ...
حدثنا محمد بن ابی معشر المدنی	... ...
حدثنا ابی، عن نافع، عن ابن عمر	حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے
قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ
وسلم کل مسکر خمر وما اسکر	ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور جس چیز کی زیادہ مقدار
کثیرہ فقلیلہ حرام[2]	نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔

حسین بن محمد بن ابو معشر معشری بغدادی محمد بن ابی معشر کے دو[2] لڑکوں کا حال کتابوں میں ملتا ہے، حسین اور داود، ابوبکر حسین بن محمد ابو معشر سندی بغدادی معشری کی نسبت سے مشہور ہیں، بغداد کے محلہ شارع باب خراسان میں رہتے تھے، انھوں نے اپنے والد محمد بن ابی معشر، اپنے دادا کے شاگرد وکیع بن جراح اور محمد بن ربیعہ سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے محمد بن احمد حکیمی، اسمٰعیل بن محمد الصفار، علی بن اسحاق مادرانی، عثمان بن احمد دقاق اور ابوعمرو بن سماک نے روایت کی، امام وکیع سے خصوصی تلمذ و تعلق کی وجہ سے "صاحب وکیع" مشہور تھے، عبد الباقی بن قانع کا قول ہے کہ ابن ابی معشر صاحب وکیع ضعیف ہیں، علی بن المنادی نے کہا ہے کہ ابو معشر مدنی کی اولاد میں معشری شارع باب خراسان میں رہتے تھے، انھوں نے امام وکیع سے حدیث کی روایت کی ہے، وہ ثقہ نہیں تھے اس لیے لوگوں نے ان سے روایت ترک کر دی، دوشنبہ ۹ رجب ۲۰۲ھ میں انتقال کیا، اسی دن ابوعوف بزوری بھی فوت ہوئے تھے۔

---

[1] تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۰۹۔ [2] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۲۶۔

خطیب بغدادی نے اپنی سند سے ان سے یہ روایت کی ہے:

حدثنا محمد بن احمد بن	... ...
ابراهيم الحكيمي حدثنا ابوبكر	... ...
الحسين بن محمد بن ابی معشر	... ...
انبانا وكيع بن الجراح عن	... ...
عيينة بن عبد الرحمٰن بن جوشن	حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
عن ابيه عن بريدة قال قال رسول	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم لوگ دین کے
الله صلى الله عليه وسلم عليكم	بارے میں درمیانی روش اختیار کرو، کیونکہ
هديا قاصدا فانه من يشاد	جو شخص دین سے مقابلہ کرتا ہے، اس کو
هذا الدين يغلبه .	دین مغلوب کر دیتا ہے ۔

نیز خطیب نے ان کے دو شاگردوں اسماعیل بن محمد الصفار اور عثمان بن احمد الدقاق سے یہ اثر نقل کیا ہے:

حدثنا ابوبكر حسين بن ابی معشر	... ...
حدثنا وكيع عن هشام الدستوائي	... ...
عن قتادة عن الحسن عن قيس	... ...
بن عباد قال كان اصحاب رسول	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ
الله صلى الله عليه وسلم يكرهون	جنازہ، قتال اور ذکر کے موقع پر آواز
رفع الصوت عند الجنائز و	بلند کرنے کو کروہ سمجھتے تھے ۔
عند القتال وعند الذكر[1]	

...

[1] تاریخ بغداد ج ۵، ص ۹۱

داؤد بن محمد بن ابی معشر بغدادی | ابوسلیمان داؤد بن محمد بن ابی معشر نجیح بن عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے دادا ابو معشر کی کتاب المغازی کی روایت کی ہے، اور ان سے اس کی روایت قاضی احمد بن کامل نے کی ہے [1]

ابومعشر کی مسند احادیث | محدثین کی اصطلاح میں مسند ایسی حدیث ہے جس کی سند اس کے پہلے راوی سے آخری راوی تک متصل ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا سلسلہ مل جائے، ابو معشر کے بارے میں کئی علمائے حدیث کا قول ہے کہ وہ اپنی مرویات و احادیث کی سند صحیح طور سے بیان نہیں کرتے ہیں اس لیے ان کی مسند روایات محلِ نظر ہیں، ان کی چند مروی احادیث و آثار درج کی جاتی ہیں، دو حدیثیں جامع ترمذی میں، ایک سنن ابوداؤد میں اور باقی دوسری کتابوں میں ہیں۔

(۱) سنن ترمذی باب ماجاء ان ما بین المشرق والمغرب قبلۃ میں ہے:

حدثنا محمد بن ابی معشر نا ابی	... ...
عن محمد بن عمرو عن ابی سلمۃ	... ...
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول	حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مشرق اور مغرب
المشرق والمغرب قبلۃ	کے درمیان قبلہ ہے۔

(۲) اور دوسری حدیث باب ماجاء فی حث النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الھدیۃ میں ہے:

حدثنا ازھر بن مروان البصری	... ...
نا محمد بن سواء، نا ابو معشر	... ...

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۳۶۷

عن سعید، عن ابی ھریرۃ عن النبی	حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال تہادوا فان	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم لوگ آپس میں
الھدیۃ تذھب وحر الصدر ولا	ہدیہ لیا دیا کرو، کیونکہ ہدیہ دل کا غبار ختم
تحقرن جارۃ لجارتھا ولو شق	کر دیتا ہے اور ایک پڑوسن دوسری پڑوسن کیلئے
فرسن من شاۃ.	اگرچہ بکری کی کھر کا ہدیہ ہو، حقیر نہ جانے۔

اس پر امام ترمذیؒ نے لکھا ہے:

هٰذا حدیث غریب من هٰذا الوجه	یہ حدیث اس سلسلۂ سند سے غریب ہے۔

غریبؔ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو ایک عادل ضابط راوی بیان کرے، اور اس کی حدیث کی روایت کی جاتی ہو۔

اس حدیث کی تخریج امام احمدؒ نے بھی کی ہے[1]

میزان الاعتدال میں اسی سند سے یہ حدیث ہے، مگر اس میں "وحر" کے بجائے "وھن" ہے، اور "فرسن شاۃ" ہے۔

(۳) سنن ابی داؤد "باب اکل اللحم" میں یہ حدیث ہے:

حدثنا سعید بن منصور، نا ابو معشر	... ...
عن ھشام بن عروۃ عن ابیه عن	حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کھانا کھاتے
علیه وسلم لا تقطعوا اللحم بالسکین	وقت گوشت کو چاقو چھری سے نہ کاٹو، کیونکہ
فانه من صنیع الاعاجم وانھسوہ	یہ اہل عجم کا طریقہ ہے، بلکہ اس کو دانت سے

---

[1] تحفۃ الاحوذی ج ۳ ص ۱۹۳۔

فانہ اھنأ و امرأ . تو وہ زیادہ مزیدار اور لذت دار ہے۔

امام ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کر کے اس کو ابومعشر کے منکرات میں شمار کیا ہے[1] میزان الاعتدال میں ہے :

(۴) عبد الرزاق عن ابی معشر ... ...

عن ابن المنکدر عن جابر مرفوعاً — حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ

ان اللہ لیدخل بالحجۃ الواحدۃ — صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ

ثلاثۃ الجنۃ المیت والحاج — ایک حج کی وجہ سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل

عنہ والمنفذ ذلک . — کرتا ہے میت کو اور اس کی طرف سے حج کرنے والے کو

کو جنت میں داخل کرتا ہے ۱۱۱۱۲

میزان الاعتدال ہی میں اس سے پہلے اس حدیث کا ابتدائی ٹکڑا یوں ہے :

وقد روی عبد الرزاق من طریقہ ... ...

حدیث جابر ان النبی صلی اللہ علیہ ... ...

وسلم قال یدخل اللہ بالحجۃ — اللہ تعالیٰ ایک حج سے تین آدمیوں کو

الواحدۃ ثلاثۃ الجنۃ[2] . — جنت میں داخل کرتا ہے۔

اس کے بعد ہی امام عبد الرزاق کا یہ قول ہے : اکثر الناس ضعف ابا معشر ومع ضعفہ یکتب حدیثہ . مطبوعہ مصنف عبد الرزاق[3] کے ابواب الحج میں یہ حدیث مجھ کو نظر نہیں آئی۔

(۵) میزان الاعتدال میں سعید بن منصور کے حوالہ سے ہے کہ امام ابومعشر نے امام اعمش کے سامنے یہ حدیث بیان کی :

(ابومعشر) حدثنی نافع عن — ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۲۹ ۔ [2] ایضاً [3] معارف میزان الاعتدال میں دوسری روایت عبد الرزاق [illegible]

ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام وحدثنی
موسیٰ بن عقبہ عن سالم عن ابیہ مرفوعاً
مثلہ۔[1]

فرمایا ہے کہ جس چیز کا زیادہ حصہ نشہ پیدا کرے
اس کا کم حصہ بھی حرام ہے۔

خطیب نے تاریخ بغداد میں اس حدیث کو ان ہی الفاظ کے ساتھ محمد ابن ابو معشر کے ذکر میں محمد بن لیث جوہری کی روایت سے بیان کیا ہے۔ سنن سعید بن منصور کا مطبوعہ حصہ کتاب الفرائض، کتاب الوصایا اور کتاب الطلاق پر مشتمل ہے، اور یہ حدیث کتاب الاشربہ کی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اور المنتقی لابن الجارود میں یہ حدیث محمد بن منکدر سے یوں مروی ہے:

عن داؤد بن بکر بن الفرات، عن محمد
بن المنکدر عن جابر بن عبد اللہ
رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ما اسکر کثیرہ
فقلیلہ حرام۔[2]

... ...
جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
کہ جس چیز کا زیادہ حصہ نشہ پیدا کرے
اس کا کم حصہ بھی حرام ہے۔

(۹) میزان الاعتدال میں ہے:

محمد بن بکار، حدثنا ابو معشر، عن
المقبری، عن ابی هریرة مرفوعاً
دعوة المظلوم مستجابة وان کان
فاجرا فجورہ علی نفسہ۔

... ...
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مظلوم کی دعا مقبول ہے،
اگرچہ وہ فاسق و فاجر ہو، اس کے فسق و فجور کا وبال
اس کے اوپر ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۲۹۔ [2] منتقی ابن جارود ص ۲۹۱۔

امام ذہبیؒ نے اس حدیث کے بعد لکھا ہے:

هذا حديث رواه سفيان الثوري مع تقدمه على ابي معشر[1]	سفیان ثوری نے ابو معشر سے متقدم ہونے کے باوجود ان سے اس کی روایت کی ہے۔

(۷) میزان الاعتدال میں ہے:

ابو الربيع الزهراني، حدثنا ابو معشر نجيح، عن سعيد بن ابي سعيد، عن ابي هريرة مرفوعاً، لا تقوم الساعة حتى تعبد اللات والعزى قال ابو هريرة وكاني انظر الى نساء دوس يصطففن بالياتهن على صنم يقال له ذو الخليصة[2]	... ... حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ لات و عزیٰ کی عبادت کی جائے گی۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ گویا میں قبیلۂ دوس کی عورتوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ذو الخلیصہ نامی بت پر جمع ہیں۔

یہ حدیث اختصار کے ساتھ جمع الفوائد میں یوں آئی ہے:

ابو هريرة رفعه: لا تقوم الساعة حتى تضطرب اليات نساء دوس على ذي الخليصة وذو الخليصة طاغية دوس التي كانوا يعبدون في الجاهلية[3]	حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوس کی عورتیں ذو الخلیصہ سے لپٹیں گی، ذو الخلیصہ قبیلۂ دوس کا بت تھا جس کی وہ زمانۂ جاہلیت میں عبادت کرتے تھے۔

(۸) میزان الاعتدال میں ہے:

---

[1] میزان الاعتدال ج ۳، ص ۲۲۹ [2] ایضاً [3] جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۲۹۔

محمد بن ابی معشر، حدثنا ابی،	... ...
عن المقبری، عن ابی ھریرۃ مرفوعاً	حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
لا تقولوا رمضان، فان رمضان	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رمضان نہ کہو،
اسم من اسماء اللہ، ولکن قولوا	کیونکہ رمضان اللہ تعالیٰ کا نام ہے، بلکہ شہر
شہر رمضان۔	(ماہ) رمضان کہو۔

ذہبیؒ نے اس کو ابومعشر کی منکر احادیث میں شمار کیا ہے۔[1]

(۹) ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی نے تاریخ جرجان میں امام ابوبکر اسماعیلی کے ذکر میں ان کی سند سے ابومعشر کی یہ حدیث بیان کی ہے:

..... حدثنا بشر بن الولید	... ...
الکندی، حدثنا ابومعشر المدنی،	... ...
عن نافع، عن ابن عمر، قال قال	ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص
من جاء منکم الی الجمعۃ فلیغتسل	نماز جمعہ کو جائے وہ غسل کرلے۔

(۱۰) حضرت عبداللہ بن مبارک نے کتاب الزہد والرقائق کے "باب ذکر رحمۃ اللہ تبارک وتعالیٰ جل وعلا" میں ابومعشر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک اثر اور اس کے ضمن میں قرظی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر بیان کی ہے:

اخبرکم ابوعمر بن حیویۃ، قال	....
حدثنا الحسین، قال اخبرنا	....

---

[1] میزان الاعتدال ج ۴ ص ۲۴۹ [2] تاریخ جرجان ص ۱۶۰۔

عبد الله قال اخبرنا ابو معشر المدنی قال حدثنی محمد بن کعب القرظی قال حدثنی عبد الله بن دارة مولی عثمان بن عفان عن حمران مولی عثمان بن عفان قال مررت علی عثمان بفخارة من ماء فدعا به فتوضأ فاسبغ وضوءه ثم قال لو لم اسمعه من رسول الله صلی الله علیه وسلم الا مرة او مرتین او ثلاثا ما حدثتکم به انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ما توضأ عبد فاسبغ الوضوء ثم قام الی الصلوة الا غفر له ما بینه وبین الاخری۔

.... محمد بن کعب قرظی نے کہا کہ مجھ سے حضرت عثمانؓ کے غلام عبد اللہ بن دارہ نے حمران مولی عثمان سے روایت کی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مٹی کے برتن میں پانی طلب کرکے اچھی طرح وضو کیا، پھر کہا کہ اگر میں نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک یا دو یا تین بار سنا ہوتا تو تم سے بیان نہیں کرتا، مگر بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندہ پوری طرح وضو کرکے نماز پڑھتا ہے، اللہ تعالی اس نماز اور دوسری نماز کے درمیانی گناہ کو بخش دیتا ہے۔

قال محمد بن کعب وکنت اذا سمعت حدیثا عن رجل من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم التمسته فی القرآن فالتمست هذا فوجدته [illegible]

محمد بن کعبؒ نے کہا کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی سے کوئی حدیث سنتا ہوں تو اس کا مطلب قرآن میں تلاش کرتا ہوں چنانچہ میں نے اس حدیث کے بارے میں تلاش کیا تو سورہ حج کی یہ آیت [illegible]

فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ
مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ فعلمت ان اللّٰه لم
يتم عليه النعمة حتى غفر له ذنوبه
ثم قرأت الآية التي في سورة
المائدة "إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ
فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ
إِلَى الْمَرَافِقِ" حتى بلغ "وَلٰكِنْ
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ
عَلَيْكُمْ" فعرفت ان اللّٰه لم يتم
عليهم النعمة حتى غفر لهم[1]

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ
اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا
تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ اس سے مجھے معلوم
ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذنوب کی مغفرت
کر کے آپ پر اتمام نعمت فرمایا، پھر میں نے
سورۂ مائدہ کی یہ آیت پڑھی "إِذَا قُمْتُمْ
إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ
وَاَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ (الی) وَلٰكِنْ
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ"
تو مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں
کی مغفرت کر کے ان پر اتمام نعمت کیا ہے۔

(۱۱) میزان الاعتدال میں ہے:

ابو معشر عن الحويرث قال
مكث موسىٰ بعد ان كلمه الله
اربعين يومًا لا يراه احدٌ الا
مات رواه الحاكم في مستدركه

ابو معشر نے حویرث بن ذباب مدنی سے روایت
کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ حضرت موسیٰؑ سے
اللہ تعالیٰ کے ہمکلام ہونے کے بعد چالیس
دن تک جو شخص ان کو دیکھتا تھا وہ مر جاتا تھا
ابو عبداللہ حاکم نے مستدرک میں اس کی روایت کی ہے

امام ذہبیؒ نے اس روایت کو بھی ابو معشر کے منکرات میں شمار کیا ہے۔[2]

---

[1] کتاب الزہد والرقائق لابن المبارک ص ۲۱۶ - [2] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۹

حضرت مسیحؑ کے بعد نصرانیت کا نیا قالب

از ضیاء الدین اصلاحی

اسلام خداوند قدوس کا برحق دین ہے، اسی کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام نے دی ہے، اس کی روح اور اصل و اساس توحید ہے، جو قرآن مجید کی سب سے اہم اور بنیادی تعلیم ہے، اس نے توحید ہی کے مضمون کو مختلف حیثیتوں اور گوناگوں پہلوؤں سے بار بار بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ تمام پیغمبروں کو اسی کی تلقین کی گئی تھی :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء : ۲۵)	اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کرو۔

انبیاءؑ کی بعثت کی خاص غرض و غایت یہ بتائی ہے کہ :

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل : ۳۶)	اور ہم نے ہر امت میں پیغمبر بھیجے کہ خدا ہی کی عبادت کرو اور معبودان باطل سے پرہیز کرو۔

قرآن مجید نے متعدد انبیاءؑ کی زبانی ان کی دعوت کا اہم پیغام اور خاص شعار نقل کیا ہے کہ :

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ (اعراف : ۵۹)

اے میرے ہم قوموا اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انبیاء علیہم السلام ہی کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے؛ ان کی بعثت بھی توحید کی اشاعت اور شرک کی بیخ کنی کے لیے ہوئی تھی، قرآن مجید نے ان کی بنیادی دعوت و ہدایت کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے :

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (مائدہ : ۷۲)

اور مسیح نے کہا : اے بنی اسرائیل، اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوگا کہ حضرت مسیحؑ کوئی نیا دین اور نئی شریعت لے کر دنیا میں تشریف نہیں لائے، بلکہ یہود کو تورات کے اصل احکام کی پیروی کی دعوت دینے کے لیے آئے تھے، اور تورات کی اولین دفعہ توحید کی دعوت اور شرک کی نفی و تردید پر مشتمل ہے، ملاحظہ ہو :

"خدا سے ڈر، اس کی جھوٹی قسم مت کھا اور شرک و بت پرستی سے بچ۔" (خروج : ۲۹)

تورات کے یہی احکام دوملیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شب معراج میں عطا فرمایا :

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ (بنی اسرائیل : ۲۳)

اور تمہارے خداوند نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

دوسری جگہ ہے:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَنْ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا. (انعام: ۱۵۱)

کہو: آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمہارے خداوند نے حرام کی ہیں، وہ یہ کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ!

پھر بھلا حضرت مسیحؑ توحید کے بجائے شرک کی دعوت کس طرح دے سکتے تھے! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ. اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. (زخرف ۶۳ و ۶۴)

اور جب عیسیٰؑ واضح نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، تمہیں واضح کر دوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو، بے شک اللہ میرا اور تمہارا رب ہے، پس اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

ایک اور جگہ یہی حقیقت اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ. اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ

اور میں تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی توراۃ کی اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں تمہارے لیے جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں اور میں تمہارے پاس خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو تم

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ.

ڈرو اور میری اطاعت کرو، بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، پس اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھا راہ ہے۔

(آل عمران: ۵۰-۵۱)

انجیل کے محرف و مبدلہ ہونے میں کسی قیل و قال کی گنجایش نہیں، علمائے نصاریٰ بھی بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ عہد جدید کے اصلی نسخے معدوم ہو چکے ہیں، علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ یہود تورات کو منزل من اللہ سمجھتے ہیں لیکن نصاریٰ کا انجیل کے بارہ میں یہ دعویٰ نہیں ہے۔[1] مگر اس کے باوجود وہ توحید کی تعلیم سے یکسر خالی نہیں ہے، ملاحظہ ہو:

" یسوع نے اس سے جواب میں کہا کہ سب حکموں میں اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن! وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے، ایک ہی خداوند ہے، اور تو خداوند کو جو تیرا خدا ہے، اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری زبان اور اپنی ساری عقل سے اور اپنی ساری طاقت سے پیار کر۔ اول حکم یہی ہے اور دوسرا جو اس کے مانند ہے یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ، ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں ہے، تب اس فقیہ نے اس سے کہا: کیا خوب اے استاد! تو نے سچ کہا، کیونکہ وہ خدا ایک ہے، اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔" (مرقس ۱۲: ۲۹-۳۲)

متی کی انجیل میں ہے کہ مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا:

" تم ربی نہ کہلاؤ، کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہے، یعنی مسیح اور تم سب بھائی ہو، اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمان پر ہے۔" (متی ۲۳: ۸، ۹)

دوسری جگہ ہے:

---

[1] الملل والنحل ابن حزم ج ۲ ص ۲۔

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر! اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴ : ۱۰)

نیز:

"یسوعؑ نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے، کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸ : ۱۹)

پیروانِ مسیحؑ نے حضرت مسیحؑ کو خدا، مظہرِ خدا وغیرہ بنا دیا ہے، مگر وہ خود اپنے قتل پر آمادہ یہودیوں کو مخاطب کرکے اپنی بشریت اور عدم خدائی کا اس طرح اعلان کرتے ہیں:

"..... لیکن اب تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، حالانکہ میں ایک انسان ہوں جو تم لوگوں کے سامنے اس حق کو بیان کر رہا ہے جو اس نے خداوند سے سنا ہے" (یوحنا اصحاح ۸ : ۴۰)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ توحید خالص کے داعی تھے، اور یہی نصرانی مذہب کا اصل و اساس تھی، نیز اصلی انجیل شرک و بدعت کی تعلیم سے یکسر پاک تھی، محققین علمائے نصاریٰ کا بھی یہی خیال ہے، حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"مسلمان یہود و نصاریٰ سب متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے، اور ان میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ مخلوق کے پاس اللہ نے آدمیوں ہی میں سے رسول بنا کر بھیجے تھے"[1]

جو مشرکانہ اعمال و عقائد نصرانی مذہب کا جزو ہو گئے ہیں ان کا اس میں کوئی وجود نہ تھا، بلکہ یقیناً انجیل ان خرافات سے پاک تھی اس لیے حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت میں بھی شرک و بت پرستی کا کوئی شائبہ نہ تھا، لیکن دنیا کی تاریخ کا یہ نہایت افسوسناک اور بڑا ہی دردناک واقعہ ہے کہ جو ذات گرامی خدائے واحد کی اطاعت و بندگی کی دعوت دینے کے لیے تشریف لائی تھی اور جس نے بار بار واشگاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ وہ صرف خدا کا رسول اور بندہ ہے، اس کو خود اس کے متبعین اور پیرووں نے

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ج ۱ ص ۳۹۱۔

اس کی صفائی اور براءت کے باوجود خدا بنا لیا، قرآن مجید میں ہے کہ:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ
وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ
سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ
مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ، اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ
فَقَدْ عَلِمْتَهٗ، تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ
وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ، اِنَّكَ
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، مَا قُلْتُ لَهُمْ
اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ
شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ، فَلَمَّا
تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ
وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔

اور یاد کرو جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن
مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری
ماں کو خدا کے سوا معبود بنا لو؟ وہ جواب
دے گا تو پاک ہے، میرے لیے کیسے روا
تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق
نہیں، اگر میں نے یہ بات کہی تو تو اسے جانتا ہے
تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، پر میں
نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے، غیب کی
باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے، میں نے
تو ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا
کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور
تمہارا بھی، اور میں ان پر گواہ رہا جب تک
ان میں موجود رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا
تو تو ہی ان پر نگران رہا، اور تو تو ہر چیز پہ
گواہ ہے۔

(مائدہ: ۱۱۶ تا ۱۱۷)

اس صریح وضاحت کے بعد بھی نصاریٰ نے نعوذ باللہ ان کو خدا کا شریک بنا لیا اور مشرکانہ عقائد و اعمال نیز اپنے پاپاؤں اور پادریوں کی ایجاد کردہ شریعت اور بدعات کو ان سے منسوب کر دیا، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں:

"نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کے بعد جو بدعتیں ایجاد کیں، ان کی تعلیم نہ حضرت مسیحؑ نے دی تھی، اور نہ اناجیل یا صحفِ سماوی میں ان کا کوئی ذکر تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اکابرِ دین کے نام پر جو کچھ چاہیں ایجاد کریں، انھوں نے اپنے بزرگوں اور پادریوں کو اس کی چھوٹ دے دی تھی کہ وہ اللہ کی شریعت کو اپنی رائے سے منسوخ کر دیں۔" قرآن مجید نے اس کی پرزور تردید کی ہے، فرمایا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے اپنے علماء و مشائخ اور مسیحؑ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ	ابن مریم کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا، حالانکہ
ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا	ان کو حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا
اِلٰهًا وَّاحِدًا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا کوئی
سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ.	معبود نہیں اور وہ پاک ہے ان سے
(توبہ: ۳۱)	جن کو یہ اس کا شریک بناتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے اپنی ذات کو نصاریٰ کے شرک سے بری قرار دیا ہے، جس کا خود اصل نصرانی مذہب میں بھی کوئی شائبہ نہ تھا، کیونکہ اللہ نے اپنے رسولوں کو توحید کی تعلیم دینے اور شرک سے منع کرنے کے لیے مبعوث کیا تھا، ارشاد ہے:

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ	اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے
اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً	دریافت کر لو، کیا ہم نے خدائے رحمان کے
يُّعْبَدُوْنَ.	سوا اور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت
(زخرف: ۴۵)	کی جائے؟

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ اور ان سے پہلے کے تمام انبیاءؑ نے صرف ایک خدا کی بندگی کا

له الجواب الصحیح ج ۱، ص ۱۱۰۔

دعوت دی ہے[1] لیکن حضرت مسیحؑ کی واضح تعلیم وہدایت کو نصاریٰ نے بالکل نظر انداز کر دیا اور وہ منحرف ہو کر کفر و شرک کی وادیوں میں بھٹکنے لگے، اس لیے جب پیغمبر آخر الزماںؐ کی بعثت ہوئی تو آپؐ نے مسیحؑ کی اصل تعلیم اور سچے نصرانی مذہب کو اختیار کرنے کی تلقین کی، تاکہ وہ توحید کی شاہراہ پر گامزن ہوں اور شرک سے باز آجائیں، مگر انھوں نے بدبختی سے اس زریں موقع کو بھی گنوا دیا اور آپؐ کو نبی ماننے سے انکار کر دیا، حالانکہ آپ کی بشارت خود حضرت مسیحؑ نے بھی دی تھی۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ	اور یاد کرو جب عیسیٰؑ بن مریم نے کہا کہ اے
اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ	بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا
مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ	رسول ہوں، میں تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے
التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ	سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کی اور ایک
مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا	پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا
جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا	ان کی بشارت سناتا ہوں، پھر جب وہ
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔	ان لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے
(صف : ۶)	تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

ذیل میں نصاریٰ کے ان مشرکانہ عقائد کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے حضرت مسیحؑ کے بعد اختیار کر لیے تھے۔

تثلیث | نصاریٰ کا نہایت گمراہ کن عقیدہ اور ان کے شرک کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ تثلیث کے گورکھ دھندے میں پڑ گئے اور ایک کے بجائے متعدد الٰہ کو ماننے لگے، ۳۲۵ء میں نیقیہ کونسل میں جو نیا عقائد نامہ مرتب کیا گیا تھا، اور جو اب نصرانی مذہب کا مسلّمہ عقیدہ ہو گیا ہے، وہ ان کے

---

[1] الجواب الصحیح ج ۲ ص ۵۵۔

خیال پر مبنی ہے، ملاحظہ ہو:

"ہم ایمان لائے ایک[2] خدا قدرت والے باپ پر، جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے، اور ایک[3] سب یسوع مسیح ابن اللہ پر، جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، عین ذات ہے، الٰہ الٰہ ہے، نور نور ہے، عین خدا[4] ہے، مولود ہے مخلوق نہیں، باپ اور اس کا ایک جوہر ہے، اس کی وساطت سے تخلیق اشیا ظہور میں آئی، یعنی جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا، اور وہ انسان بن کر آیا، مبتلائے بلا ہوا اور تیسرے دن پھر اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان پر چڑھ گیا اور اب زندوں[5] اور مردوں کا انصاف کرنے پھر آئے گا۔" (ماخوذ از ڈاکٹر طومشکانٹس ہشاک خیۃ ص ۴۴، بحوالہ صحت ساوی ص ۵۹۔ نیز دیکھیے الملل والنحل شہرستانی ج ۲، ص ۶۳ برحاشیہ الملل والنحل لابن حزم)

آگے بتایا جائے گا کہ نصاریٰ کب اور کس طرح اس گمراہی میں پڑے، یہاں اس مشرکانہ عقیدہ کی حقیقت و نوعیت واضح کی جاتی ہے۔

نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا تین[2] اقنوم کا مجموعہ ہے (۱) باپ (۲) بیٹا (۳) روح القدس[1]۔

---

[1] اس تیسرے اقنوم کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے روح القدس کے بجائے تیسرا اقنوم کنواری مریم کو بتایا ہے، اور بعض نے مریم کو بھی ایک مستقل اقنوم مانا ہے، ۱۹۵۰ء میں حضرت مریم کے رفع جسمانی کا عقیدہ بھی وضع کر لیا اور اس کو ماننا بھی نجات کے لیے ضروری قرار دے دیا گیا، اس طرح نصاریٰ تثلیث کے بجائے تربیع کے قائل ہوئے، چنانچہ مسیح پرستی کی طرح مریم پرستی بھی اس وقت مسیحی دنیا میں رائج ہے، مسیحا خدا کی اس کنواری کو مخاطب کر کے دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان کے نام پر نذر و نیاز کرتے ہیں گرجاؤں میں ان کی تصویریں آویزاں کر کے ان کے سامنے عبادت کی رسمیں بجا لاتے ہیں، نسطوری فرقہ کو خاص اسی مسئلہ میں رومن کیتھولک سے اختلاف تھا، وہ حضرت مریم کی پرستش کا قائل نہ تھا، اسی لیے اس کو قسطنطنیہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، لیکن اسی زمانہ میں ایک فرقہ نے تیسرا اقنوم روح القدس کے بجائے حضرت مریم کو بنایا تھا، علامہ ابن حزم نے عیسائیوں کے ایک فرقہ کا نام بربرانی بتایا ہے جو مسیح اور مریم دونوں کو خدا سمجھتا تھا۔ (الملل والنحل ج ۱ ص ۴۸)

انھوں نے اس عقیدہ کو فلسفیانہ رنگ دے کر ایک معما اور چیستاں بنا دیا ہے، کیونکہ وہ خدا کو تین اقنوم سے مرکب ماننے کے باوجود یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ تینوں حقیقت میں ایک ہی ہیں، باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں، لیکن عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک ہی خدا ہے، تین خدا نہیں (الملل والنحل شہرستانی ص ٦٥) تثلیث کا مطلب خود نصاریٰ کی توضیح کے مطابق ان کی کتاب "دعائے عمیم" میں اس طرح درج ہے:

"ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کریں، نہ اقانیم کو ملائیں، نہ ماہیت کو تقسیم کریں، کیونکہ باپ ایک اقنوم، بیٹا ایک اقنوم اور روح القدس ایک اقنوم ہے، مگر باپ، بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے، ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح القدس ہے، باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق، باپ غیر محدود، یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق، تو بھی تین قادر مطلق نہیں، بلکہ ایک قادر مطلق ہے، ویسا باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا، بس یہی تین خدا نہیں، بلکہ ایک خدا"

گویا خدا جن تین اقانیم سے مرکب ہے، یہ تینوں الگ الگ بھی ہیں اور ایک بھی ہیں، اور تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی خدا ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی الٰہیات میں خدا ان تین صفات کا مجموعہ اور مرکب ہے (١) اقنوم وجود (٢) اقنوم علم (٣) اقنوم حیات

خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں، لیکن ان کی انفرادی حیثیت کے بارہ میں اختلاف ہے، ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک بذات خود بھی ویسا ہی خدا ہے جیسا مجموعۂ خدا، دوسری جماعت کے نزدیک یہ تینوں الگ الگ خدا ضرور ہیں لیکن مجموعۂ خدا کا درجہ ان سے بڑھا ہوا ہے۔

ا۔ الملل والنحل شہرستانی ج ٢ ص ٦٠ و ٦١ و ٦٥ برحاشیہ الملل والنحل ابن حزم۔

ایک اور جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ تینوں سرے سے خدا نہیں ہیں، خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔

ذیل میں ان تین اقنوم کی مختصر تشریح پیش کی جاتی ہے:

پہلا اقنوم | تثلیث کا پہلا اقنوم باپ ہے، نصاریٰ کے نزدیک اس سے خدا مراد ہے، اس کو وہ اقنوم اوّل سمجھتے ہیں یعنی اس کا وجود کسی اور ذات سے نہیں ہوا ہے بلکہ وہ دوسرے دو اقنوم کا منبع اور سرچشمہ ہے، گویا اس اقنوم کی حیثیت اصل کی ہوئی، کیونکہ بیٹا ازل ہی میں باپ سے پیدا ہوا اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں باپ سے ہوا ہے، لیکن روح القدس کا صدور اکیلے باپ ہی سے نہیں ہوا، بلکہ بیٹے سے بھی ہوا ہے، ایک عیسائی فلسفی سینٹ تھامس ایکوناس نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"باپ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے کسی کو جنا ہے اور کوئی ایسا وقت گذرا ہے جس میں باپ تھا اور بیٹا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک خدائی اصطلاح ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ باپ بیٹے کے لیے اصل ہے، جس طرح ذات صفت کے لیے اصل ہوتی ہے، ورنہ جب سے باپ موجود ہے اسی وقت بیٹا بھی موجود ہے، اور ان میں سے کسی کو کسی پر زمانی اولیت حاصل نہیں ہے[1]۔"

دوسرا اقنوم | تثلیث کا دوسرا اقنوم بیٹا ہے، اس سے حضرت مسیحؑ مراد ہیں، جو باپ (خدا) کے اکلوتے بیٹے ہیں، اور اس سے ازل ہی سے عقل کی راہ سے تولد ہوئے، عیسائی الٰہیات میں ان کو اقنوم علم کہا جاتا ہے، اور خدا کے کلام سے بھی ان کی تعبیر کی جاتی ہے، نصاریٰ کے خیال میں یہی کلام حضرت مسیحؑ کے جسم سے متحد ہوگیا، اس طرح لاہوت نے ناسوت کا جامہ پہن لیا، اور تین ایک اور ایک تین کا فلسفہ وجود میں آیا، بیٹے کو خدا کا کلمہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کی راہ سے پیدا ہو کر در اصل خدا (باپ) کا خیال ہے، اور خیال بولے ہوئے کلمے کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے، "ابتداء میں کلمہ تھا" اور کلمہ

---

[1] بحوالہ مقدمہ اظہار الحق ص ۳۲۶۔

ساتھ تھا، اور کلمہ خدا تھا۔ پھر یہی کلمہ نصاریٰ کی نجات کے لیے حضرت مسیحؑ کے انسانی جسم میں داخل ہوگیا تھا، جب تک وہ دنیا میں رہے، یہ خدائی اقنوم ان کے جسم میں حلول کیے رہا، جب یہودیوں نے آپ کو پھانسی پر چڑھا دیا تو اس وقت یہ خدائی اقنوم ان کے جسم سے علٰحدہ ہوگیا، اس کے تین روز بعد آپ دوبارہ زندہ ہوئے، اپنے حواریوں کو ہدایات دیں اور آسمان پر چلے گئے، یہودیوں کی طرف سے آپ کو پھانسی دینے کی وجہ سے تمام نصرانیوں کا وہ گناہ معاف ہوگیا جو حضرت آدمؑ کی لغزش کی وجہ سے ان کی پوری نسل کی سرشت میں داخل ہوگیا تھا۔[1]

اس کا لب لباب یہ ہے کہ بیٹے سے مراد خدا کی صفت کلام ہے، لیکن یہ انسانوں کی صفت کلام سے مختلف ہے، ایکوینیاس لکھتا ہے:

"انسانی فطرت میں صفت کلام کوئی جوہری وجود نہیں رکھتی، اسی وجہ سے اس کو انسان کا مولود نہیں کہہ سکتے، لیکن خدا کی صفت کلام ایک جوہر ہے جو خدا کی ماہیت میں اپنا وجود رکھتا ہے، اسی لیے اس کو حقیقۃً نہ کہ مجازاً بیٹا کہا جاتا ہے، اور اس کی اصل کا نام باپ ہے۔"[2]

عیسائیوں کا خیال ہے کہ خدا کی تمام معلومات کا ذریعہ یہی صفت ہے، اور اسی صفت کے ذریعہ تمام اشیاء پیدا ہوئی ہیں، یہ صفت باپ ہی کی طرح قدیم اور ازلی ہے، خدا کی یہ صفت یسوع مسیح بن مریم کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی، جس کی وجہ سے یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ (باقی)

---

[1] یہ تفصیل الملل والنحل ابن حزم اور شہرستانی کی جلد اول و دوم سے ماخوذ ہے۔

[2] بحوالہ مقدمہ اظہار الحق ص ۴۷۔

تلخیص و تبصرہ

ہجرت کے بارے میں مستشرقین کا موقف

"ستمبر ۱۹۸۱ء میں رابطۂ عالم اسلامی کی کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین" کے ابتدائی حصہ کی تلخیص شائع ہوئی تھی، اس نمبر میں اس کے بعد کے حصہ کی تلخیص شائع کی جاتی ہے۔"

مستشرقین کا مطالعہ بڑا وسیع ہے، وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اپنا موضوع بحث بناتے ہیں تو تاریخی واقعات کے سلسلے میں جدید انداز سے تنقید بھی کرتے ہیں مگر اپنا خاص نقطۂ نظر پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔

مستشرقین میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے پوری سیرت نبویہ پر قلم اٹھایا ہے اور حیات نبوی کے تمام پہلوؤں پر ولادت سے لیکر وفات تک بلکہ اس کے بعد کے واقعات بھی بیان کیے ہیں انھیں میں سے ہجرت نبوی کا عظیم الشان واقعہ بھی ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اہم پہلو ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کا بھی ایک اہم حصہ ہے، یہ دعوت اسلامی کا ایک بنیادی موڑ ہے [illegible] ایسی تاریخی [illegible] جس نے صرف جزیرۂ عرب ہی نہیں بلکہ [illegible] بلکہ اس کے دور میں [illegible] انسانی پر بھی [illegible] ہے۔

بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین اپنے بعض جزئی اختلافات کے باوجود واقعۂ ہجرت کے متعلق اتفاق رکھتے ہیں، اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کوئی اتفاقی [illegible] بلکہ [illegible]

منشا کا ایک اہم حصہ ہو۔

کچھ مستشرقین ایسے ہیں جنہوں نے ہجرت کے بعض واقعات بیان کرنے میں تحریف اور تغیر [illegible] ہے مثلاً وہ واقعات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں لیکن انہیں ان پر بڑا تعجب ہے۔ ان کے خیال میں ایسے واقعات ہیں جو مہاجرین کی تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوئے۔ اپنے اسی خیال کی بنا پر انہوں نے حقیقت پسندانہ خیالات کا انکار کیا ہے اور ان کی کتابوں میں بے بنیاد باتیں داخل ہو گئی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) صحابہ کی ہجرت کے بعد مکہ میں بجز رسول اکرم کا قیام۔ چنانچہ "[illegible]" اپنی کتاب "حیات محمد" میں لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کے چلے جانے کے بعد اپنے ساتھ [illegible] تک مکہ ہی میں ٹھہرے رہے، حالانکہ وہ اس وقت جن خطرات میں گھرے ہوئے تھے، ان کا علم تھا، [illegible] ابوبکر نے نہایت عاجزانہ درخواست بھی کی لیکن اس کے باوجود آپ نے چاہا کہ اپنے [illegible] کو دائرۂ اسلام میں لانے کی آخری تدبیر کر لیں [illegible] پریشانی کی اور خوف و ہراس کا عالم۔

(۲) رسول اکرم کے اپنے گھر سے نکلنے کی روایت کا تعلق [illegible] ہے کہ جب رسول اکرم اپنے گھر سے نکلے تو اپنے [illegible] ایک چادر اوڑھا کر اپنے بستر پر [illegible] بہت [illegible] آپ کے [illegible] ایک مٹھی خاک [illegible] کے سروں پر [illegible] اس طرح [illegible]

لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ پیچھا کرنے والا [illegible]
نے دیکھ کر رونے میں دریغ کیا، اس نے آپ کے لئے پیچھے چھوڑ کر [illegible] تب آپ نے اس کے لئے [illegible]
اور اس طرح اپنے مکان سے نکل جانے میں کامیاب ہوگا، حالانکہ یہ روایت سراسر جھوٹی ہے، اور عربی
مصادر میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی،

(۳) سراقہ ہجرت سے نہ روک سکا: ہجرت کے سلسلے میں مستشرقین میں جو چیز زیر بحث ہو یا [illegible]
اور وگت سب اس بات پر متفق ہیں کہ سراقہ ہجرت کے اقدام کو نہ روک سکا، البتہ [illegible] کہتا ہے کہ
رسول اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سواروں کا ایک دستہ آگیا اور سوار ان کی تلاش
کر رہا تھا اور [illegible] تھا، پھر ماجرا یہ ہوا کہ [illegible] لوگ آئے اور آپ چلے اور ابوبکرؓ تک پہنچ گئے

ذہن کا خیال ہے کہ پہلی روایت میں جو بات سراقہ کے قول سے متعلق رکھتی ہے وہ اپنی جگہ صحیح
ہے، سراقہ نے کہا کہ میں تھوڑی دیر ٹھہرا پھر اپنے گھر گیا اور اپنی لونڈی سے کہا کہ چپکے سے میرے گھوڑے کو
وادی کے پیچھے میں نے ایک غلام کو جو سیاہ فام [illegible] تھا، حکم دیا کہ میرے لیے ایک [illegible]
وہاں تک پہنچا دے، اور پہنچ کے میرا انتظار کرے، پھر میں دروازے کے پیچھے سے نکل کر باہر
نکلا، میں نے اپنے نیزے کی انی بھی زمین میں گاڑ دی تاکہ اس کی چمک کسی کو دکھائی نہ دے اور یہ سب
میں نے اس لئے کیا کہ اس کام میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے اور اس کا انعام میرے لیے ہو۔

(۴) غار کے متعلق ذہن کا بیان: ذہن نے بیان کیا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ [illegible] غار میں گئے
تاکہ اس کے اندر جا کر دیکھ لیں کہ کوئی موذی جانور [illegible] تو نہیں ہے، پھر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(بعض لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی ایڑی پر کسی کیڑے نے کاٹ لیا جس سے آپؓ کی حالت دگرگوں ہوگئی کسی جانور کا زہر ان کے خون میں سرایت کرچکا تھا، رسول اکرمؐ نے اپنا لعاب دہن ان پر لگایا اور تھوڑی دیر اسے سہلایا، فوراً ہی تکلیف اور سوجن دور ہوگئی،

غار میں جب تک رہے ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ جو ان کی بکریاں چرایا کرتا تھا، شامؐ پاس دودھ اور گوشت لیکر آتا، پھر صبح کو بکریوں کے ریوڑ میں چلا جاتا، چلتے وقت وہ نشانات بھی مٹاتا جاتا،

(۵) رسول اکرمؐ کا مدینہ میں فاتحانہ داخلہ۔ مستشرقین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ [illegible] نے رسول اکرمؐ کا پُرجوش خیر مقدم کیا، مہاجرین اور انصار آپؐ کے پاس اکٹھا ہوگئے [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ آپ اُن کے کامیاب قائد ہیں، چنانچہ حتّی کہتا ہے کہ ہجرت رسول اکرمؐ کی [illegible] ایک نئے دور کا دیباچہ تھی اس سے مکی دور کا خاتمہ اور مدنی دور کا آغاز ہوتا ہے، کہاں یہ حال آپؐ اپنے شہر میں ایک کمزور اور ناقابل التفات شخصیت تھے اور اب یہ حال ہے کہ شہر یثرب میں ایک نہایت باعزت رہنما کی حیثیت آپؐ کو حاصل ہوگئی، اسی جگہ سے آپ کی توجہ ایک سیاست کرنے کی طرف ہوئی، اور آپ نے سیاسی امور کی طرف توجہ دینا شروع کیا، اس کے بعد زیادہ تفصیلات بھی فراہم کرتا ہوا اس نے اس سلسلے میں ذرا دقت نظر سے بحث کی [illegible] جب آپ بنی سالم بن عوف [illegible] وقت ہوگیا اور آپ سواری سے اتر پڑے، آپ نے پہلی مرتبہ نماز جمعہ مدینہ میں ادا کی، آپ کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی جماعت نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ صف بستہ کھڑی ہوگئی، نماز کے بعد آپ مسلمانوں کی طرف مخاطب ہوئے اور انہیں نصیحت فرمائی پھر آپ [illegible] ہو کر شہر میں فاتحانہ طور سے داخل ہوئے تو ہر قبیلہ [illegible] باندھے ہوئے کھڑا تھا [illegible] جوش [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پُرجوش استقبال [illegible]

[illegible] کے سلوک سے بہت متاثر ہوئے، آپ نے بڑی گہری بصیرت سے انھیں ایک ایسے مواخات کے رشتے میں جوڑنے کی کوشش کی جس سے ان میں جذبۂ رشک و رقابت نہ پیدا ہو سکے۔

۔۔۔ ایڈگر نے صرف اس کی تاریخی حقیقت کو تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی تفصیلات میں نہیں گیا ہے وہ کہتا ہے کہ حضرت محمد کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی، اور چلنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھی اس وقت رسول اکرم کو خیال ہوا کہ قباء میں ٹھہر کر مدینہ میں داخل ہونے کی تیاری کر لیں، اس لئے آپ کا مدینہ میں داخلہ یوم جمعہ ہوا جسے اول قرار دیا ہے۔۔۔۔ جس دن آپ مدینہ میں داخل ہوئے تو ستر سوار آپ کے جلو میں تھے، [illegible] کے سردار بریدہ رسول اکرم کے محافظ کے طور پر تھے، مدینہ سے تھوڑی دور [illegible] پہنچے کہ مسلمانوں کی جماعت استقبال کے لئے جمع ہو گئی، اس وقت تیز دھوپ تھی لیکن لوگ [illegible] کھلی مٹی پر کھڑے رسول اکرم کی آمد کا انتظار کر رہے تھے آپ اگرچہ اپنے وطن کو چھوڑ کر [illegible] مدینہ میں داخل ہوئے تو اس شان سے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی تاجدار ہے اور کسی فاتح و منصور کا استقبال کیا جا رہا ہے [illegible] نہیں ہوا کہ یہ کوئی مہاجر ہے جو پناہ کے لئے یہاں آیا ہو۔

(۱۰) ہجرت کی اہمیت و برتری کی وجہ سے کہ شاید چند ہی مستشرقین کا قلم اس [illegible] کی حقیقت سے قریب ہو تا جا رہا کہ [illegible] یہ کہ ہجرت کو [illegible] خیال کرتے [illegible] [illegible] کی تحریروں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت بہر حال ان کے [illegible] [illegible] ہجرت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہجرت [illegible] [illegible] ختم [illegible] جب یہ معلوم ہو تا ہے کہ [illegible] ایک [illegible] زندگی کا کوئی اہم واقعہ نہیں ہے [illegible] [illegible] کی شان [illegible] کا کوئی [illegible] [illegible] خیال ہے حضرت محمد [illegible] [illegible] [illegible] اسلام آپ کے

سال بلکہ جہاں سے آپ کے ہم وطنوں نے آپ کو تکلیف پہنچائی اور نہ آپ کی قوم آپ کو وہاں کام
اس جگہ سے کہ جہاں سے آپ اعلانِ پیغام لوگوں کو پہنچا سکتے تھے اور اسلام کی روشنی پھیلا سکتے [illegible]

(ب) ہجرت دعوتِ اسلامی کا ایک اہم مرحلہ ، لیکن " منٹگمری واٹ " دعوتِ اسلامی کے سلسلے
ہجرت کی اہمیت کا اعتراف ہے ، وہ مسلمانوں کی دلیری اور ان کی عزت و تکریم کرتے کرتے ہیں کہ
کہ اس کی وجہ سے اسلام مرکز قائم ہو گیا ، مدینے میں جب حضرت محمد تشریف لائے کے لوگوں نے مدد
کی تو آپ کی جانب سے انصار کے لقب سے سرفراز ہوئے ۔ دوسری جگہ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ
یہ واقعہ ہے جو تاریخ عرب کا سر آغاز تھا ، مسلمان اسی بنا پر اس کا احترام کرتے ہیں ، اور یہ واقعہ
۶۲۲ عیسوی میں ہوا ،

(ج) ہجرت کی شرعی اور تنظیمی یادگاریں ۔ منٹگمری واٹ ایک ایسا شخص ہے جس نے ہجرت کے
دوسرے گوشوں سے بحث کی ہے ، اس کے قول کے مطابق ہجرت کے بعد قانونِ شریعت کا اجرا
اور مسلمانوں کی حکومتی تنظیم عمل میں آتی ، داخلی اور خارجی معاملات طے پانے اور مالی طور پر
کو وسعت ہوتی ، اسی مدنی دور میں مسلمانوں کی تنظیم ایک مذہبی قومیت کی شکل میں پایۂ تکمیل
پہنچی ، رسول اللہ نے یہودیت اور نصرانیت سے تعلقات ختم کرکے از سرِ نو تعلقات پیدا
جمعہ کی نماز قائم کی ، ڈھول اور گھنٹے کے بجائے اذان کا طریقہ جاری کیا ، رمضان کے روزے فرض
ہوئے ، قبلہ بیت المقدس سے مکہ کی طرف ، یعنی خانہ کعبہ کی طرف ، حجرِ اسود کا بوسہ مقرر کیا
[illegible] ساتھ [illegible] اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی ، [illegible]
قیام عمل ہوتی ، مہاجرین اور انصار میں بھائی چارگی ہوئی ، جزیرۃ العرب کا [illegible]
پہلی تبدیلی تھی کہ عربوں کی تنظیم ایک ایسے اتحاد سے ہوئی جس [illegible]
وہ کبھی آشنا نہ تھے ، ماضی کی طرح [illegible] کی بنیاد بجائے خون کے [illegible]

وہ منصوبے کئے گئے تھے وہ سب ہی ختم ہو گئے۔

مستشرقین نے ہجرت کے واقعہ کی اہمیت مختلف پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے
ہے، پیش کیا جاتا ہے۔

(د) ہجرت عالمیت کی طرف۔ (۱) فرانسیسی مستشرق "لا بیس" اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ مجھے کتاب میں جاننے کی چیز ہے کہ اسلام جو ایک گمنام مذہب تھا ہجرت نبوی کے بعد ہی یہ نہ صرف عالمی ہو گیا اس کی روایت یہ ہے کہ تلواریں بھی تھیں اور دھڑکتے ہوئے دل بھی ان ہی میں ﷺ کا پیغام تھا کہ اسلام کی تلوار جزیرہ عرب سے نکل کر دنیا کے دور دراز حصوں تک پہنچا دیا۔ پہلے لوگ مختلف قبیلے اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مگر اسلام نے انہیں ایک رشتہ اخوت میں جوڑ دیا، ان کے تعصبات ختم کر دیئے جس کی مثال کبھی جزیرہ عرب کے اندر دیکھنے میں نہ آئی۔

اسلام کی بنیاد جو مذہب کی حیثیت ہے بلکہ ہر انسانوں کی فلاح سمجھی گئی یہاں تک کہ اس کا مقصد جزیرہ عرب کا ہی نہیں اس کا پیرو ہو گیا پھر اس کی ترقی و ارتقا کی شاہراہ تک پہنچا دیا۔ یہ صرف اس لئے کہ یہ دین صرف عرب کا دین نہیں ہے بلکہ تمام انسانیت کا دین ہے اور ساری دنیا کے لئے آیا ہے۔

(۲) انگریز مستشرق "آرنلڈ" نے اپنی کتاب "دعوت اسلام" میں بتایا ہے کہ ہجرت کا یہ واقعہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ اسلام [illegible] ہو گیا۔ اس وقت کے بعد سے [illegible] ایک شخص ہندوستان میں [illegible] اسلامی حکومت کے [illegible] پہنچ گئی اور [illegible]
[illegible]

(۳) فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر [illegible]

اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ بیعت کرنے والے لوگ دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب لائیں گے، وقت کیسا نازک ہو گا [illegible] لیکن اصحاب عقبہ کو شاید اس کا اندازہ نہ تھا کہ ان کا یہ سفر تاریخ عالم کے رخ کو بدل دے گا۔ تقریباً یہی بات "ار۔ اے۔ ایف۔ بودلی" نے بھی اپنی کتاب "حیات محمد" میں کہی ہے۔ [illegible] اس مذہب کو قابل التفات نہ سمجھا، لیکن مدینہ کی سرزمین میں پہنچتے ہی اس میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے انھیں لوگوں نے سمجھا کہ ہجرت کے اندر کیا حقیقت پوشیدہ تھی یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا دور آیا تو آپ نے اس دن کو تاریخ اسلامی کی ابتدا قرار دیا اور اسی وقت سے کہ تمام مسلمان اپنی تاریخیں ہجری کے حساب سے لکھنے لگے۔

(۴) امریکی مستشرق "فلپ حتی" بھی اپنی کتاب "تاریخ عرب" میں ہجرت کی عالمی حیثیت بحث کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ہجرت کوئی ناگہانی واقعہ نہ تھا بلکہ دو سال کی ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ [illegible] مدینہ کی سرزمین سے نکل کر اسلام کی تعلیمات جزیرۃ العرب کے اطراف تک پہنچیں، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے بڑے بڑے حصوں تک پھیل گئیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک [illegible] کی بنیاد پڑی جس کے حدود تھوڑے سے عرصہ میں دور دراز تک وسیع ہو گئیں اس زمانے میں [illegible] متمدن ملکوں میں اس سے بڑی کوئی حکومت نہ تھی۔

یہ مستشرقین کے موقف کا خلاصہ ہے۔ کوئی شخص مستشرقین کی وکالت اور معتدل موقف کا [illegible] کرے تو اس کے سامنے بہت سے حوالے آئیں گے، کبھی ان میں دلی مقصد چھپا ہوا ہوگا اور کبھی واضح صورت میں [illegible] تاریخی حقائق بیان کریں یا [illegible] کا اظہار [illegible] نہیں ہے بعض لوگ سرسری نگاہ سے انھیں پڑھتے ہیں تو دھوکہ کھا جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے ان میں تحقیر اور حیرت کے جذبات ملے جلے ہوتے ہیں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ انصاف سے

اور اعتدال کی روش اختیار کریں، وہ جب لکھتے ہیں تو حق اور ناحق دونوں کو شامل کر دیتے ہیں، اس لئے تحقیقی نظر سے مطالعہ کرنیوالوں کو چاہیئے کہ وہ تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھیں، ان کی یہ روش صرف رسول اللہ کی شخصیت ہی کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اسلام کی تمام مشہور شخصیتوں کے متعلق ان کا یہی رویہ ہے، اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

۱۔ مستشرقین انسانی حقائق پر قدرت کے باوجود رسول اکرمؐ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہیں، تو ان کا انداز عام تاریخ نویسی سے الگ ہوتا ہے، ان میں ان کے فکر و عقیدہ اور اپنے ماحول کے اثرات بھی کارفرما ہوتے ہیں، وہ تاریخی واقعات کے ذکر میں تو عام پہلو اختیار کرتے ہیں لیکن رسول اللہ کی سیرت جب بیان کرتے ہیں تو ان کا انداز بدل جاتا ہے، اگرچہ عام طور سے ان کا دعویٰ یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اصولوں کی پیروی کی ہے اور نہایت انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعات کے بیان کرنے میں ان کے اصلی مصادر سے رجوع کیا ہے، معقولیت اور منطقی انداز سے ان کے ہر پہلو کی وضاحت کی ہے، ایمانداری اور غیر جانبداری سے اظہار خیال کیا ہے،

بلاشبہ انھوں نے بعض تاریخی حقائق کے اظہار میں ایسی ہی روش اختیار کی ہے چنانچہ ارباب کلیسا کے شاہانہ محلوں اور کاہنوں کے وسیع اور کشادہ مکانات کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مغربی مصنفوں سے بالکل ہٹ کر لکھا ہے، انھوں نے مغرب کے بااقتدار لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں کی ہے، اس قسم کی مثالیں زیادہ تر رینان، ٹالسٹائی، میڈیئے اور لورودیشؔ وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں،

۲۔ سیرت نبویؐ کے لئے مخصوص اصول اور قاعدے ہیں۔ سیرت نبویؐ کے موضوع پر لکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے سب سے قدیم ماخذ قرآن، حدیث اور تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے، واقعات کے سلسلے میں جہاں شک اور خلجان ہو تو روایتوں کے جانچنے کے لیے معیار ہیں، لغت سے واقفیت اور فکر سلیم بھی درکار ہے، یہ ضرور ہے کہ شخصیت کے بارے میں سب کے تاثرات یکساں نہیں ہوتے مگر جب رسولؐ کی

سیرت پر بحث ہو تو ان عوامل اور اسباب کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے جن کی بنا پر معاشرہ کی اصلاح، نیک اور مفید کام انجام پائے اور جب تمام عناصر کجا پائے گئے تو آپ کو اسلام کی امانت دیگر تمام لوگوں کے پاس بھیجا گیا۔

رسول کی شخصیت کے متعلق مستشرقین کے طریقۂ تحقیق اور اسلوب سے مسلمانوں میں عقائد، زیادت، مآخذ اور ہیکل وغیرہ خاص طور سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے بعد بھی کچھ لوگوں پر اس کا اثر پڑا ہے لیکن اس سلسلے میں جن اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے، اس سے پہلے مسلمانوں نے اپنی ان کتابوں میں کام لیا ہے جو فن تراجم ورجال سے تعلق رکھتی ہیں،

۳۔ شاطرانہ انداز تحسین :۔ مستشرقین رسول اللہ کی سیرت کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں کچھ پہلو مخفی بھی رکھتے ہیں، ان کے سوچنے کا انداز ہر زمانہ میں یکساں رہا ہے، دور وسطیٰ میں بھی اور دور جدید میں بھی، انھوں نے رسول اللہ کی بشریت پر بھی اظہار رائے کیا ہے، اور آپ کی عبقریت کو بھی مانا ہے، لیکن جب نبوت اور رسالت کی بات آتی ہے تو صاف بچ کر نکل جاتے ہیں، اگر اس کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو اس میں گروہی عصبیت موجود ہوتی ہے، وہ ہمیشہ نبوت کے اسرار پر کنایہ اور اشارہ میں گفتگو کرتے ہیں، وہ زیادہ تر رسول اللہ کی شخصیت کو عرب کے ایک ممتاز قائد کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ کی بدولت عرب انسانیت کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھے، ترقی یافتہ تہذیب کی قیادت ان کے ہاتھوں میں آئی، آپ کے اعلیٰ اور شریفانہ اوصاف کا اثر آپ کے ماننے والوں پر بھی پڑا اور وہ بھی اعلیٰ اوصاف کے مالک ہو گئے۔

ایک طرف سیرت رسول کا یہ انداز ہے لیکن دوسری طرف جب وہ دوسرے اسلامی موضوعات پر لکھتے ہیں تو ان کا موقف بدل جاتا ہے، حالانکہ جہاں آپ کی شخصیت دوسروں سے بالاتر ہے وہاں آپ کی تعلیمات بھی سب پر فوقیت رکھتی ہیں،

۴۔ انسانی اور تمدنی ترقی کا اقرار :۔ مستشرقین نے ایجابی موقف بھی اختیار کیا ہے، فکری اور

مادی ترقیوں کا جائزہ لیا ہے، اس کے لئے کافی جدوجہد کی ہے، اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ مواد کی فراہمی میں صرف کیا ہے، وہ جہاں رسول اللہ کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہیں وہاں اسلامی فتوحات پر بھی عقلی اور عسکری نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فتوحات دنیا کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوئیں، بعض نے معرکہ بواتیہ کا جو ۳۲ھ میں ہوا اس کے ذکر میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اندلس کے عربوں کو شکست اٹھانی پڑی اور اس کے بعد یورپ کی تہذیب صدیوں پیچھے چلی گئی۔

اسی طرح جب رسول اللہ کو ایک اجتماعی مصلح کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو آپ کی غیر معمولی شخصیت اور انقلاب آفریں پہلو کا ضرور تذکرہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ آپ کی بدولت دنیا میں زندگی نے نئی کروٹ لی آپ نے پرانی دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، آپ نے عدل و رحمت اور قانون و اخلاق کی بنیادیں استوار کیں۔ "لیبرتی" عرب کے متعلق کہتا ہے کہ اگر عربوں کا نام تاریخ سے حذف کر دو تو یورپ کا دور جدید صدیوں . . . پیچھے چلا جائے گا علم کے تمام میدانوں میں عربوں کی بدولت روشنی آئی، بحث و تحقیق کے منصفانہ اصول قائم ہوئے اور ان کے علماء نے کوئی ایسا دروازہ نہیں چھوڑا جسے انھوں نے کھٹکھٹایا نہ ہو،

۵۔ مستشرقین کے جائزہ میں قابل غور پہلو: ۔ مستشرقین کے دلکش اور شیریں اقوال سے متاثر ہو جانا مسلمانوں کی بڑی کمزوری ہے، وہ جب دیکھتے ہیں کہ مستشرقین آپ کے اوصاف نہایت عمدہ انداز سے بیان کر رہے ہیں، اور آپ کو نہ صرف غیر معمولی انسان مانتے ہیں بلکہ مصلحین کی صف میں اولیت کا درجہ دے رہے ہیں تو بہت خوش ہو جاتے ہیں لیکن مستشرقین کی مدح رسول میں بھی ان کا دلی مقصد چھپا ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مدح و تعریف کے پہلو سے آپ کے نبی اور رسول ہونے کی اہمیت کو ختم کر دیا جائے، لوگوں میں آپ کی قائدانہ حیثیت اتنی نمایاں ہو جائے کہ بحیثیت رسول کے آپ نے خدا کی جو تعلیمات بیان کی ہیں، اور ایمان و عقائد اور عبادات سے متعلق جو شرعی احکام دیے ہیں، وہ باقی نہ رہیں،

ان چالاک اور عیار لوگوں میں بعض تو اسلام کے ہمدرد بن کر سامنے آئے ہیں، وہ تمام حالات اسلامیہ

میں جاتے ہیں قرآن کی پذیرائی ہوتی ہے، یہ لوگ علماء کا لباس زیب تن کرکے بہت سے علمی اداروں میں گھس گئے ہیں، اور اپنی اسی اسکیم کے تحت کام کر رہے ہیں، قاہرہ، دمشق، بغداد اور بیروت کے تحقیقی اداروں کے چوتھائی ارکان اسی قسم کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، نمایاں لوگوں میں "مارگیولیتھ" کی کارستانیوں سے کون واقف نہیں، ا وسسں نے شعر جاہلی کے پورے ذخیرہ کو مشکوک بنادیا ہے، "او تماسینون" نے قرآن کے متعلق لوگوں کے عقائد متزلزل کر دیئے ہیں، تعجب ہے کہ قاہرہ کے عرب ان کے افکار و خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔

"زویمر" اور "لامنس" نے اگرچہ رسول اللہؐ کی بڑی تعریف کی ہے لیکن پڑھنے والوں کو ایسا تاثر دیا ہے کہ آپ محض ایک اعلیٰ درجہ کے لیڈر تھے، اور بحیثیت نبی کے آپ کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اسی طرح قرآن کی تمام خوبیوں کے باوجود یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اللہ کی طرف سے بذریعۂ وحی آپ پر اترا ہے، بہرحال ان مستشرقین کی کتابوں میں رسول اللہ کی تعریف کا بڑا حصہ محض آپ کی قیادت عبقریت اور معاشرتی اصلاح تک محدود ہوتا ہے، اسے وہ متعدد فصلوں میں بیان کرتے ہیں، لیکن دوسرے پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں،

"ڈرمنگم" نے اپنی کتاب "حیات محمد" میں خاص طور سے یہی طریقہ اختیار کیا ہے، البتہ "کارلائل" نے اپنی کتاب ناموران عالم میں اس سے کچھ مختلف انداز اختیار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ دور وسطیٰ میں ایسی دینی عبقریت کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی،

ان کے علاوہ مستشرقین جن باتوں پر اتفاق رکھتے ہیں، ان میں ایک جہاد کا مسئلہ ہے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا، پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو صرف دفاع کے لیے وقتی طور سے جہاد کرنا پڑا، آپ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے لئے جہاد درست نہیں،

اسی طرح حکومت، زکوٰۃ، شرعی احکام کے نفاذ سے متعلق مسائل میں ایسے خیالات قا

جس سے مسلمان دین اور اپنے نبی کے متعلق بدظن ہو جائیں، نہ تو دین سے ان کا رشتہ قائم رہے اور نہ اسلامی تعلیمات سے۔

اہل علم مسلمانوں کو ان کی سوچی سمجھی اسکیم سے ہوشیار رہنا چاہئے انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عقیدہ و فکر میں جو گمراہی پھیلانے کی کوشش کی ہے اور مغربیت کے مسموم اثرات ڈالے ہیں، ان سے بچنا چاہئے اس سلسلہ میں اسلامی موضوعات پر جو کچھ لکھا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحیح معیار اور اصول کے مطابق ہو، ان میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، ایک عام تنقید کا اصول، دوسرے خاص تنقیدی اصول حدیث، تاریخ اور ادب سے متعلق جب گفتگو ہوگی تو اس میں نہ اپنی خواہش اور پسند کو دخل دیا جائے گا، اور نہ سابقہ افکار اور موروثی خیالات کو، اس پر جب تنقید کی جائے گی تو نقد حدیث کے جو اصول ہیں ان کو سامنے رکھنا پڑے گا، فن قرأت اور فقہ اللغہ کی واقفیت درکار ہوگی، اور پھر ان سے استنباط کے بعد ہی بات قابل قبول ہوگی، علماء اسلام نے احادیث کی تنقید کے جو اصول بنا دیئے ہیں ان کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، انھوں نے اپنے اسی اصول کے تحت صحیح اور غلط کو پرکھا ہے، فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ اور لغت کے سلسلے میں اسی اصول سے وہ کام لیتے رہے ہیں، یہ نہایت معروف اور متوازن طریقہ ہے اور ایک منصف مزاج شخص کو چاہئے کہ اظہار رائے میں وہ اسی طریقہ کو اختیار کرے، انحراف، خلط مبحث اور تکذیب کا طریقہ نہ اختیار کرے، ہمارے محقق علماء نے ہمیشہ یہی طریقہ اعتدال ملحوظ رکھا ہے، آپ احمد محمود شاکر کا مقدمہ "مفتاح کنوز السنة" پڑھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے "ونسنک" کے کارنامے کو بہت سراہا ہے، لیکن کسی موضوع پر اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں کسی مستشرق کی تحریر پڑھیں گے، تو آپ دیکھیں گے کہ احمد محمود شاکر نے جگہ جگہ نوٹ لکھ کر اس کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، لیکن یہ دو جداجدا انداز ہیں،

اسی طرح جب آپ ڈاکٹر عبدالحلیم کی کتاب . . . . . یورپ اور اسلام مطالعہ کریں گے

دوسروں میں بھی یہی انداز نظر آئے گا۔

"گولڈزیہر" کی "مذاہب التفسیر الاسلامی" کا مقدمہ ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر نجار نے کیا ہے، جہاں اسکے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ اول درجے کا کارنامہ ہے، وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں پچاس غلطیاں ہیں، اور ان کی نہایت اچھے انداز میں تردید بھی کر دی ہے،

علمائے اسلام نے تنقید کا صحیح رخ اختیار کیا ہے اور بہت سی کتابوں میں ان کا ....، انداز بہت متوازن ہے، "السنة ومکانتها فی الاسلام" یعنی سنت اور اس کا درجہ اسلام میں، "الرد علی الاذیال الجاهلی" یعنی عرب جاہلی کی تردید، "ما یقال عن الاسلام" یعنی اسلام کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے، "الاسلام حقائقه واباطیل خصومه" یعنی اسلام مجموعہ حقائق ہے، اور اسکا ضد مجموعہ اباطیل، ... "الاسلام والحضارة الاسلامیة" یعنی اسلام اور اسلامی تہذیب اور "المستشرقون والدراسات الاسلامیة" یعنی مستشرقین اور ان کا اسلامی مطالعہ وغیرہ بیشمار مقالات ہیں جو عربی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں ان میں بھی اسی اصول سے کام لیا ہے۔

(ع - پ)

مقالات سلیمان جلد دوم

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں یورپ و امریکہ کے اسلامیات کے بعض ممتاز مستشرقین کے رد میں بہت ہی معرکۃ الآرا مضامین ہیں، مثلاً محمد بن عمر الواقدی اور سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی یعنی واقدی، امام زہری پر الزام، کتب خانہ اسکندریہ، رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں وغیرہ

قیمت :- ۱۱ روپے
مجلد

مطبوعات جدیدہ

التصویبات لما فی حواشی البخاری من التصحیفات (الجزء الاول)
مرتبہ مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی، اخباری سائز کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۲، قیمت تحریر نہیں،
پتہ: شعبۂ نشر و اشاعت، جامعہ مظہر العلوم، وارانسی،

صحیح بخاری حدیث کی سب سے اہم اور معتبر کتاب ہے، اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، یہ اپنی گوناگوں خصوصیات اور اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے اہل علم کا مرکز توجہ رہی، اور اس کی متعدد شرحیں اور حاشیے لکھے گئے، ہندوستان کے علما بھی اس برکت و سعادت سے محروم نہیں رہے، مولانا احمد علی سہارنپوری فن حدیث کے متبحر عالم تھے، درس و تدریس کے علاوہ کتب حدیث کی تصحیح اور طبع و اشاعت ان کا ایک اہم کارنامہ ہے، ان کی سعی و کاوش کی بدولت حدیث کی کئی کتابوں کے صحیح نسخے چھپ کر عام ہوئے، اس سلسلہ میں بخاری کی تصحیح و تحشیہ کا کام بھی انھوں نے برسوں کی محنت و جانفشانی کے بعد انجام دیا تھا، صحیح بخاری پر ان کے حواشی بہت مقبول ہوئے اور ان سے حدیث کے طلبہ و اساتذہ کو بڑا فائدہ ہوا، لیکن مرور ایام اور بار بار کی طباعت کے بعد ان میں بہ کثرت اغلاط راہ پا گئے تھے، اس لیے مولانا عبدالجبار صاحب نے دقت نظر سے مولانا سہارنپوری کے حواشی کا جائزہ لے کر ان کے اغلاط کی تصحیح کی اور اب افادۂ عام کے خیال سے انھیں شائع کیا ہے، لائق مرتب نے یہ مفید اور ضروری کام بڑی محنت اور دلچسپی سے کیا ہے، انھیں فن حدیث سے مناسبت بھی ہے اور وہ کئی برس سے صحیح بخاری کے درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں، زیر نظر کتاب میں صحیح بخاری کی پہلی جلد کے حاشیوں کے اغلاط کی تصحیح درج ہے، دوسری جلد کی تصحیح بعد میں شائع ہوگی، اس میں غلط اور صحیح عبارتیں بالمقابل نقل کی گئی ہیں، اور ہر عبارت کے حاشیے، صفحے اور سطروں کی تصریح بھی کی گئی ہے، اور ایک خانہ میں مقدمہ صحیح کا ذکر بھی جلد اور صفحات کی تعیین کے ساتھ ہے، اگر مختلف ابواب کے زیر عنوان ان کے

اغلاط علیحدہ درست کردی جاتے تو قارئین کو مزید آسانی ہوتی کتاب کا اختیاری ساتھ ذوق لطیف پر گراں گزرتا ہے شروع میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ایک مختصر تحریر بھی ہے، یہ اس کتاب کی خوبی کی ضمانت ہے۔

آپ حج کیسے کریں :- مرتبہ حافظ محمد یونس صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۴۴، شائع کردہ حکومت پاکستان وزارت مذہبی امور و اقلیتی امور، اسلام آباد،

حج اسلام کا اہم رکن ہے لیکن یہ صاحب استطاعت مسلمانوں پر عمر بھر میں صرف ایک ہی دفعہ فرض ہے اور عام عبادتوں کے مقابلہ میں اس کے احکام و مسائل زیادہ ہیں جو عموماً لوگوں کو مستحضر نہیں رہتے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے بھی بھول چوک ہو جاتی ہے، اس لئے حج کے ارکان و مناسک ذہن نشین کرانے کیلئے متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو پاکستان کی وزارت مذہبی امور کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ نہ زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر، اسکی ترتیب اور انداز بیان میں الجھاؤ اور پیچیدگی کے بجائے آسان زبان اور سادہ و عام فہم پیرایہ اختیار کیا ہے اور گھر سے روانگی سے لیکر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ میں قیام تک کی تمام اہم باتیں اور ضروری مسنون دعائیں قلمبند کی گئی ہیں، احرام، عمرہ، حج اسکی قسموں، اسکے جملہ ارکان و مناسک، حج کے خاص دنوں کے اعمال، مدینہ منورہ کی حاضری کے آداب اور وہاں قیام کے معمولات وغیرہ علیحدہ علیحدہ اسطرح بیان کیے گئے ہیں کہ معمولی اور اوسط درجہ کے قاری کو بھی اشتباہ و دقت نہ ہو، آخر میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ کی ان جگہوں کا ذکر ہے جنکی عموماً حجاج زیارت کرتے ہیں، اس سلسلہ میں مسجدوں اور اکثر اہم جگہوں کے متعلق مختصر نوٹ بھی دئے ہیں، غرض حج کے متعلق بہت مفید اور معلوماتی کتاب ہے اور گو پاکستانیوں کے لیے لکھی گئی ہے مگر ہندوستانی بھی اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اس میں چند ضروری چیزیں نظرانداز ہو گئی ہیں جیسے حج بیت اللہ کے مقدس سفر سے گھر تک واپسی کے متعلق ہدایات اور ضروری اور مناسب زاد راہ کے بارے میں مشورے، جہاز کے سلسلہ کی مشکلات اور ان کا حل وغیرہ، احکام و مسائل زیادہ مستند کتابوں سے لکھنا چاہئے تھا،

" ض "

رجسٹرڈ نمبر ل ۵۰   نومبر ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس روپے سالانہ

دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۱۲۸ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۱ء عدد ۵

مضامین

شذرات

گذشتہ مہینہ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یونیورسٹیاں ارباب کمال کو ایسی ڈگریاں دے کر اپنے وزن اور وقار میں اضافہ کرتی ہیں کشمیر یونیورسٹی کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اس نے علم و فن کے ایک سیمرغ، خیر و برکت کے ایک ہما اور خوش کلامی و شیوا بیانی کے ایک عندلیب کو اپنے حلقہ میں لے کر اپنی توقیر بڑھائی، ورنہ مولانائے محترم کے رتبہ کا شہباز اب ایک ایسے سدرۃ المنتہیٰ پر بیٹھ چکا ہے کہ جہاں ان کو کسی کلغی کی ضرورت نہیں، خواہ یہ کیسی ہی زریں و زر مکلل ہو، ان کی بامراد زندگی میں بہت سی ساعتیں ایسی آچکی ہیں جو زبانِ حال سے ان سے کہتی رہی ہیں

؎ وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

دارالمصنفین میں ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو "اسلام اور مستشرقین" پر جو بین الاقوامی سیمینار ہونے والا ہے، اس کی تیاری جاری ہے، ایران، مصر، پاکستان اور ہندوستان کے بعض اہل علم نے اس میں اپنی شرکت کی مسرت کا اظہار کیا ہے، ایک صاحب نے تو یہ لکھ کر توجہ دلائی ہے کہ دارالمصنفین کی تاسیس تو ان مستشرقین کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے ہی کی خاطر ہوئی، علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النبی جلد اول کے دیباچہ میں ان مستشرقین کے مبلغِ علم کا انکشاف جس طرح کیا ہے اس سے ہندوستان کے علمی حلقہ کے اربابِ علم کی آنکھیں کھلیں، علامہؒ نے ان مستشرقین ہی کی زبانی یہ کہہ کر ان کی ساری تحقیقات و تلبیسات کا راز کھول دیا تھا،

؎ دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

ان شاء اللہ اس سیمینار میں علامہؒ کے اسی اجمال کی تفصیل ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا قلم آج کل بڑا رواں دواں ہے، [illegible]

ہندوستان کے مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ استاذی محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی زندگی میں ان کی بعض تحریریں پڑھ کر فرمایا تھا کہ بہت دنوں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے علمی افق پر ایک درخشندہ ستارہ نمودار ہوا ہے، جو ممکن ہے آگے چل کر اور بھی زیادہ روشن ہو۔ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ نظامی صاحب کے دو خاص موضوع ہیں، ایک تو ہندوستان میں اسلامی تصوف اور دوسرا ہندوستان کی تاریخ میں مسلمان حکمرانوں کا عہد۔ ان دونوں موضوعات پر ان کی بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں۔

۱۹۵۳ء میں ان کی ایک ضخیم کتاب "تاریخ مشائخ چشت" شائع ہوئی تھی، جس سے ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ اس سے اسلامی تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مدد ملی اور خواجگانِ چشت کا ایسا واضح مرقع سامنے آیا کہ ان کی باطنی تعلیمات سے گرویدگی اور شیفتگی میں بڑا اضافہ ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم ہونے پر نظامی صاحب نے اس پر نظرِ ثانی شروع کی تو اسرارِ تصوف کے رموز و نکات کے زر و جواہرات کا اتنا بڑا انبار لگا دیا کہ پہلے سے اس کی شکل بہت بدل گئی ہے۔ تاریخ مشائخ چشت کے اس نئے ایڈیشن کو پڑھتے وقت قارئین محسوس کریں گے کہ فاضل مصنف نے تصوف کے تختِ طاؤس پر بیٹھ کر صاحبِ قرانی کی ہے۔ وہ تصوف پر جب کوئی تحریر لکھتے ہیں تو اس میں توانائی، اثر اور قوتِ نفوذ کے موتی اور یاقوت جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ کی سات جلدیں ابھی اور شائع ہوں گی، اگر یہ بھی شائع ہو گئیں تو نظامی صاحب اپنی علمی جگر کاوی کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کے ان فضلاء کی یاد تازہ کر دیں گے جن کے علم و قلم کے ابرِ بار ان سے مسلمانوں کے فضل و کمال کا مرغزار لہلہاتا رہا ہے۔

اس نئے ایڈیشن کو ادارۂ ادبیات دلی نے بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے، جس سے کتاب کے سونے پر سہاگہ کا کام انجام پا گیا ہے۔ اتنی عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ اردو میں بہت ہی کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے لیے ادارۂ ادبیات دلی بھی ہر طرح کی مبارکباد کا مستحق ہے۔

اسی ادارۂ ادبیات دلی کی طرف سے نظامی صاحب کی انگریزی میں سپلیمنٹ ٹو ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن ہسٹری آف انڈیا کی جلدیں بھی چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ یہ ان کا ایک شاندار علمی کارنامہ ہے۔ اس وقت اس کی دو جلدیں میرے سامنے ہیں۔ ایک جلد کے پیش لفظ اور تمہید میں ایلیٹ کی شر انگیزیوں کا تجزیہ فاضلانہ انداز میں کیا گیا ہے، جس سے تاریخ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کا مطالعہ کرنے میں ایک نیا زاویۂ نظر ملتا ہے۔ دوسری جلد کے آغاز میں چھبیس صفحوں میں ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کے عنوان سے جو تبصرہ لکھا ہے

اس میں فاضل مصنف کی تحقیقی دیدہ ریزی کے ساتھ ان کے نظری استدلال، فکری استنباط اور تنقیدی تجزیہ کا بڑا خوشگوار امتزاج ہے، ایسی تحریروں سے مسلمانوں کے عہد کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی جو انگریزوں اور ان کی تقلید میں بعض انتہا پسند ہندو مورخوں نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پیدا کر دی ہیں۔

دونوں جلدوں میں غزنویوں سے لے کر تغلقوں کے عہد تک ان تمام ماخذوں کا احاطہ ہے جو ایلیٹ کی رسائی سے باہر رہے، ان میں ایسی تمام مذہبی، فقہی، شعری، ادبی، جغرافیائی، اثری، صوفیانہ اور فلسفیانہ کتابوں اور تحریروں کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے کچھ نہ کچھ مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، موجودہ دور میں ان عہدوں پر جو کتابیں یا مضامین لکھے گئے ان کا بھی تفصیلی ذکر ہے، ظاہر ہے کہ ان کو اکٹھا کرنے میں شمع نیم شبی ہی سحر دم جلی گئی ہوگی اور خواب صبح گاہی کو معلوم نہیں کس کس طرح حرام کرنا پڑا ہوگا، ایلیٹ کی آٹھ جلدوں کی طرح یہ ضمیمے بھی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہوں گے جن کی اشاعت کے بعد ریسرچ کرنے والوں کو مسلمانوں کے دور کی تاریخ کے وہ سارے ضروری ماخذ معلوم ہو جائیں گے جو وہ جاننا چاہیں گے، ادارۂ ادبیات دلّی بھی داد کا مستحق ہے کہ وہ نظامی صاحب کے سینے کے خزینے کو دیدہ زیب سفینے میں محفوظ کر رہا ہے۔

اس ملک میں ادارۂ ادبیات دلّی ہی شاید انگریزی کا ایک ناشر کتب ہے جس کے مالک ایک صاحب ذوق اور صاحب عزم مسلمان ہیں، اب تک اس کی طرف سے تقریباً اسّی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی، تاریخی اور علمی سرگرمیوں سے متعلق ہیں، ان سے ایک بڑا خلاء پُر ہو رہا ہے، ان ہی مطبوعات میں علامہ شبلیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" کا انگریزی ترجمہ "عالمگیر" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کا ذکر راقم نے کیا ہے۔

گذشتہ مہینہ بمبئی کے جناب اے۔ اے۔ فیضی کی وفات ہو گئی، وہ ۱۹۱۹ء سے دارالمصنفین کے لائف ممبر تھے، اپنی نظر و فکر میں جدید کاری اور ترقی پسندی کے باوجود آخر وقت تک علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدردان رہے، بمبئی جب جانے کا اتفاق ہوا تو وہ ایک شفیق بزرگ ہی کی طرح ملے، ان کے مذہبی اور فقہی خیالات کا احتساب تو وہاں ہوگا جہاں اب دائمی طور پر پہنچ گئے ہیں، مگر ان میں بعض ایسی شریفانہ خوبیاں تھیں جن کو ان کے معاصر دوست اور ملنے والے مدتوں یاد کریں گے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی ادا پسند آجائے جس سے ان کی مغفرت کا سامان ہو جائے، آمین۔

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات "راحت القلوب" کا مطالعہ

از مولانا اخلاق حسین دہلوی

راحت القلوب (فارسی نسخہ) مطبوعہ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء مطبع قاسمی میرٹھ حجم ۶۰ صفحات [illegible] مسطرہ ۲۰ سطری، قلم خفی، یہ چوبیس (۲۴) مجالس ملفوظات کے بیانات کا مجموعہ ہے جو حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ملفوظات پر مشتمل ہے اس کے جامع حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء علیہ رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ فی الحال چند اوراق منتشرہ کا مجموعہ ہے۔

۱۔ استنادِ وقامت | یہ صحیح ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ملفوظات کو جمع فرمایا تھا چنانچہ ۲۰ شوال ۷۰۸ھ کی مجلس میں آپ نے فرمایا:

کلماتے کہ از شیخ اسلام [illegible] بنوشتم تا این | جو باتیں میں نے اپنے شیخ سے [illegible]
غایت آن مجموعہ [illegible] است۔ | لکھ لیں اور وہ مجموعہ ملفوظات میرے پاس

(فوائد الفواد ص ۳۶۰) | محفوظ موجود ہے۔

ان بیانات کا تعلق خواجہ امیر حسن علاء سجزی کی اس یادداشت سے ہے جو انہیں نے حضرت محبوب الٰہی کے

ملفوظات کو جمع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے حضرت والا کی خدمت میں پیش کی تھی، حضور محبوب الٰہیؒ نے اس سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا تعلق اجازت سے بھی ہے اور ہمت افزائی سے بھی۔ اس گفتگو میں کتاب کے نام سے متعارف کرانا خالی از تکلف نہ ہوتا کیونکہ مدعا اسی سے حاصل تھا جو کچھ آپ نے فرمایا تھا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "تا ایں غایت آں مجموعہ بہ من است" اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات معروف و متداول نہ تھا، اس لیے بھی نام سے متعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جو بھی آداب مجلس سے آگاہ اور رمز شناس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ضمنی اذکار میں صورت حال یہی ہوتی ہے کہ کتاب کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ کبھی اشارہ کنایہ سے اور کبھی مصنف کے ذکر پر اکتفا کر لیا جاتا ہے کہ فلاں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، خیر المجالس میں اور متعدد کتب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ ارشاد اقتضائے حال کے بالکل مطابق ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو کتاب آج ان ملفوظات پر مشتمل مانی جاتی ہے اور مانی جاتی رہی ہے اور جو معروف و متداول ہے اور داخلی و خارجی شواہد بھی اس کے حق میں ہیں، پھر بھی وہ کوئی اور کتاب ہے اور ملفوظات کا مجموعہ نہیں ہے، یہ منطق لایعنی ہے، قابل قبول نہیں ہے، آئندہ شواہد بتائیں گے راحت القلوب انہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کا ذکر محبوب الٰہیؒ نے فرمایا تھا۔

یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق نکتہ ہے کہ یہ مجموعۂ ملفوظات حضرت محبوب الٰہیؒ کو اس قدر مرغوب و محبوب تھا کہ نصف صدی کے قریب مدت گذر چکی تھی مگر آپ نے اسے کلیجے سے لگائے رکھا اور چھپنے نہ دیا تھا، کتنے پیار سے فرمایا ہے "تا ایں غایت آں مجموعہ بہ من است" مزید یہ بھی فرمایا:

ہم دراں ایام مردے مرا کاغذہائے	ان دنوں میں ایک شخص نے سفید کاغذ
سفید داد یکجا جلد کردہ، من آں را	یکجا جلد بستہ مجھے دیے جو میں نے لیے

(فوائد الفواد ص ۳۳۱ پر) ۔

ششم بفرمود شیخ ہم بدان ثبت کردم بالا — و اندر ان حضرت شیخ کہ فرمودہ فوائد

ہشتم سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ — اشارات قلم بند کیے، اور یہ کہا سبحان اللہ

واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم — والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول

(فوائد الفواد ص ۳۱) — ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ان بیانات سے بخوبی ثابت ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جمع فرمائے تھے، جو آٹھویں صدی ہجری کے ربع اول تک آپ کے پاس محفوظ و موجود تھے، مگر ظن غالب ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات متداول و معروف نہ تھا، اگر ہوتا تو اعادۂ ذکر کی ضرورت نہ ہوتی، تاہم اس کے مبارک نام کی اطلاع نہیں، اس سے قریب تر عہد ہی میں شمائل الاتقیاء، دلائل الاتقیاء سے

(حاشیہ ص ۳۳۰) پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس عبارت کا کہ "ترو سے مرا کاغذہای سفید دادکہ جلد کردہ" یہ ترجمہ کیا ہے "ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا" (حضرت نظام الدین اولیا، حیات و تعلیمات ص ۶۸) یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، کاغذہا میں علامت جمع موجود ہے، ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک شخص نے جلد بستہ سفید کاغذ کی بیاض مجھے دی۔

۱؎ مطبوعہ نسخہ راحت القلوب (فارسی) میں کلمۂ تمجید سبحان اللہ الخ بھی بالائی حصہ میں مرقوم نہیں ہے۔ مجھے بھی اس باب میں تردد تھا مگر مطالعہ نے رہنمائی کی اور میرا یہ تردد رفع ہو گیا، مطالعہ نے یہ بتایا کہ حوادثات روزگار سے نقل و کتابت میں اس قسم کے سہو بکثرت واقع ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، یہ تو ہے کہ بے تعلق عبارت، ممکن ہے کسی نے اس بے تعلقی سے متاثر ہو کر اسے حذف کر دیا ہو، اور فوائد الفواد کا بیان اس کے مطالعہ میں نہ رہا ہو [illegible] مواقع اتفاقیہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے عبارت بے ربط ہو جاتی ہے، اس کا تدارک یہ ہے کہ [illegible] [illegible] یہ تردد رفع ہو جائے گا، بشرط اختصار [illegible] [illegible] کسی کتاب کے مکمل ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر قلمی نسخہ میں [illegible] شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں [illegible]

(بقیہ ص ۳۳۲ پر)

حق ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے معزز خلیفہ مولانا برہان الدین غریبؒ (المتوفی ۷۳۲ھ) کے ایماء اور ان ہی کی نگرانی میں ان کے لائق ترین مرید و مستند اہل قلم مولانا رکن الدین عماد کاشانی دبیرؒ نے تالیف کی تھی، جس کی فہرستِ ماخذات میں اس کا نام موجود درقوم ہے۔

محلِ غور ہے کہ مولانا برہان الدین غریب علیہ الرحمۃ سالہا سال اور مدت مدید تک حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں رہے اور قریب تر رہے، اور وہ ایسے محب صادق اور برگزیدہ بزرگ تھے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ انھیں عزیز رکھتے اور ان کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے، حتیٰ کہ مولانا برہان الدین غریبؒ کی وفات کے بعد بھی مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کی اس روش میں فرق نہ آیا، وہ حولیؒ ماحول سال کے سال ان کا عرس کرتے اور خراجِ محبت پیش کیا کرتے تھے۔

ان حالات کے پیشِ نظر اس بدگمانی کی گنجایش کہاں رہتی ہے کہ مولانا برہان الدین غریبؒ جیسے جلیل القدر اور طبقۂ اولیٰ کے بزرگ اس سے واقف نہ ہوں کہ وہ مجموعۂ ملفوظات جو راحت القلوب کے نام سے منسوب ہے، ان ملفوظات پر مشتمل نہیں ہے جن کا ذکرِ خیر حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان مبارک پر آیا ہے، اگر ایسا ہوتا اور راحت القلوب کوئی جعلی کتاب ہوتی تو یقیناً وہ ہرگز یہ گوارا نہ کرتے کہ اسے فہرستِ ماخذات میں شامل کیا جائے، لہٰذا شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کی فہرست ماخذات میں راحت القلوب کا شمول

(بقیہ ص ۳۳۱) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے، اور یہ اسی نام سے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۹۶ھ کا مکتوبہ ہے حضرت مولانا نسیم احمد فریدی صاحب مدظلہ العالی مفتی امروہہ نے عاریۃً مجھے بھیجا تھا جس سے میں نے استفادہ کیا ہے، اس کی فہرست ماخذات میں ڈیڑھ سو (۱۵۰) سے زیادہ کتب و رسائل کے نام مندرج ہیں، ان میں سے متعدد کتابیں ایسی ہیں جو نایاب و کمیاب ہیں، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۹۰ء کے حاشیہ میں ہے کہ یہ کتاب [illegible] میں [illegible] سے [illegible] الاتقیاء نام سے شائع ہوا تھا۔

وہ اس کو حضرت محبوب الٰہیؒ کی تالیف قرار دینا اس کا بین ثبوت ہے کہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا تھا۔

سنہ ۷۲۵ھ میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے پردہ فرمایا، سنہ ۷۲۷ھ عہد محمد تغلق میں دہلی کا انخلا عمل میں آیا اور بقول ابن بطوطہ دہلی میں کوئی بھی متنفس نہیں رہا تھا، ظن غالب یہ ہے کہ خواجہ رفیع الدین ہارونؒ جنھیں حضرت محبوب الٰہیؒ نے متولیِ خانہ و حظیرہ بنایا تھا، وہ حضرت کے موقوفہ کتب خانے کو اپنے ہمراہ دیوگیر (دولت آباد) لے گئے ہوں گے، ممکن ہے کہ وہیں مولانا برہان الدین غریبؒ نے یا مولانا رکن الدین کاشانیؒ نے وہ نسخہ لے لیا ہو جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی تحویل میں تھا، یا اس کی نقل حاصل کر لی ہو اور جب ہی سے اس کا نام زبان زد خلائق ہوا ہو۔

یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ اتنی قلیل مدت میں اور افراتفری کے زمانہ میں کسی نے جعلی کتاب کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنے کی جسارت کی ہو، اور مولانا برہان الدین غریبؒ جیسے بزرگ نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہو، یہ بدگمانی ہے اور سخت قسم کی بدگمانی ہے، کوئی دانشور اس لایعنی منطق کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس کے برعکس ایسے شواہد بکثرت دستیاب ہوتے ہیں کہ بالیقین راحت القلوب ان ہی ملفوظات پر مشتمل ہے جن کی طرف حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایما فرمایا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ایک نغز رنگ و عالم مرید مولانا محمد مجیر وجیہ ادیب کی تصنیف کتاب مفاتح الجنانؒ ہے جو انھوں نے سنہ ۷۵۶ھ میں لکھنی شروع کی تھی جس کی تصحیح خواجہ کمال الدین علامہ نے فرمائی تھی، اس میں ملفوظات بکثرت منقول ہیں جو راحت القلوب کے سوا دیگر دستیاب شدہ کسی مجموعۂ ملفوظات میں نہیں ہیں، اور یہ امر

ملہ مفاتح الجنان کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے، اور ایک نسخہ مخدوم ... کے پاس ہے، ممکن ہے اور کہیں بھی ہو۔

پیش راحت القلوب کے استناد اور قدامت کی روشن دلیل ہے۔

صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ نے بھی حضرت بابا صاحبؒ کے ان ملفوظات کا ذکر کیا ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے قلمبند فرمائے تھے، انھوں نے لکھا ہے:

"بعضے ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز سلطان المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز بخط مبارک خود در قلم آوردہ" (سیر الاولیاء ص ۴۴ طبع)

یہ صحیح ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ نے اس مجموعۂ ملفوظات کا نام نہیں لکھا، اس کے گوناگوں اسباب ہو سکتے ہیں، شاید حضرت محبوب الٰہیؒ کی اتباع مقصود ہو یا انھیں کوئی ناقص نسخہ دستیاب ہوا ہو، انھوں نے درر نظامی اور خیر المجالس کا بھی ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہ ان کے معاصرین کی یادگار ہیں، ان کا نام نہ لکھنا یا ذکر نہ کرنا ہرگز کسی کتاب کے جعلی اور وضعی ہونے کی یا عدم وجود کی دلیل نہیں ہو سکتی، خصوصاً اس لیے کہ ان سے پیشرو اور ان سے زیادہ متعدد معتبر حضرات نے راحت القلوب سے استفادہ کیا اور نام لکھا ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) عہد مغلیہ میں جلیل القدر عالم و درویش اور با کمال اہل قلم گذرے ہیں انھوں نے بھی ان مجموعۂ ملفوظات کا ذکر کیا اور لکھا ہے[1]:

"بعضے ملفوظات گنج شکرؒ کہ بخط شیخ نظام الدین اولیاء یافتہ اند مکتوب می گردد۔"

(اخبار الاخیار ص ۵۲ طبع مجتبائی)

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اصول تصوف سے بھی بہرۂ کامل رکھتے تھے اور تعلیمات اسلامی سے بھی، ان جیسا با کمال بزرگ سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی نو مولود اور جعلی نسخے کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب فرماتے اور اس سے استفادہ کرتے، یا کسی ایسے نسخۂ ملفوظات کو حضرت بابا صاحبؒ کے

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اسرار الاولیاء کا ذکر کیا ہے، انھوں نے کہیں مشائخ چشت کی کتب ملفوظات سے انکار نہیں کیا ہے۔

ملفوظات سے تعبیر کرتے جو تعلیمات اسلامی یا اصول تصوف کے خلاف مضامین پر مشتمل ہوتا، بلاشبہ اگر وہ کم علمی یا بد احتیاطی کا شائبہ بھی پاتے تو ان کی حق گوئی ہرگز اس کے اظہار میں تامل نہ کرتی۔

شاہ محمد بولاق مرحوم وابستگانِ درگاہِ حضرت محبوب الٰہیؒ سے تھے، خوش گو شاعر اور باکمال اہلِ قلم تھے، انھوں نے ۱۱۹۹ھ میں مطلب الطالبین[1] نام سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی سوانح حیات لکھی تھی، راحت القلوب سے استفادہ کیا ہے اور حوالہ دیا ہے، الغرض متعدد کتب تذکرہ و تصوف میں متواتر راحت القلوب کا ذکر ملتا ہے، حتیٰ کہ چودھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم و عارف خواجہ غلام فرید چشتی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) کی زبان مبارک پر بھی راحت القلوب کا ذکر آیا، اور انھوں نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی حکمت اس طرح ہے کہ مشائخ عظام کے ملفوظات مثلاً حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الدین گنج شکر قدس اللہ سرہٗ کے ملفوظات سیر الاولیاء اور راحت القلوب میں بھی شیخ علی احمد صابر رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں آیا" (مقابیس المجالس ص ۳۶۴ ترجمہ)[2]

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ کا مجموعۂ ملفوظات مقابیس المجالس کا مطالعہ شاہد ہے کہ حضرت خواجہؒ علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے تھے، کثیر المطالعہ تھے اور نگاہ تنقید سے مطالعہ فرماتے تھے۔

کتب تذکرہ و ملفوظات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جاتا ہے تو قدم قدم پر راحت القلوب کی قدامت اور اس کے استناد کے شواہد دستیاب ہوتے اور اس کی روایتیں منقول ملتی ہیں، اور کی

---

[1] مطلب الطالبین کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے اور ایک نسخہ راقم کے پاس ہے۔
[2] مقابیس المجالس کے مترجم نے اس عبارت کے متعلق جو حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے اس میں کتب ملفوظات مشائخ چشت کو جعلی ثابت کرنے کی ناکام اور لایعنی ندامت کوشش کی ہے جو نہ صرف ... اور ... ناقص ہے بلاشبہ ایک جلیل القدر عالم و عارف کے مقابلہ میں یہ علمی اور لایعنی اظہار سے قابل ندامت جسارت ہے۔

[illegible] اور تذکرہ نویسوں کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے، اور اس کے معتبر و قدیم ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

بلا شبہ حوادثِ روزگار سے متاثر ہونا فطری امر ہے، جس سے چارۂ کار نہیں، قلمی کتابیں اکثر و بیشتر اس سے متاثر ملتی ہیں، بلا شبہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے، جن کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ کی مبارک زبان پر آیا تھا، راحت القلوب صحیفۂ رشد و ہدایت بھی ہے، اور وہل دل کے لیے سرچشمہ بھی ہے، اس کے مطالعہ سے نیکی و نکوکاری کا ولولہ موجزن ہوتا اور توفیق عمل نصیب ہوتی ہے۔

۲. جعلی کا وسوسہ | جعلی کا وسوسہ بعض ان مستشرقین کو لاحق ہوا ہے جو صحیح ذوقِ تصوف نہیں رکھتے اور جو شعورِ دینی سے عاری ہیں، اور انھوں نے بصیرت کی نگاہ سے راحت القلوب کا مطالعہ نہیں کیا ہے، انھیں خیر المجالس اور جوامع الکلم کی دو ایسی عبارتوں سے مغالطہ ہوا ہے جو الحاقی ہیں، مبہم و بے معنی اور بے ربط ہیں، اور میزانِ سخن پر صحیح نہیں اترتیں، بلکہ ناقص و ادھورا ہونا ثابت ہوتی ہیں، جب صحیح تنقیدی شعور سے پرکھا جاتا ہے، تو ان کی قباحتیں واضح ہو جاتی ہیں، اور جعلی کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے۔[1]

۳. تاریخی اندراجات | جب کسی ایسی قدیم کتاب پر اظہارِ خیال مقصود ہو، جس میں تاریخی اندراج ہوں تو مناسب یہ ہے کہ پہلے تاریخی اندراجات کا جائزہ لے لیا جائے، اگر صحیح اور دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہیں تو فہو المراد، ورنہ انھیں مسترد قرار دیا جائے، اور صحیح تاریخی اندراجات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، اور صحیح تاریخی اندراجات کی روشنی میں واقعات کو پرکھا جائے، ورنہ کیا دعواے اکارت جائے گا۔

---

[1] خیر المجالس اور جوامع الکلم کی مذکورہ عبارتوں کی حقیقت سے واقفیت کے لیے مضمون عنوانی "مطالعہ ملفوظات خواجگانِ چشت کے مبادیات" کا مطالعہ کار آمد ہے جو معارف اعظم گڈھ، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

متعدد وجوہ کی بنا پر تاریخی اندراجات صحیح نہیں رہتے، حتیٰ کہ اس قسم سے تاریخ کی قدیم و معتبر کتابیں بھی مبرا نہیں ہیں، یہ طریقہ سنجیدہ اہل علم کا نہیں ہے کہ غلط تاریخی اندراجات کو اساس بنا کر کسی کتاب کے مندرجات کو خلاف واقعہ اور کتاب کو جعلی اور نامعتبر قرار دیا جائے، اگر یہ روش اختیار کی جائے گی تو طبقات ناصری منہاج سراج، تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی اور تاریخ فرشتہ ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ میں مندرج متعدد واقعات کو خلاف واقعہ اور ان کتابوں کو نامعتبر یا جعلی قرار دینا ہوگا، گویا کہ غلط تاریخی اندراجات کو بلا تحقیق معتبر مان کر واقعات کو یہ کہنا اصولاً غلط ہے، جو ایسا کرتا ہے وہ دراصل علمی قدروں سے بے بہرہ ہے، اور اس کی کارکردگی ہرگز قابل اعتنا نہیں۔

الغرض ان مراعات کے ساتھ ہمیں راحت القلوب کے تاریخی اندراجات کا جائزہ لینا ہے، فی الحال میرے پیش نظر راحت القلوب کا مطبوعہ فارسی نسخہ بھی ہے اور اس کا وہ ترجمہ بھی ہے، جو مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے سنہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں کتاب "ملفوظات خواجگان چشت" کے مجموعہ میں شایع کیا تھا، تراجم اور بھی ہیں، لیکن فی الحال ان ہی دونوں نسخوں سے تاریخی اندراجات نقل کیے جاتے ہیں، جس سے ان کی نوعیت و کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔

۴ — تاریخی اندراجات کا نقشہ

فارسی نسخہ راحت القلوب	ترجمہ بریاں	تقویم میں
۱. بدھ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ	بدھ ۱۱ رجب ۶۵۵ھ	۱۵ رجب کو اتوار ہے، ۱۱ رجب کو پیر ہے، بدھ نہ پندرہ کو ہے نہ گیارہ کو
۲. جمعرات ۲۱ شعبان "	ہفتہ ۱۶ ر " "	۱۹ شعبان کو بدھ ہے، ۲۰ رجب کو پیر ہے
۳. پیر ۲۱ ماہ مذکور "	بدھ ۲ ر " "	۲۰ شعبان کو اتوار ہے، ۲ رجب کو ہفتہ ہے
۴. اتوار ۲۷ ر " "	منگل ۲۷ ر " "	۲۷ رجب کو بدھ ہے
۵. جمعرات ۲۹ شعبان "	جمعرات ۱۰ شعبان "	۲۹ شعبان کو منگل ہے، ۱۰ شعبان کو جمعرات ہے

فارسی نسخہ راحت القلوب	ترجمہ بریان	
۶۔ خدارید ۱۱ر ماہ مذکور	خدارو ۱۱ر ماہ مذکور	
۷۔ 〃 〃 ۱۳ر ماہ مذکور	〃 ۱۳ ماہ مذکور	
۸۔ 〃 〃 ۲۵ر 〃	〃 ۲۵ 〃	
۹۔ 〃 ۵ر رمضان	〃 ۵ر رمضان	
۱۰۔ پیر ۲۵ر شوال	〃 ۵ر شوال	۲۵ر شوال کو پیر ہے
۱۱۔ خدارید ۱۵ر ماہ مذکور	〃 ۵ر 〃	ایک ہی تاریخ میں دو مجلسیں ہیں یہ کیوں؟
۱۲۔ 〃 〃 ۲۰ر 〃	〃 ۱۰ر 〃	
۱۳۔ 〃 ۲۱ر 〃 ۶۵۵ھ	〃 ۲۱ر ماہ مذکور	
۱۴۔ 〃 ۱۰ر ذیقعدہ ۶۵۵ھ	〃 ۲ر ذیقعدہ	
۱۵۔ 〃 ۱۲ر 〃	〃 ۱۲ر 〃	
۱۶۔ 〃 ۲ر ذی الحجہ	〃 ۲ر ذی الحجہ	
۱۷۔ 〃 ۱۷ر 〃	〃 ۱۷ر 〃	
۱۸۔ 〃 ۲۰ر ماہ مذکور	〃 ۲۰ر 〃	
۱۹۔ 〃 ۲۶ر 〃	〃 ۲۶ر 〃	
۲۰۔ 〃 یکم ماہ محرم ۶۵۶ھ	〃 یکم محرم ۶۵۶ھ	
۲۱۔ 〃 ۱۰ر ماہ مذکور	〃 ۹ر ماہ مذکور	
۲۲۔ 〃 ۴ر ماہ صفر	〃 ۴ر صفر	
۲۳۔ 〃 ۲۶ر ماہ مذکور	〃 ۲۵ر 〃	
۲۴۔ 〃 ۲ر ربیع الاول	〃 ۲ر ربیع الاول	

اس نقشے کے تقابلی مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ راحت القلوب کے فارسی نسخہ میں اور ترجمہ بریانی میں تاریخوں کے ساتھ صرف پانچ پانچ دن لکھے ہیں، ان کا تقویم سے مقابلہ ہو سکتا ہے، باقی چونکہ نام ہیں لہٰذا ان کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ ان پانچ پانچ کے تقابل سے یہ واضح ہے کہ صرف ایک ایک دن تقویم کے مطابق ہے، باقی نہیں۔

اس نقشہ کے تقابلی مطالعہ سے اور بھی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو بالترتیب واحد درج ذیل ہیں:

(۱) دن اگرچہ صرف پانچ پانچ تاریخوں کے ساتھ ہیں، لیکن ایک ایک کے سوا تقویم سے کسی کی تصدیق نہیں ہوتی، باقی سب ہی غلط اور ناقابلِ قبول ہیں۔

(۲) فارسی نسخے میں کسی مہینے کی کوئی تاریخ ہے تو ترجمہ بریانی میں کوئی اور تاریخ ہے، مثلاً فارسی نسخے میں ۲۔۳۔۴۔۵ مجلسوں کی تاریخیں ۱۶ر، ۲۰ر، ۲۷ر، ۲۹ر شعبان ہیں، اور ترجمہ میں ۱۹ر، ۲ر، ۲۷ر رجب اور ۱۰ر شعبان ہیں، مہینے کا بھی فرق ہے، مگر ترجمہ فارسی متن ہی کے مطابق ہے، دن بھی بدلے ہوئے ہیں، یہ اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ اندراجات کسی اور کی صوابدید کا ثمرہ ہوں۔

(۳) مہینوں میں فرق ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے، اور سنین میں اس سے بھی زیادہ۔

(۴) اہم ترین بات یہ ہے کہ فارسی نسخے میں ۲۹ر شعبان کے بعد ۱۱ر، ۱۳ر، ۱۵ر تاریخیں ہیں، جن کے ساتھ ماہ مذکور لکھا ہے، اسی طرح ۲۵ر شوال کے بعد ۱۵ر، ۲۰ر، ۲۱ر تاریخیں ہیں، ان کے ساتھ بھی ماہ مذکور لکھا ہے۔ اگر یہ تاریخیں شعبان و شوال ہی کی ہیں تو ۲۹ر اور ۲۵ر کے بعد کیوں ہیں؟ ان سے پہلے ہونی چاہیے تھیں، اگر کسی اور مہینے کی ہیں تو اس کا نام ہونا چاہیے تھا۔ یہ حالات بتاتے ہیں کہ فارسی مطبوعہ نسخہ کسی مستند نسخے سے منقول نہیں ہے، بلکہ کسی ایسے نسخے سے منقول ہے جو اوراقِ منتشر کا مجموعہ تھا اور جو املا کے باب میں نہایت درجہ ناقص تھا، البتہ اس سے یہ ثابت ہے کہ

کوئی جعلی نسخہ بھی نہیں تھا، کیونکہ کوئی جعل ساز افشائے راز کے خوف سے اس بے ہنگامی کو ہرگز گوارا نہیں کرتا، یہ ناشر کی دیانت داری کا ثبوت ہے کہ اس نے جوں کا توں شایع کر دیا۔

(۵) سنین قطعاً غلط ہیں، راحت القلوب کی پہلی مجلس کے آغاز میں ۵ ار رجب ۶۵۵ھ اور آخری مجلس کے آغاز میں ۲ ربیع الاول ۶۵۶ھ مندرج ہے، یا تو یہ صحیح پڑھے نہیں جا سکے ہیں یا غلط بیانات سے متاثر ہو کر کسی نے تبدیل کر دیے ہیں، کیونکہ بعض ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جو غلط فہمی اور غلط بیانی پر مبنی ہیں، الغرض تاوقتیکہ مصدقہ اقوال کی روشنی میں ان اندراجات کا جائزہ نہ لیا جائے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخی اندراجات کا جائزہ

ان تاریخی اندراجات کا جائزہ ان مصدقہ بیانات و اقوال کی روشنی میں لیا جا سکتا ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت و ارادت اور خلافت و وفات سے متعلق معتبر کتابوں میں ملتے ہیں، جن میں سے بعض حضرت محبوب الٰہیؒ ہی کے اقوال و بیانات ہیں، امیر خورد کرمانی نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی تاریخ وفات کے متعلق لکھا ہے:

ہژدہم ماہ ربیع الآخر خمس و عشرین و سبعمائۃ	اٹھارہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ ہجری کو سورج
بعد طلوع آفتاب سلطان المشائخ بجوار رحمت	نکلنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ جوار رحمت
رب العلمین پیوست (سیر الاولیا ص ۱۵۵ طبع)	رب العلمین میں تشریف لے گئے، وصال فرما

امیر خورد کرمانیؒ نے آپ کی عمر عزیز کے متعلق یہ بھی صراحت فرمائی ہے:

عمر عزیز سلطان المشایخ ہشتاد و سال	حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر اسی سال کی
کشید (سیر الاولیا، ص ۱۵۴ طبع)	ہو گئی تھی۔

خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے اندازاً پچھتر برس کی بتائی ہے (جوامع الکلم مجلس ۱۷ شعبان ۸۰۲ھ قلمی نسخہ) خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ ایک واسطے سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسلک تھے، انھوں نے حضرت

محبوب الٰہیؒ کو دیکھا بھی نہ تھا، مگر جو روایت انھیں بزرگوں سے پہونچی، انھوں نے اسے دہرا دیا ہے جس کا تعلق اندازے اور تخمینے سے ہے۔

اس کے برعکس امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو دیکھا تھا، آپ ہی کے بابرکت عہد حیات میں پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور آپ ہی سے شرف بیعت و ارادت حاصل کیا تھا، اس لیے امیر خورد کرمانیؒ کے بیان کو ترجیح ہے۔ اس کے علاوہ امیر خورد کرمانیؒ کے دادا بزرگوار سید محمد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہم خرقہ تھے، اور ان دونوں بزرگوں میں باہم ایسے خوشگوار تعلقات تھے کہ حضرت بابا صاحبؒ نے ان دونوں بزرگوں کو رشتۂ مواخات میں منسلک فرمایا تھا (سیر الاولیاء، ص ۲۰۹ پ ج) اسی لیے سید محمد کرمانیؒ مع اہل و عیال دلی چلے آئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہمراہ زندگی بسر کی، ان کے بعد ان کی اولاد در اولاد بھی حضرت ہی کے سایۂ عاطفت میں رہی جس پر حضرت محبوب الٰہیؒ خصوصی شفقت فرماتے تھے، ان حالات کے پیش نظر بھی امیر خورد کرمانیؒ ہی کے قول کو ترجیح ہے، تاہم یہ واضح ہے کہ متقدمین کی نگاہ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر عزیز زمانۂ وفات کے قریب اسی سال سے زیادہ نہ تھی، اور ان موثر بیانات کے مقابلہ میں بعد کے کسی بے سند بیان کو فوقیت نہیں ہو سکتی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ وفات ۷۲۵ھ ہے، اور عمر عزیز اسی برس کی ہوئی ہے، اس اعتبار سے آپ کا سنہ ولادت ۶۴۵ھ قرار پاتا ہے، جو درویش صفت بادشاہ سلطان ناصر الدین محمود کا عہد معدلت مہد ہے، اس کے علاوہ سنہ ولادت کی تصدیق دیگر بیانات سے بھی ہوتی ہے، امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں:-

می‌فرمود کہ روز چہارشنبۂ آخرین ماہ صفر ...... روزی بود ......
آپ فرماتے تھے کہ صفر کے مہینے کا آخری بدھ بہت برکت والا ہوتا ہے ...... اور ......

تولد ایں ضعیف ہم دریں روز است۔	یہ بھی فرماتے تھے کہ میری ولادت اسی دن کی
(سیر الاولیاء ص ۳۸۰ چ)	ہے، یعنی آخری بدھ کی ہے۔

اس اعتبار سے بعض اہل قلم نے آپ کا یوم ولادت آخری بدھ ۲۷ صفر لکھا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ [illegible] میں ۲۷ صفر کو بروئے تقویم آخری بدھ ہی ہے (تقویم ہجری و عیسوی ابو النصر خالد) بعض سوانح نگاروں نے آپ کا سنۂ ولادت ۶۳۴ھ اور ۶۳۶ھ لکھا ہے، جو خلاف تحقیق اور غلط ہے۔ شاہ محمد بولاق مرحوم لکھتے ہیں:

صاحب سیر الاولیاء در باب ہفتم فی نکتۂ اوراد	صاحب سیر الاولیاء نے ساتویں باب کے
ہفتہ وسالینہ گذارش می نماید وثبت می فرماید	نکتۂ اوراد ہفتہ وسالینہ میں لکھا ہے کہ سلطان المشائخ
کہ تولد سلطان المشائخ بروز آخریں چہار شنبہ	حضرت محبوب الٰہیؒ آخری بدھ کو آفتاب
بعد از طلوع آفتاب بتاریخ بست و ہفتم شہر صفر	کے طلوع ہونے کے بعد ۲۷ ماہ صفر سنہ
سنہ ست و ثلثین و ستمائۃ ۶۳۶ یعنی در سال ششصد	۶۳۶ ہجری کو پیدا ہوئے۔
و سی و شش بوقوع آمد (مخزن الاقطاب ص ۵	
مطلوب الطالبین ص ۸ قلمی)	

شاہ محمد بولاق مرحوم کا یہ بیان اگرچہ سیر الاولیاء سے ماخوذ و منقول معلوم ہوتا ہے، مگر حیرت ہے کہ سیر الاولیاء میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت سے متعلق صرف وہی دو جملے ہیں جو نقل کیے جا چکے ہیں، [illegible] یہ ہیں:

(۱) روز چہار شنبہ آخریں ماہ صفر قوی بابرکت است (۲) تولد ایں ضعیف ہم دریں روز است۔

(سیر الاولیاء ص ۳۸۰ چ)

ان الفاظ میں نہ کوئی سنہ ہے، نہ کوئی تاریخ اور نہ کوئی وقت، نہیں معلوم شاہ محمد بولاق مرحوم کو کیا مغالطہ ہوا؟

کہ انھوں نے سنہ کا اور تاریخ و وقت کا اضافہ فرمایا ہے، اور یہ معلومات انھیں کہاں سے حاصل ہوئیں [illegible] شیخ مصنف صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ سے منسوب فرمادی ہے، جو سیر الاولیاء کے دستیاب قدیم نسخوں میں بھی نہیں ہے، ان کے اس غیر مصدقہ بیان میں ۶۳۶ھ نہایت درجہ غلط ہے جس سے ان ہی کے بیان میں مطابقت برقرار نہیں رہتی، کیونکہ بروئے تقویم ۲۷ر صفر ۶۳۶ھ کو آخری چہار شنبہ (آخری بدھ) نہیں ہے، بلکہ شنبہ (ہفتہ۔ سنیچر) ہے، آخری چہار شنبہ (آخری بدھ) ۲۴ر صفر ۶۳۶ھ کو ہے (تقویم ہجری و عیسوی ابو نصر خالد) لہٰذا ان کا تعینہ سنہ ۶۳۶ھ غلط اور صریحاً غلط ہے مزید یہ کہ اس سے امیر خورد کرمانیؒ کی نوشتہ عمر اور سنۂ وفات سے بھی مطابقت برقرار نہیں رہتی۔

پھر یہ نکتہ بھی ہے کہ اگر امیر خورد کرمانیؒ یہ تفصیل لکھنی ہوتی تو وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت باسعادت کے ذکر کے ساتھ ہی لکھتے جو سیر الاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن) کے صفحہ ۹۵ میں ہے، غیر متعلق باب میں اتنی تفصیل سے کیوں لکھتے، بہر حال شاہ محمد بولاق مرحوم کا مذکورہ بیان نہ تو سیر الاولیاء سے ماخوذ ہے اور نہ صحیح ہے، اور نہ قابل قبول ہے، شاہ محمد بولاق مرحوم نے ایسا ہی یہ بیان بھی نقل کیا ہے جو نہایت درجہ مشتبہ و مشکوک ہے بلکہ سراسر غلط ہے، انھوں نے لکھا ہے:

سید محمد کرمانیؒ مرید خاص وے در کتاب	سید محمد کرمانیؒ آپ کے خاص مرید نے سیر الاولیاء
سیر الاولیاء کہ تصنیف و تالیف اوست سنہ	میں جو ان ہی کی تصنیف و تالیف ہے حضرت
عمر شریف در ایام مرض موت آں حضرت	محبوب الٰہیؒ کے مرض موت کے دنوں میں آپ کی
ہیچ کہ باید در باب چہارم فی نکتہ خلافتہا	عمر شریف جس طرح کہ چاہیے تھی جو تھے باب میں
استقرو معین نہ نمایند کہ چہل عمر سلطان	(دور) خلافت کے نکتہ میں مقرر و معین
المشائخ ہشتاد و نہ رسید	فرمائی ہے، وہ یہ کہ جب آپ کی عمر شریف
(ماخذ اقتباس ص ٥٠)	نواسی سال کی ہوئی تھی۔

مگر حیرت یہ ہے کہ سیر الاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن ص ۱۲۴) باب چہارم اور نکتۂ خلافت میں ہشتاد (نود) نہیں ہے، بلکہ ہشتاد سال کشید (اسّی سال کی ہوئی) ہے، اور یہی صحیح ہے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ان بیانات کے مطابق بھی ہے جو بیعت و ارادت سے متعلق ہیں اور جنھیں امیر خورد کرمانیؒ نے پوری احتیاط سے قلمبند کیا ہے جن کا ذکر آیندہ آئے گا۔

بہرحال شاہ محمد بولاقؔ مرحوم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنۂ ولادت جو ۶۳۶ھ لکھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، جو مدت عمر لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اور ان کا سیر الاولیاء سے ماخوذ بتانا بھی صحیح نہیں ہے۔

مولوی غلام احمد خاں بریاںؔ مرحوم نے ترجمہ سیر الاولیاء میں جو انھوں نے ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں اردو سیر الاولیاء کے نام سے شایع کیا تھا، غالباً شاہ محمد بولاقؔ مرحوم کے بیان سے متاثر ہو کر ذکر وفات کے ضمن میں "واضح ہو" کے تحت یہ بیان الحاق فرمایا ہے:

"واضح ہو کہ جناب سلطان المشائخ قدس سرہ رجب کی پندرہویں (۱۵) تاریخ ۶۵۵ھ میں شیخ شیوخ العالم کی شرف ارادت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت آپ کی بیس (۲۰) سال کی عمر تھی، آپ کی ولادت ۶۳۶ھ میں ہوئی اور انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا، اور جس وقت آپ کا انتقال ہوا اس وقت آپ کی عمر نوّے (۸۹) برس کی تھی (اردو سیر الاولیاء (ترجمہ بریاں) پندرھواں نکتہ ص ۱۶۲)

مولوی غلام احمد خاں بریاںؔ مرحوم کو اگر یہ اضافہ کرنا ہی تھا تو مناسب یہ تھا کہ وہ اسے حاشیہ میں لکھتے اور بتاتے کہ یہ ان ہی کی جدت طبع کا ثمرہ ہے، جو سراسر غلط ہے، اس طرح الحاق کر دینا بلا شبہ نہایت ہی نامناسب ہے، بہرحال سیر الاولیاء کے کسی فارسی نسخے میں ایسی کوئی عبارت نہیں ہے جس کا اس الحاقی بیان کو ترجمہ کہا جا سکے، میں سمجھتا ہوں کہ ترجمہ بریاںؔ ہی سے بعض اہل قلم کو مغالطہ ہوا ہے،

پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے پیش نظر بھی غالباً ترجمۂ بریاںؔ ہی تھا، انھوں نے لکھا ہے:

"امیر خورد لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت آپ کی عمر نواسی (۸۹) سال کی تھی، لیکن یہ صرف ۸۸ معلوم ہوتا ہے"

(کتاب حضرت نظام الدین اولیاء، حیات و تعلیمات ص ۱۲۴)

امیر خورد کرمانیؒ نے آپ کی عمر وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نقل کیا جاچکا ہے، دراصل یہ شاہ بلاق مرحوم کی اختراع ہے جسے مولوی غلام احمد خاں بریاںؔ مرحوم نے ترجمۂ سیر الاولیاء میں الحاق یا ہے، جس سے متعدد اہل قلم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جن صاحبوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت ۶۳۴ھ لکھا ہے، انھوں نے بھی ہ نہیں لکھا، سنہ ۶۳۴ھ میں آخری بدھ ۲۶ صفر کو ہے، اور اس کے اعتبار سے عمر ۹۱ سال ہوتی ہے خلافِ تحقیق اور غلط ہے۔

بیعت و خلافت سے لق صحیح بیانات

یہ ذکر آچکا ہے کہ راحت القلوب میں مرقومہ تاریخی اندراجات اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مفروضہ سنینِ ولادت ۶۳۶ھ اور ۶۳۴ھ کی تصدیق آپ کے مصدقہ بیانات سے بھی نہیں ہوتی جو بیعت و خلافت سے متعلق ہیں اور حضرت محبوب الٰہیؒ فرمودہ یا نوشتہ ہیں۔ امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے:

سلطان المشایخ بقلم خود نبشتہ است کہ	حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مبارک قلم
شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ	سے لکھا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ نے
سرہ العزیز کاتب حروف را بخواند،	جمعہ کے دن نماز سے فارغ ہونے کے
در روز آدینہ بعد فراغ نماز بیست و پنجم	بعد ۲۵ جمادی الاول ۶۶۹ھ کو مجھے
ماہ جمادی الاول سنہ تسع و ستین و ستمائۃ	بلایا اور اپنے مبارک دہن کا لعاب میرے
لعاب دہن مبارک در دہن کاتب کرد	منہ میں ڈالا اور قرآن پاک کو حفظ کرنے
و وصیت بحفظ کلام اللہ المجید منہ اللہ	کی وصیت فرمائی۔
تعالیٰ فرمود ...... (سیر الاولیاء ص ۱۲۲ ج ۲)	

امیر خورد کرمانیؒ نے اسی دورانِ قیام کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے:

در غرهٔ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستمائۃ از حضرت شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز التماس نمودہ آمد، شیخ شیوخ العالم باجابت و مدد و فاتحہ مقرون فرمود۔

شعبان ۶۶۹ھ کی پہلی تاریخ کو حضرت باباصاحبؒ سے دعا کے لیے درخواست کی جو آپ نے منظور فرمائی اور فاتحہ خیر سے مدد فرمائی، یعنی دعا فرمائی۔

(سیر الاولیاء ص ۱۲۳ ج ۲)

اسی دوران قیام کا یہ تیسرا واقعہ بھی ہے جو امیر خورد کرمانیؒ نے نقل کیا ہے:

سہ کرت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ العالم رفتم، بعدہٗ یک روز خواجہ طلبید سیزدہم ماہ رمضان سنہ تسع وستین وستمائۃ بود، فرمود کہ نظام! یاد داری آنکہ گفتہ بودم گفتم آرے۔ فرمود کہ کاغذ بیارید، اجازت نامہ بنویسند، کاغذ آوردند، و اجازت نامہ بنشتند۔

(سیر الاولیاء ص ۱۲۱ ج ۲)

میں تین[۳] بار دہلی سے حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، تیسری بار حاضر ہونے کے بعد ایک دن حضرت باباصاحبؒ نے مجھے بلایا، رمضان المبارک [illegible]ھ کی تیرھویں تاریخ تھی، دریافت فرمایا: نظام! تمھیں یاد ہے جو میں نے کہا تھا؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! یاد ہے۔ آپ نے فرمایا: کاغذ لاؤ تاکہ اجازت نامہ (خلافت نامہ) لکھا جائے، کاغذ لا دیا اور اجازت نامہ لکھ گیا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ پہلی بار حاضر خدمت ہوئے تھے تو حضرت باباصاحبؒ نے یہ دعا کہ، دَائِمَ الْفَضْلِ عَلَى الْبَرِيَّةِ الخ آپ کو عنایت فرمائی تھی اور یہ حکم فرمایا تھا:

این دعا را یاد گیر و مواظبت نمائی تا تر ا

اس دعا کو یاد کر لو اور ہمیشہ پڑھتے رہو،

خلیفۂ خود گردانم (سیرالاولیاء ص ۱۳۱ ج)	تاکہ میں تمہیں اپنا خلیفہ بنا دوں۔

یہ سوال کہ یاد داری آنکہ گفتہ بودم؟ اسی دعا کے متعلق تھا، الغرض ان تینوں بیانوں سے یہ واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ ۶۶۹ھ میں حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھے اور ان ہی ایام میں حضرت باباصاحبؒ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا اور مسند خلافت عنایت فرمائی تھی، خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے:

مرا در ماہ شوال بدہلی فرستادہ بود، نقلِ ایشاں در شب پنجم ماہ محرم بودہ است، (فوائد الفواد ص ۵۲)	مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا تھا اور حضرت باباصاحبؒ کا انتقال پانچویں محرم کی رات کو ہوا ہے۔

بروئے تحقیق حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ ہے، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا فرمودہ قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

فریدالدین کہ او گنجِ شکر بود — چو در ذاتِ خدا شد محوِ مطلق
بہ مظہر گفت ہاتف سالِ نقلش — فریدالدین ولیؒ واصلِ حق
۶۷۰ھ

بہرحال مذکورہ بیانات سے یہ واضح ہے کہ ماہ جمادی الاول ۶۶۹ھ سے شوال ۶۶۹ھ تک حضرت محبوب الٰہیؒ کا قیام اجودھن (پاکپتن) میں تھا، اور آپ حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں تھے، یہ تیسری بار کی حاضری تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے:

سہ کرت بخدمت شیخ الاسلام فریدالحق والشرع والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز رفتہ بودم ہر سال یکبار، بعد ازاں کہ نقل فرمود ہفت بار دیگر رفتہ شدہ است (فوائد الفواد ص ۴۳ سیرالاولیاء ص ۱۰۷ ج)	میں تین۳ بار حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں (اس طرح کہ) سال میں ایک بار، اس کے بعد کہ آپ کا انتقال ہوگیا تو سات بار مزید جانا ہوا ہے۔

اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت فیض درجت میں سال میں ایک بار حاضر ہوتے تھے، اس طرح کہ آتے ہوئے پورا سال گذرنے نہ پاتا تھا کہ آپ دہلی سے اجودھن (پاکپتن) تشریف لے جاتے اور حاضر خدمت ہوتے تھے، آمد و رفت میں کتنا وقت لگتا تھا، صحیح نہیں بتایا جا سکتا، گمان غالب یہ ہے کہ بیس ۲۰ دن کا سفر ہوتا تھا، اس اعتبار سے چھ ۶ بار کی آمد و رفت میں چار ماہ کی مدت صرف ہوئی ہوگی، اور تین ۳ بار کے دہلی اور اجودھن (پاکپتن) کے قیام میں چار سال کی مدت قرین قیاس ہے، گویا کہ سفر و حضر کی مدت چار ساڑھے چار سال ہوگی، اگر اس سفر و حضر کی مدت کو ۶۶۹ھ میں سے وضع کر دیا جائے تو پہلا سفر ۶۶۹ھ میں قرار پاتا ہے، گویا کہ ۶۶۵ھ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کو شرف بیعت حاصل ہوا تھا، کسی نے آپ سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ

شما چند سالہ بودید کہ بدولت ارادت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین طیب اللہ ثراہ مشرف شدید؟ فرمود بیست ۲۰ سالہ۔	آپ کی کتنی عمر تھی، جب آپ حضرت بابا صاحبؒ سے بیعت ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ بیس ۲۰ سال کی تھی۔

(سیر الاولیاء ص ۱۰۷ ج ۲)

۶۶۵ھ جو آپ کی پہلی حاضری اور بیعت ہونے کا سنہ متعین ہوا ہے، اس میں سے اگر بیس ۲۰ سالہ عمر وضع کر دی جائے تو سنہ ولادت ۶۴۵ھ قرار پاتا ہے، یہ وہی سنہ ہے جو سنہ وفات ۷۲۵ھ میں سے اسی سالہ مدت عمر وضع کرنے سے حاصل ہوتا ہے، گویا کہ ہر دو اعتبار سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت ۶۴۵ھ قرار پاتا ہے، اور داخلی شواہد سے بھی اس کی پوری پوری تائید ہوتی ہے، اور اس طرح آپ کا سنہ بیعت و ارادت ۶۶۵ھ متعین ہوتا ہے، ۶۵۵ھ نہیں ہوتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سات سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی متعدد سوانح حیات لکھی جا چکی ہیں، اور سوانح نگاروں نے قیاس و تجسس سے سنین کی تعیین کی ہے، لیکن کسی نے بھی

ثق سے اور داخلی شواہد سے کام نہیں لیا، اور بمصداق وکشینی اتا یقلد التاهون التاھیین علامہ ابن ہمامؒ) بھولے بھٹکے بھولے بھٹکوں کے قدم بقدم چلتے رہے، بعض لوگوں نے اگر کچھ کیا تو یا کہ اپنی اختراعات کو صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ کے سر تھوپ دیا جو نہایت درجہ مذموم ہے، ں سے سنین میں اور بھی خلفشار پیدا ہوگیا ہے، اور واقعات کے تطابق میں مزید دشواری لاحق گئی ہے، اور معاندین کو اعتراض کا موقع ہاتھ آگیا ہے، اگر یہ پیرانِ عظام رحمہم اللہ کی کرامت یا ن کی توجہ کا ثمرہ ہے کہ اتنی مدت تک حقایق حقہ محفوظ رہے، اور مجھ ناچیز کو اللہ پاک نے ان کے نشاف کی سعادت نصیب فرمائی، الحمد للہ علیٰ ذلک ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

الغرض اس تحقیق کے دوران حضرت محبوب الٰہیؒ کے سوانح حیات سے متعلق اہم واقعات کے سنین مجھے دستیاب ہو سکے ہیں، مفاد عامہ کے لیے انھیں ترتیب وار پیش کیے دیتا ہوں، یقینی کارآمد ثابت ہوں گے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی سوانح حیات سے متعلق اہم سنین کا نقشہ

(۱) ولادت	۶۴۵ھ	(۶) غیاث پور میں قیام کی ابتداء	۶۸۰ھ تا ۶۸۶ھ کے درمیان
(۲) دہلی تشریف لانا	۶۶۱ھ	(۷) سلطان بلبن کی وفات اور کیقباد کی تخت نشینی	۶۸۶ھ
(۳) بیعت ہونا	۶۵۵ھ	(۸) مختصر سا عہد سلطان تغلق	۷۲۳-۲۴ھ
(۴) خلافت کی سند ملنا	۶۶۹ھ	(۹) وفات بعمر ۹۰ سال	۷۲۵ھ
(۵) مشارق الانوار کی سند ملنا	۶۷۹ھ		

۸. راحت القلوب کا عہد تدوین | اس تفصیل و تحقیق سے یہ واضح ہے کہ راحت القلوب کا عہد تدوین [illegible] تا ۶۶۹ھ ہے، وجوہ کچھ بھی ہوں، تحریف ہو یا الحاق، کاتب و ناقل کا سہو ہو یا کسی کی غلط فہمی

بہرحال، راحت القلوب کی مجالس کے آغاز میں جو تاریخی اندراجات ہیں، وہ غلط ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ان کی بنا پر راحت القلوب کو جعلی اور وضعی قرار دیا جاسکتا ہے، اگر یہ غلط روش اختیار کی جائے گی، اور اس غلط کو صحیح سمجھا جائے گا تو بہت سی معتبر کتابوں کو جعلی اور وضعی قرار دینا ہوگا۔

اس عہد تدوین کے صحیح اور معتبر ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے بہت سے شبہات اور بہت سے مغالطے رفع ہو جاتے ہیں اور کسی معترض کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ فلاں بزرگ بقید حیات تھے، اور ان کا ذکر بطور متوفی کے ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیان غلط نہیں ہے، بلکہ تاریخی اندراج غلط اور صحت طلب ہے، اس عہد تدوین کے تعین سے تاریخی اندراج کی صحت ہو جاتی ہے، ان شاء اللہ اب کوئی مغالطہ لاحق نہ ہوگا۔

۹۔ تذکروں میں سنین | تذکروں میں جو سنین مرقوم ملتے ہیں، ان میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ غلط ہیں، ان کی بے ثباتی اس سے ظاہر ہے کہ بعض سنین مختلف ملتے ہیں، تاوقتیکہ تحقیق کی کسوٹی پر ان کو پرکھا نہ جائے، نہ تو ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی کو کسی پر ترجیح دی جاسکتی ہے، قیاساً کسی کو ترجیح دینا صحیح نہ ہوگا، اور اگرچہ راحت القلوب دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں، اور غلط تاریخی اندراجات بھی اس میں در آئے ہیں، لیکن جہاں تک متن کا تعلق ہے اس کی صحت سے انکار ہرگز مناسب نہیں ہے۔

۱۰۔ تحقیقی کارنامہ | تحقیقی کارنامہ کیسا ہی صحت مند ہو، حرف آخر نہیں ہوا کرتا، تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے، اولوا العزم جب میدان عمل میں اترتے ہیں تو کچھ نہ کچھ کرکے دکھاتے ہی ہیں، مجھے بھی یہ دعویٰ نہیں کہ میری یہ تحقیق حرف آخر ہے، مجھ سے جو بن پڑا بفضلہ تعالیٰ اپنی بساط کے مطابق میں نے کر دکھایا ہے، یہ نشان راہ ہے جو زبان حال سے کہہ رہا ہے:

مصرع۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم، دراصل یہ کرامت ہے چشم بینا کے لیے ان بزرگوں کی

چودھویں صدی کی تاریکی میں چراغ راہ ہے ؎

مریٔ مسلم دریں شب تار بےمعنیٰ خفتہ کرد بیدار

۱۱. **نقلِ روایت** | یہ انسانی فطرت ہے کہ جو روایتیں اور حکایتیں مجالسِ وعظ و نصائح میں سنی جاتی ہیں یا کتابوں میں پڑھتے ہیں انھیں برمحل بیان بھی کر دیا کرتے ہیں، صوفیۂ کرام بھی بزرگانِ سلف سے مروی روایات کو بیان فرمایا کرتے تھے، بلکہ ملفوظاتِ مشائخ کے مطالعہ کی تاکید بھی فرماتے تھے، قرآن پاک سے بھی اس کا استحسان واضح ہے۔

جو علم مجلسی سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ بیان کرنے والا خواہ ایک ہی شخص ہو، لیکن جب کسی ایک روایت کو مختلف مجالس میں بیان کرتا ہے تو حالات کے اقتضاء سے اسلوبِ بیان میں فرق پڑ جاتا ہے، اس امتیاز کو نقل میں بے احتیاطی سے وہی تعبیر کرے گا جو بیان کی نفسیات سے نابلد ہوگا، فوائد الفواد صفحات ۱۷۲ و ۱۷۶ - ۱۹۵ و ۲۰۲ - ۲۱ و ۵۹ میں، اور خیر المجالس صفحات ۱۳۱ و ۱۳۷ میں ایسی ہی روایتیں ہیں جن سے اس اسلوبی امتیاز کی تصدیق ہوتی ہے، جن کے بیان کرنے والے بھی ایک ہی ایک بزرگ ہیں اور لکھنے والے بھی ایک ہی ایک صاحبِ کمال ہیں، مگر اسلوب کا یہ امتیاز پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے، البتہ بعض جملے ایسے ہوتے ہیں جو بعینہٖ برقرار رہتے ہیں، بلکہ ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

راحت القلوب کی روایات کو بھی بیان کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا ہے، فوائد الفواد میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جو راحت القلوب سے ماخوذ ہیں، اور اسلوبی امتیاز کے وصف سے مالا مال ہیں، ہونی بھی چاہیے تھیں، کیونکہ وہ روایتیں حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کی مبارک زبان سے سنی اور لکھی تھیں جن کے بعض بعض جملے آپ کو از بر تھے، تاہم اسلوب کا بعینہٖ برقرار رہنا خلافِ فطرت ہے، بعض جملے جو برجستہ اور رواں ہوتے ہیں وہ زبان زد

رہتے ہیں، اور جون کے توں منتقل ہوتے رہتے ہیں، اقدار ہی مشترک اور برقرار رہتے ہیں، وہ دونوں کتابوں میں ہیں، اشعار کا اعادہ بھی ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے، جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، بہر حال ایسی بعض روایتوں کی نشاندہی مناسب ہوگی جو راحت القلوب سے ماخوذ اور فوائد الفواد میں منقول ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) خرقۂ معراج	راحت القلوب	ص ۳	فوائد الفواد ص	۱۹۶	فارسی مطبوعہ نولکشور	
(۲) ترک اوراد	〃	۲۲	〃	۱۰۰	〃	
(۳) ہفت منارہ	〃	۲۴	〃	۱۲۳	〃	
(۴) فضیلت ماہ صیام	〃	۲۹	〃	۲۰۹	〃	
(۵) تحفۂ درود شریف	〃	۳۱-۳۰	〃	۱۰۷	〃	
(۶) عطیۂ ناصری	〃	۳۱	〃	۱۴۵-۹۹	〃	
(۷) مشارق الانوار	〃	۳۲	〃	۱۰۳	〃	
(۸) تذکرۂ شیخ حمویہ	〃	۳۳	〃	۱۲۹	〃	(باقی)

حضرت مسیحؑ کے بعد

نصرانیت کا نیا قالب

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

سرا اقنوم | نصاریٰ کے نزدیک ان کے عقیدۂ تثلیث کا تیسرا اقنوم روح القدس ہے، اسے وہ نوم حیات کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بیٹا (مسیحؑ) باپ (خدا) میں سے عقل کی راہ سے تولد ہوا ہے روح القدس باپ اور بیٹے دونوں میں سے "مرضی کی راہ" سے صادر ہوا ہے، باپ اور بیٹے جو باہم محبت ہے، یہی محبت روح القدس کہلاتی ہے، گویا روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے صفت حیات اور صفت محبت ہے، یعنی اس صفت کے ذریعہ خدا کی ذات (باپ) اپنی نت علم مسیحؑ (بیٹے) سے محبت کرتی ہے، اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے، یہ صفت بھی صفت کلام طرح ایک جوہری وجود رکھتی ہے، اور باپ بیٹے کی طرح قدیم اور ازلی ہے، عیسائیوں کے عقیدہ رو سے حضرت مسیحؑ کو بپتسمہ دیے جانے کے وقت یہی صفت ایک کبوتر کے جسم میں حلول کر کے زت مسیحؑ پر نازل ہوئی تھی۔

پاک نوشتوں میں باپ سے قدرت، بیٹے سے دانائی اور روح القدس سے پاکیزگی منسوب ہے بنا پر تینوں کے کام اس طرح تقسیم کیے گئے ہیں، باپ کا کام قدرت ہے، یعنی وہ دنیا کو پیدا کرنے

تھا ۱۹:۳

اس کی حفاظت کرے بیٹے کا کام روانی ہے، وہ گناہ سے نجات دلوائے، اور کفارہ بنے اور روح القدس کا کام پاکیزگی ہے یعنی انسان کے دل کو ایمان کے لیے تیار کرے اور ایمان لانے کے بعد اس پر قائم رکھے، (مسیحی تعلیم کے جوابات ص ۳۰ و ۲۵)

عقیدۂ تثلیث کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تین اقنوم یا شخصیتوں پر مشتمل ہے: (۱) خدا کی ذات، جو باپ کہلاتی ہے (۲) اس کی صفت علم و کلام جسے بیٹا کہتے ہیں (۳) اس کی صفت حیات و محبت، جسے روح القدس کہا جاتا ہے، ان تینوں میں سے ہر ایک خدا ہے، لیکن یہ تینوں مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں، اسی لیے نصاریٰ تثلیث کو ماننے کے باوجود اپنے کو موحد ہی کہتے ہیں۔ ایک مشہور عیسائی فاضل الفریڈ۔ ای۔ گاروے لکھتے ہیں:

> "یہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی، موحدانہ اور کفارہ پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعہ پختہ کر دیا گیا ہے" (بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مقالہ عیسائیت ج ۳، ص ۵۸۱)

وہ نصرانی مذہب کو مشرکانہ قرار دینے والوں کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

> "عیسائیوں کے عقیدہ کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خطرناک حد تک تین خداؤں کے عقیدے کے قریب آ گیا ہے، لیکن عیسائیت اپنی روح کے اعتبار سے موحد ہے، اور خدا کو ایک کلیسائی عقیدہ کے طور پر سمجھتی ہے" (ایضاً)

اس طرح کی توجیہ اور لوگوں نے بھی کی ہے، مگر اوپر تثلیث کی جو تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اس سے اس کا گورکھ دھندا ہونا پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ ایک کا حقیقۃً تین اور تین کا ایک ہونا یا مرکب کا مفرد اور مفرد کا مرکب ہونا کیسے درست ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خود مسیحی حضرات بھی اس تشریح اور بے جا تاویلات سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے، بلکہ وہ اس عقیدہ کے بارے میں ہمیشہ اضطراب و تردد کی کیفیت میں

تلا ہے، اور بالآخر یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑاتے ہیں کہ تثلیث کا راز اور نکتہ عقل کی فہم سے بالاتر ہے،
حافظ ابن تیمیہؒ ان کی اس توجیہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"جب تثلیث کو عقلاً باطل قرار دیا جاتا ہے تو نصاریٰ منقولات کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ امور و عقائد عقل و قیاس سے ماوراء ہیں، ان میں ایمان و تقلید ہی سے کام لینا چاہیے، اور عقلی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، حالانکہ ان کے یہ گھڑے ہوئے عقائد آسمانی کتابوں سے ثابت ہی نہیں ہیں، جو چیز عقلی اعتبار سے محال اور باطل ہوتی ہے وہ یا تو ناممکن ہوتی ہے یا اس کے ادراک سے عقل قاصر ہوتی ہے اور وہ اس میں منفی و مثبت کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتی، یہی دوسری چیز انبیاء کی تعلیمات و ارشادات میں ملتی ہے، اور پہلی چیز نہیں ملتی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاءؑ کے کلام میں مخالف عقل کوئی چیز نہیں، البتہ ماورائے عقل چیزیں ہیں، اور دونوں میں بڑا فرق ہے"۔

لیکن یہ کہنے سے بھی مسیحی علماء کو چھٹی نہ ملی اور وہ خود اپنے افراد اور گروہوں کو بھی تشفی نہ دے سکے، انھوں نے بڑی بڑی کونسلیں اور اجتماعات کیے، مگر یہ عقدہ حل نہ ہو سکا اور ان کے اندر اس مسئلہ میں برابر اختلافات ہوتے رہے، عیسائی مصنفین نے اپنے ایسے متعدد فرقوں اور اشخاص کا ذکر کیا ہے جو تثلیث کو توحید کے ہم آہنگ قرار دینے کی کوششوں پر بے اطمینانی ظاہر کرتے رہے ہیں، ان کے ایک تھا ابیونی نے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی مگر مارس ریلٹن کے بیان کے مطابق وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے: حضرت مسیح کو خدا مان کر ہم توحید کے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتے، ہم کو تسلیم کرنا ہوگا وہ پورے طور پر خدا نہیں تھے، انھیں خدا کی شبیہ یا اس کے اخلاق کا عکس تو کہا جا سکتا ہے لیکن ویسے کامل خدا نہ تھے جیسے باپ۔

لیکن کلیسا کو یہ توجیہ کب پسند آ سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس فرد کو مطعون ہونا پڑا اور وہ ملحد

الجواب الصحیح ج ۲ ص ۸۹

پڑ گیا۔ اس الزام سے بچنے کے لیے خود اسی فرقے کے بعض صلح پسند اشخاص نے یہ کہا کہ حضرت مسیح کی خدائی کا اس طرح کھلم کھلا انکار مناسب نہیں بلکہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ خدا تھے، البتہ شرک کے الزام سے بچنے کیلیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بالذات خدا نہ تھے بلکہ ان کی خدائی باپ کی عطا کی ہوئی تھی، اس اعتقاد کے ساتھ توحید اس طرح درست ہے کہ بالذات خدا صرف باپ ہے، لیکن تثلیث کا عقیدہ بھی صحیح ہے کیونکہ باپ نے خدائی کے اوصاف بیٹے اور روح القدس کو بھی عطا کر دیے تھے، مگر اس طرح کی تاویل کرنے والے حضرات بھی پادریوں کے نزدیک گمراہ ہی قرار پائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن عیسائی فرقوں اور اشخاص نے تثلیث کی گتھی حل کرنے یا اسے توحید کے مطابق قرار دینے کی کوشش کی، وہ سب ناکام رہے، اور ان میں سے بعض توسرے سے اس عقیدہ ہی سے بیزار ہو کر توحید کے قائل ہو گئے، یہاں عقیدۂ تثلیث کی مختصر سرگذشت بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے حضرت مسیح کو عام طور پر کلام کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا، تاہم بکثرت عیسائی اب بھی ان کی الوہیت کو نہیں مانتے تھے، چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر ایسی سخت بحثیں ہوئیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئیں، تعیین آخر ۳۲۵ء میں نیقیہ کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسئلہ کی حیثیت قرار دے دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب بھی کر دیا گیا[1]، اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک اختلافات ہوتے رہے، لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلہ کو ہوئی ..... اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک ہو گیا ..... ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے مسیح کی ذات کو دو مکمل طبیعتوں کا مجموعہ قرار دیا، ایک الٰہی طبیعت اور دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھتی ہیں"

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)

---

[1] یہ عقیدہ اس مضمون میں پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ تثلیث کا اصل نصرانی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ حضرت مسیحؑ کے بعد وضع و اختراع کیا گیا ہے اور ۳۲۵ء میں نیقیہ کونسل میں بڑے رد و کد اور کافی بحث و تمحیص کے بعد اسے باقاعدہ عقیدہ کی حیثیت حاصل ہو سکی ہے، لیکن کونسل کی منظوری کے بعد بھی انصاف پسند لوگوں کے اندر اس کے بارہ میں خلش موجود رہی، چنانچہ فرقہ اریوسی حضرت مسیحؑ کو مخلوق مانتا تھا، اور اس نے تثلیث و حلول کے رد و ابطال میں نمایاں جد و جہد کی، تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے آغاز میں اس کی قوت بہت بڑھ گئی تھی، مگر نیقیہ کونسل کے فیصلہ کے بعد جب نظریۂ تثلیث عیسائیوں کا عام عقیدہ بن گیا تو اس فرقہ کا اثر بھی کم ہو گیا، عیسائیوں کا ایک اور فرقہ یونی ٹیرین بھی توحید کا قائل تھا، اور تیرہویں صدی کے متعدد مسیحی فرقوں نے تثلیث کو لغو اور باطل عقیدہ قرار دیا ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے ان نصرانی علماء کا ذکر کیا ہے جو توحید اور عبدیت مسیحؑ کے قائل تھے، مگر بوجوہ ان کو مسیحی دنیا میں قبول عام نہ ہو سکا، اس سلسلہ میں انھوں نے نصاریٰ کے بعض فرقوں کے نام بھی گنائے ہیں اور ایک نو مسلم نصرانی حسن بن ایوب کا طویل رسالہ بھی نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے اسلام قبول کرنے کے اسباب اور دین اسلام کی ترجیح کے دلائل تفصیل سے نقل کیے ہیں (ملاحظہ ہو الجواب الصحیح جلد دوم آخر و جلد سوم)۔

یہ شروع ہی میں واضح کیا جا چکا ہے کہ نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد و اعمال حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت اور اصل انجیل کے سراسر منافی ہیں اور تثلیث کا عقیدہ خود نصاریٰ کی اختراع ہے، موجودہ اناجیل گو محرف اور غیر معتبر ہیں لیکن پھر بھی ان میں تثلیث کی تردید موجود ہے اور توحید کی تعلیم ان سے یکسر محو نہیں ہو سکی ہے اس کے ثبوت میں اناجیل کے بکثرت حوالے بھی نقل کیے جا چکے ہیں، یہاں اس امر کی جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ متی کی انجیل کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے:

"یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ"

آگے اسی باب میں یہ بھی درج ہے:

یعقوب سے یوسف پیدا ہوا اور یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے۔"

قابل غور یہ ہے کہ جس کا نسب نامہ یہ ہو اور جو پیدا ہوا اور جنا گیا ہے وہ قدیم اور غیر مخلوق کیونکر ہو سکتا ہے اس کے بعد بھی عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ انجیل کو مانتے ہیں، کیسے صحیح ہو سکتا ہے، اگر واقعی وہ انجیل کو مانتے تو حضرت مسیحؑ کو خدا تو نہ کہتے۔

حلول نصاریٰ کے شرک کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیم کو نظر انداز کرکے ان کے حلول و تجسیم کے قائل ہو گئے تھے سب سے پہلے یوحنا کی انجیل میں تحریف کرکے یہ عقیدہ شامل کیا گیا تھا ملاحظہ ہو:

"ابتداء میں (مسیح) کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا، اور کلام خدا تھا، یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔" (یوحنا ۱: ۱و ۲)

نیز:

"اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور راستی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔" (یوحنا ۱: ۱۴)

نصاریٰ کے نزدیک کلام دوسرے اقنوم ابن سے عبارت ہے جو مستقل خدا ہے اس لیے یوحنا کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفت کلام مجسم ہو کر حضرت مسیحؑ کی صورت میں آگئی تھی یعنی مسیحؑ خدا کا کلام تھے، یہی کلام مسیحؑ کے جسم سے متحد ہو گیا، اس طرح لاہوت نے ناسوت کا جامہ پہن لیا، مارس ملیٹن اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیتھولک عقیدے کی رو سے وہ ذات جو خدا تھی خدائی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی، یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کرلیں جو زمان و مکان کی قیود میں مقید ہے، اور ایک مدت تک ہمارے درمیان مقیم رہی۔"[۱]

---

[۱] بحوالہ مقدمہ اظہار الحق ص ۵۱۔

بیٹے کے اقنوم کو یسوع مسیحؑ کے انسانی وجود کے ساتھ متحد کرنے والی قوت عیسائیوں کے نزدیک روح القدس تھی، جس سے مقصود خدا کی صفت محبت ہے، اس لیے اس عقیدہ کا حاصل یہ نکلا کہ چونکہ خدا کو اپنے بندوں سے محبت تھی، اس لیے اس نے اپنی صفت محبت کے ذریعہ اقنوم ابن کو دنیا میں بھیجا تھا تاکہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔

بیٹے کے حضرت مسیحؑ میں حلول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹا خدائی چھوڑ کر انسان بن گیا، بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ پہلے صرف خدا تھا، اب انسان بھی ہو گیا، لہٰذا حضرت مسیحؑ بیک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی، الفریڈ۔ ای۔ گارڈ لکھتا ہے:

"حضرت مسیحؑ حقیقۃً خدا بھی تھے اور انسان بھی، ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے .... منظور شدہ فارمولا یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ایک شخصیت میں دو ماہیتیں جمع ہو گئی تھیں"[1]

حضرت مسیحؑ بحیثیت انسان خدا سے کمتر تھے، لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ ہی کے برابر ہیں، اگسٹائن لکھتا ہے:

"خدائی حیثیت سے انہوں نے انسان کو پیدا کیا، اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیے گئے"[2]

تثلیث ہی کی طرح عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی ہمیشہ معمہ بنا رہا کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی شخص خدا بھی ہو اور انسان بھی، خالق بھی ہو اور مخلوق بھی، ازلی و افضل بھی ہو اور فانی و اسفل بھی، چنانچہ تثلیث کی طرح اس عقیدہ پر بھی بڑی بحث و تمحیص ہوتی رہی اور کوئی اس کو نہ تو خود اس پر مطمئن ہو سکے اور نہ دوسروں کو مطمئن کر سکے، عام طور سے اسے عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، اسی لیے رومن کیتھولک چرچ نے اس کو ثابت کرنے کے لیے کثرت سے خدا کی جابر قدرت سے استدلال کیا ہے، حالانکہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ محال چیزوں

[1] [illegible] ص [illegible] ج [illegible]

عقیدہ سے یکسر پاک تھی۔

عقیدۂ حلول کو عقل اور انسانی سمجھ سے قریب کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ سب عجیب و غریب اور بالکل ہی ناقابل فہم ہیں، اس لیے ہم ان کو نظر انداز کر کے صرف ان تعبیروں اور تشریحوں کو نقل کرتے ہیں جو نصاریٰ کے مختلف گروہوں اور جماعتوں نے عقیدۂ حلول کی پیش کی ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ خود نصاریٰ بھی اپنے اس عقیدہ کی بنا پر کس قدر خلش و اضطراب میں مبتلا رہے۔

نصاریٰ کی ایک جماعت کے نزدیک حضرت مسیح کو خدا ماننا صحیح نہیں، وہ صرف انسان تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیح کے وجود میں خدا کے حلول کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو خدا کی جانب سے ایک خاص عقل و دانائی بخشی گئی تھی۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان میں خدا کی صفت علم حلول کر گئی تھی، لیکن اس کی وجہ سے ان کو خدا، خالق، قدیم اور ازلی کہنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ حلول کے باوجود خدا بدستور خالق اور حضرت مسیح بدستور مخلوق رہے۔

چوتھی صدی عیسوی میں آریوس نے اپنے وقت کے کلیسا کے خلاف بڑی زبردست مہم چلائی، اس نے یہ کہہ کر عیسائی دنیا میں ہل چل مچا دی تھی کہ خدا قدیم، ازلی اور وحدہٗ لاشریک ہے، اسی نے بیٹے کو پیدا کیا، وہ پہلے معدوم تھا، اس لیے بیٹا نہ ازلی ہے اور نہ خدا، ہمیشہ سے صرف باپ ہے، کیونکہ ایک ایسا وقت بھی تھا جس میں بیٹا موجود نہیں تھا، وہ باپ سے الگ ایک مستقل حقیقت رکھتا ہے اور اس پر حوادث و تغیرات واقع ہو سکتے ہیں، وہ حقیقۃً خدا نہیں ہے، البتہ اس میں مکمل ہونے کی صلاحیت ہے، اور وہ ایک مکمل مخلوق نیز ایک عقل مجسم ہے جو ایک حقیقی انسانی جسم میں پائی جاتی ہے، گو آریوس کے نظریات مقبول ہوئے مگر نیقیہ کونسل میں ان کی پر زور تردید کی گئی اور وہ جلا وطن کر دیا گیا۔

پانچویں صدی میں پولسی فرقے نے حضرت مسیح کو خدا کے بجائے فرشتہ قرار دیا جو دنیا میں لوگوں کی

اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور حضرت مریمؑ کے بطن سے انسان کی شکل وصورت میں پیدا کیے گئے تھے، چونکہ خدا نے انھیں اپنا مخصوص جلال عطا کیا تھا اس لیے وہ خدا کے بیٹے کہلائے، لیکن نظریہ مقبول نہیں ہو سکا۔

نسطوری فرقہ کہتا ہے کہ عقیدۂ حلول پر اس لیے اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو ایک شخصیت قرار دے کر ان کے لیے دو حقیقتیں ثابت کی گئی ہیں ایک انسانی اور ایک خدائی، اس کا حل یہ ہے کہ گو حضرت مسیحؑ کا خدا ہونا بھی درست ہے اور انسان ہونا بھی بجا ہے، لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ ان کی ایک شخصیت کے اندر یہ دونوں حقیقتیں جمع ہو گئی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ دو شخصیتوں کے جامع تھے، ایک بیٹا اور ایک مسیح، ایک ابن اللہ اور ایک ابن آدم، بیٹا خالص خدا ہے اور مسیح خالص انسان۔

نسطوریوں کی یہ تعبیر رومن کیتھولک چرچ کی اس تعبیر کے خلاف ہے جو حضرت مسیحؑ کو ایک شخصیت اور دو حقیقتیں مانتی ہے، ۴۳۱ء میں افسس میں سارے کلیساؤں کی ایک کونسل نے اس نقطۂ نظر کو باطل قرار دے کر نسطوریوں کو قید اور جلاوطنی کی سزا دی اور اس کے متبعین کو بدعتی قرار دیا، مگر یہ فرقہ اب تک موجود ہے۔

چھٹی صدی میں یعقوبی فرقہ کا ظہور ہوا، اس کے بانی یعقوب نے کہا کہ حضرت مسیحؑ کی ایک ہی شخصیت تھی اور ان میں حقیقت بھی صرف ایک ہی پائی جاتی تھی اور وہ تھی خدائی، وہ صرف خدا تھے اور انسان کی شکل میں نظر آتے تھے، رجعت پسند طبقہ نے اس توجیہ کو بدعت قرار دیا، لیکن ساتویں صدی تک اس عقیدہ کا بڑا چرچا رہا اور اب بھی اس فرقہ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ گو حضرت مسیحؑ کی ایک ہی شخصیت میں خدائی اور انسانیت دونوں حقیقتیں جمع تھیں تاہم وہ خدائی انسانیت تھی، آدمیوں کی انسانیت نہ تھی، اس سلسلہ

اس کی ذات میں ان دونوں کے بیک وقت پائے جانے میں کوئی اشکال نہیں[1]۔

غرض جتنے متضاد تخیلات تھیں لیکن اسکے باوجود دستور قیاس اور مطابق عقل کہنا محال ہے، یہی وجہ ہے کہ تثلیث کی طرح حلول کا عقیدہ بھی ہمیشہ الجھا اور پیچیدہ بنا رہا، اور بالآخر یہ کہکر دونوں کو چپ کرنے کی کوشش کی گئی کہ عقیدۂ حلول ایک سربستہ راز ہے اسے ماننا ضروری ہے، مگر سمجھنا ممکن نہیں۔

قرآن مجید اور عقیدۂ تثلیث وحلول | قرآن مجید نے تثلیث وحلول کے نصرانی عقائد کو صریح شرک وکفر قرار دے کر ان کی مدلل تردید کی ہے، اس کی کئی سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے، سورۂ آل عمران کے اصل مخاطب نصاریٰ ہیں اور اس کا بنیادی مضمون اسلام ہے، جس کی حقیقت نصاریٰ نے مسخ اور گڈمڈ کر دی تھی، نیز انھوں نے اسلام کو تثلیث اور حلول کے ناقابل فہم عقیدوں میں گم کر دیا تھا، اور اس کے اندر اپنی طبیعت سے نئی نئی باتیں شامل کر دی تھیں، سورۂ آل عمران میں اسلام کی اصل حقیقت کو واضح کرنے کے علاوہ نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد، بدعات اور دین میں ان کے اضافوں کی تردید کی گئی ہے حضرت مسیحؑ کے ذکر کی تقریب وتمہید کے لیے پہلے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آل ابراہیم اور آل عمران کا ذکر ہوا ہے، جن کو خدا نے دنیا کی ہدایت وامامت کے لیے مامور کیا تھا، اس سلسلہ میں آل عمران کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ حضرت مریمؑ اسی مبارک خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں، اور انبیاء کا شجرہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مریمؑ اور مسیحؑ کی عظمت وبزرگی اس سلسلۂ رشد وہدایت سے جڑی ہوئی ہے جو اللہ نے دنیا کے لیے جاری کیا تھا اور یہ دونوں مافوق البشر نہ تھے بلکہ اللہ کے دوسرے منتخب اور برگزیدہ بندوں کی طرح یہ بھی اللہ کے برگزیدہ بندے تھے، انھوں نے خود بھی اللہ کی اطاعت وبندگی کی اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دی، ایسی صورت میں خدا کے ان بندوں کو معبود اور الٰہ بنانا

---

[1] الملل والنحل جلد دوم والشہرستانی کے شروعات کی دونوں جلدوں کے مختلف حصوں میں یہ تفصیلات موجود ہیں۔

سی طرح بھی روا اور مناسب نہیں ہے۔

قرآن کے نزدیک حضرت مسیحؑ کو الٰہ یا خدا کا بیٹا بنانا نصاریٰ کی اپنی ایجاد و اختراع ہے، س کے لیے ان کے پاس کوئی سند اور ثبوت نہیں، فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَ	اور یہود نے کہا عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور
قَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ	نصاریٰ نے کہا مسیح خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کے
ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ	منہ کی باتیں ہیں، ان سے پہلے کے کافروں کی
قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ	طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، یہ انہیں کی ریس
اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ.	کرنے لگے ہیں، خدا ان کو ہلاک کرے، یہ کہاں
(توبہ: ۳۰)	پھیرے جا رہے ہیں۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہنا نہایت لغو اور بے معنی ت ہے، جو کافروں کی باتوں سے ملتی جلتی ہوئی ہے، خدا نے ہرگز ایسی بات نہیں کہی ہے بلکہ یہ خود نصاریٰ کی پھیلایا اور بدعت ہے وہ اس کی کتاب سے اس کی کوئی سند نہیں پیش کر سکتے، دوسری آیت میں صاف صراحت سے اس شرک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ	بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے
الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ	کہا کہ خدا تو مسیح ابن مریم ہے، حالانکہ
يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي	خود مسیح کا قول یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل
وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ	اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور
فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ	تمہارا بھی رب ہے، جو کوئی اللہ کا شریک
وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ	ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام

مِنْ أَنْصَارٍ، لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا إِلٰهٌ وَاحِدٌ ...... مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ۔ (مائدہ: ۷۲-۷۵)

کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنھوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے، حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود ... مسیح بن مریم تو بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذرے ہیں، اور اُن کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔

ان آیتوں میں حلول و تثلیث دونوں کو کفر قرار دے کر ان کی تردید کے لیے خود حضرت مسیحؑ کا قول نقل کیا ہے کہ میرے اور اپنے خداوند کی عبادت کرو، اس سے ظاہر ہوا کہ وہ خود الٰہ و معبود نہ تھے ان کو جو کچھ عظمت و بزرگی حاصل ہوئی تھی وہ محض رسول ہونے کی بنا پر ہوئی تھی، پھر حضرت مسیحؑ کی عدم الوہیت اور بشریت ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ وہ اور ان کی والدہ ماجدہ کھانا کھاتی تھیں، کیونکہ کھانا کھانا بشریت کی واضح دلیل ہے، جس طرح ہر آدمی اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے دانہ پانی کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح یہ دونوں ماں بیٹے بھی ان کے محتاج تھے، ایسی صورت میں بھلا وہ معبود کس طرح ہو سکتے تھے۔

اسی سورۃ میں یہ آیت بھی ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ ...

بیشک وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح ابن مریم ہی ہے، آپ پوچھیے [illegible] کیا [illegible] ہو

مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ	وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم کو
يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ	اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا	اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی
بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ	بادشاہی، وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے
عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ: ۱۷)	اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں الوہیتِ مسیحؑ کو باطل کرنے کے لیے ان کی بے بسی اور اپنے اختیار کل کا ذکر کیا ہے، حضرت مسیحؑ کی الوہیت کی سب سے بڑی اور اہم وجہ ان کی خارق عادت پیدائش کو سمجھا جاتا ہے، اسی کی تردید کے لیے خدا نے اپنی پادشاہی اور ہر چیز پر قدرت کی صراحت کی ہے، اسی بنا پر بعض آیتوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی مثال حضرت آدمؑ سے دے کر بھی الوہیتِ مسیحؑ کے عقیدہ کو باطل قرار دیا گیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ	عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے،
اٰدَمَ ۭخَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ	اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (آل عمران ۵۹)	تو وہ ہو گیا۔

جس طرح حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے اور اللہ کے کلمہ کُن سے ان کا وجود ہوا تھا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کلمہ کُن سے ہوئی تھی، اگر باپ کے بغیر پیدا ہونا الوہیتِ مسیحؑ کی دلیل ہے تو حضرت آدمؑ تو بدرجہ اولیٰ الٰہ بنائے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ اس کی پیدائش باپ اور ماں دونوں ہی کے بغیر ہو گئی تھی۔

قرآن مجید میں بعض جگہ حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ ہی حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے

آیا ہے کہ اگر عام طریقہ کے برخلاف کسی کا پیدا ہونا الوہیت کا ثبوت ہے تو حضرت یحییٰؑ کی ولادت بھی غیر عادی طریقہ پر ہوئی تھی کیونکہ وہ حضرت زکریاؑ کی پیری اور ان کی بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود اللہ کی مشیت سے پیدا ہو گئے تھے، اس لیے اگر حضرت یحییٰؑ کو ان کی خارق عادت ولادت کے باوجود اللہ نہیں مانا جاتا تو حضرت مسیحؑ کو کیوں اللہ مانا جائے۔

قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا ذکر ایک معجزہ کی حیثیت سے کیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ
انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا
فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ
إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ
تَقِيًّا قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ
لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا قَالَتْ
أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي
بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا. قَالَ كَذٰلِكِ
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ
آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا
مَقْضِيًّا فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ
مَكَانًا قَصِيًّا.

اور اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو جب
وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرق کی طرف
چلی گئیں تو انھوں نے ان کی طرف سے پردہ
کر لیا، اس وقت ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ
بھیجا تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی (کی
شکل میں) بن گیا، مریمؑ بولیں کہ اگر تم پرہیزگار
ہو تو میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں، انھوں نے
کہا کہ میں تو تمھارے پروردگار کا بھیجا ہوا
(یعنی فرشتہ) ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ
تمھیں پاکیزہ لڑکا بخشوں، مریمؑ نے کہا کہ میرے
ہاں لڑکا کیونکر ہوگا؟ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں
اور میں بدکار بھی نہیں ہوں (فرشتے نے) کہا کہ
یونہی ہوگا، تمھارے خداوند نے فرمایا کہ یہ مجھے
آسان ہے اور (اس طرح پیدا کریں گے کہ)

اسے لوگوں کے لیے اپنی طرف سے نشان بنائیں

اور ذریعۂ رحمت بھی، اور یہ کام طے شدہ ہے"

تو وہ اس بچہ کے ساتھ حاملہ ہو گئیں اور اسے

لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں۔ (مریم: ۱۶ - ۲۲)

پھر اس کے بعد ولادت اور گہوارہ کے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن سب سے ظاہر ہوتا ہے
حضرت مسیحؑ خدا کی ایک مجسم نشانی تھے، اور ان کی پیدائش ہی نہیں بلکہ ان کا سراپا وجود خدا کا معجزہ تھا
۔ اس طرح کے معجزات کا صدور اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، اصل چیز اس کا حکم اور فیصلہ ہے ہر چیز
اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ہو جانے کا حکم دیتا ہے،
اور وہ ہو جاتا ہے، حضرت آدمؑ و حوّا اور تمام فرشتے بھی اسی طرح بلا ماں باپ کے خدا کے فیصلہ کے
مطابق پیدا ہوئے تھے، اس بنا پر حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا، اس کا مظہر یا اوتار نہیں مانا جا سکتا۔

قرآن کے مقابلہ میں انجیل کا حال یہ ہے کہ مرقس اور یوحنا نے تو اس عظیم الشان واقعہ کا سرے
سے ذکر ہی نہیں کیا ہے، البتہ متی اور لوقا نے اس کا ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو متی ۱: ۱۸ - ۲۱، لوقا ۱: ۲۶
- ۳۵) ان دونوں کے بیان میں اولاً تو تضاد ہے، ثانیاً انھوں نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے
اس عظیم الشان واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے جس سے وہ ایک دیومالائی قصہ اور افسانہ معلوم
ہوتا ہے، آگے بتایا جائے گا کہ نصاریٰ کا مذہب رومی و یونانی بت پرستوں کی نقالی و تقلید کے علاوہ
ان کے توہمات پر مبنی ہے حضرت مسیحؑ کی ولادت کے واقعہ میں بھی ان ہی قوموں کے توہم پرستانہ
خیالات شامل کر لیے گئے ہیں، کیونکہ ان کے یہاں بھی متعدد بزرگوں کی ولادت کے سلسلہ میں اسی طرح کی
توہم پرستانہ روایات مشہور ہیں، جن کو نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ پر بھی چسپاں کر دینے کی کوشش کی ہے
دیکھیے [illegible]

جب ایران پر آخری حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر جوپیٹر امن دیوتا کے مندر کی یاترا کو روانہ ہوا، جو دو سو میل کے فاصلہ پر صحرائے لیبیا کے ایک نخلستان سیوا مرغزار میں واقع تھا۔ مندر کے غیب داں کاہن نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ تم اسی ہیکل دیوتا کی اولاد ہو جو سانپ کی شکل اختیار کرکے تمہاری ماں اولمپیاس کو اپنے تصرف میں لایا تھا۔ یہ خیال کہ بے باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور یہ نتیجہ دیوتاؤں اور ان عورتوں کی مواصلت سے مترتب ہوتا ہے جو ان کی منظورِ نظر ہوں، اس زمانہ میں اس قدر عام تھا کہ جو شخص اپنے اقران و اماثل میں غیر معمولی طور پر نمایاں اور سربرآوردہ ہوتا تھا، آسمانی نسل سے سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے خیالات صدہا سال تک لوگوں میں پھیلے رہے، چنانچہ روما الکبریٰ کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک کنواری لڑکی رہی سلویا نامی گھڑا لیے ہوئے پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر جا رہی تھی کہ مارس دیوتا کی اس پر نظر پڑ گئی، دیوتا اس دوشیزہ پر عاشق ہو گیا، اور اس تعشق کا نتیجہ رومیولس ہوا جس نے شہر روما کی بنا ڈالی۔ اگر کوئی شخص اس روایت کے صحیح ہونے میں شک لاتا تو روما والے اس کی کیا گت بناتے۔ خود افلاطون کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس کی ماں پیری کیٹونی کنواری تھی، جسے اپالو دیوتا سے حمل رہ گیا تھا اور دیوتا نے ارسٹان کو جس کے ساتھ پیری کیٹونی کی نسبت ٹھہری تھی افلاطون کے آسمانی نسب کا حال بتا دیا تھا۔ بانی فلسفۂ اشراقیہ کے معتقد تلامذہ کے سامنے اگر کوئی شخص اس کی ابوت کے سماوی الاصل ہونے کے متعلق شبہ ظاہر کرتا تو ان کی برہمی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ شاہ اسکندر بن جوپیٹر امن کے القاب کے ساتھ جب سکندر کے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے تو شام اور مصر کے باشندے انھیں اس انتہائے تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا آج کل صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے، لیکن تیز خیال یونانی اس آسمانی نسبت کی اصل قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھے، اولمپیاس جس سے زیادہ روشنی اس معاملہ پر اور کوئی نہ ڈال سکتا تھا اکثر یہ کہا کرتی تھی کہ بہتر ہو اگر اسکندر مجھے اس فضیلت سے معاف رکھے تاکہ جوپیٹر کی بی بی کے ہوتے ہوئے

رتھا اور طیش و غضب سے تھکے رہتے۔

چودھری نواب علی نے ان واقعات کو ذکر کرنے کے بعد مہابھارت سے بھی اسی طرح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

"ایک راجہ کی کنواری لڑکی کو رشیوں نے اس کے حسنِ خدمات کے عوض چند ایسے منتر سکھا دیئے تھے جن کو پڑھ کر وہ جس آسمانی دیوتا کو چاہے بلا سکتی تھی۔ ایک دن اس لڑکی نے آزمانے کی غرض سے سورج دیوتا کیلئے منتر پڑھا، فوراً دیوتا ایک جوان خوبرو کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے موجود ہوا اور کہنے لگا "مجھے کیوں تکلیف دی ہے؟" لڑکی نے کہا "میں نے تو محض آزمائش کے طور پر منتر پڑھا تھا" دیوتا نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا، اب میں آیا ہوں تو اپنی ایک یادگار بھی چھوڑتا جاؤں" لڑکی جھجکی اور کہنے لگی کہ دنیا میں بدنام ہو جاؤں گی، دیوتا نے جواب دیا "نا زنین! تو دوشیزہ کی دوشیزہ رہے گی، اس حمل کے رہ جانے سے تیری بکارت زائل نہ ہونے پائیگی۔"

غرض کہ اس طرح سے کرن پیدا ہوا۔ یہ وہی مشہور سورما کرن ہے جو مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں کی طرف سے لڑا اور آخر میں ارجن کے ہاتھ سے مارا گیا، اور یہ لڑکی پانچوں پانڈوؤں کی ماں کنتی ہے۔

تاریخ حبیب السیر میں خاقانِ مغل کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک خان کی اہلیہ دختر آلانقوا ایک رات اپنے خیمہ میں سو رہی تھی ناگاہ روزنِ خیمہ سے ایک روشنی داخل ہوئی اور اس کے ذہن میں نفوذ کر گئی جس سے وہ فوراً حاملہ ہو گئی، چنگیز اور تیمور کے اجداد اسی نورانی حمل کی یادگار ہیں۔ نعوذ باللہ من ہفواتہم۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصاریٰ نے بھی ان اقوام کی طرح حضرت مسیح کی فوق العادت ولادت کو رنگ دے کر انہیں خدا اور مظہرِ خدا کہنا شروع کیا ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ نصرانیت کے عقیدہ تثلیث، حلول، اتحاد، تجسیم کے عناصر کا وجود ...

[illegible]

دوسری قوموں میں بھی پائے جاتے رہے ہیں، پیروان مسیحؑ ان [illegible] تقلید میں تثلیث اور حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے گمراہ کن عقیدے میں پڑ گئے تھے، مصر کے ایک قبطی الاصل عالم و محقق بیومی مرجان نے ایک کتاب "اللہ واحد ام ثالوث" (اللہ ایک ہے یا تین کا مجموعہ مرکب) کے نام سے لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"بت پرست مذاہب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثالث مقدس کا عقیدہ ان سب کے اصول وعقائد کا ایک اہم جزو رہا ہے، ان کو قدیم مصری، ہندو اور دوسری بہت سی بت پرست قومیں مانتی رہی ہیں۔"[1]

ہندوؤں کے یہاں اوتار کا عقیدہ حضرت مسیحؑ سے صدیوں قبل سے چلا آرہا ہے۔ اور بعض مصنفین نے ہندوؤں کی تثلیث اور نصاریٰ کی تثلیث کی مشابہت ومماثلت کا ذکر کیا ہے، ہندو برہما وشنو (بشن) اور مہیش کو ایک الٰہ کے تین رخ سمجھتے تھے اور برہما کو ایسا وجود مانتے تھے جو تین اقانیم کا مجموعہ تھا، اہل مصر بھی قدیم زمانے سے متعدد معبودوں کے قائل رہے ہیں، اسکندریہ جس زمانہ میں مصریوں کا دینی مرکز تھا اسی زمانہ میں بطلیموس اول نے ایک بڑا معبد تعمیر کرایا تھا، اس میں ثالوث کی پرستش کی جاتی تھی، یہ تین معبودوں کا مجموعہ تھا، اور لوگ ان تینوں کو الگ الگ رب ماننے کے بجائے ایک الٰہ کے تین رخ سمجھتے تھے[2]۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم لکھتے ہیں:

"مصری شرک یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، یونان کے بڑے سے بڑے فلسفی اسکندریہ کے مرکز علمیت و روشن خیالی سے مرعوب ومتاثر تھے، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم جب شروع میں پھیلی تو انہی یونانیوں اور یہود شناس (فائلو[3]) پہلے ہی سے یونانیوں کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے اور ان سے (Logos) وغیرہ کے معتقد اور ذکر کر چکے تھے، مسیحیوں نے [illegible]

[1] اللہ واحد ام ثالوث، کویت [2] ایضاً [3] ایک یہودی فلسفی کا نام ہے جو حضرت مسیحؑ کا معاصر تھا۔

پولس (سینٹ پال) نے تو حضرت مسیحؑ کے مذہب اور تعلیم کو تمام تر مسخ کر کے اسے یونانی شرک کی ایک شاخ بنا دیا۔ آخر میں رہی سہی کسر ردمیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی۔ موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری، یونانی اور رومی شرک ہی کا ایک مخلوطہ ہیں..... اللہ کے بھیجے ہوؤں کو اس کے نبیوں اور رسولوں کو خود معبود سمجھ بیٹھنے کا مرض مشرک قوموں میں عام رہا ہے، مسیحیوں نے بھی مصری، یونانی، رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیغمبر برحق کو بھی مظہر خدا یا فرزند خدا کا درجہ دے دیا تھا..... ثنویت، تثلیث اور شرک مطلق کے عقیدے بہت قدیم ہی نہیں بلکہ یونان، ایران، مصر، ہند، عراق، چین وغیرہ دنیا کے اکثر ملکوں میں شایع رہ چکے ہیں۔"

(تفسیر ماجدی ج ٢، ص ٢٩٧ و ١٧٣)

قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصاریٰ دوسری قوموں سے متاثر ہو کر شرک کی خباثت میں [ملو]ث ہوئے تھے، ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا	اے پیغمبر! کہہ دو کہ اے اہل کتاب اپنے
فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا	دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی
أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ	بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے
وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ	گمراہ ہوئے، اور جنھوں نے بہتوں کو گمراہ
السَّبِيلِ۔ (المائدہ: ٧٧)	کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔

اس آیت کے اصل مخاطب نصاریٰ ہیں، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی اور بد عقیدگی [گمر]اہ اور بت پرست قوموں کی نقالی اور تقلید کا نتیجہ تھی، انھوں نے نصرانیت میں بت پرست قوموں کے [ش]رک و کفر لے کر شامل کر دیا تھا۔

[عقیدۂ] روح القدس اور سیدنا [مسیح] | اوپر جو قرآنی آیتیں نقل کی گئی ہیں ان میں نصاریٰ کے عقیدۂ حلول و تثلیث اور

الوہیت مسیح کا ذکر تھا، مندرجۂ ذیل آیت میں ان کے ایک اور شرک کی صراحت کی گئی ہے :

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ.

(توبہ : ۳۱)

انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا رب بنا لیا، حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک ہے.

علماء و مشائخ کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا تھا اگر انھیں دینی پیشوا حرام قرار دے دیتے تھے تو نصاریٰ بھی انھیں حرام سمجھنے لگتے تھے، اسی طرح جو چیزیں خدا نے حرام کی تھیں انھیں علماء و مشائخ کے حلال کر دینے کی وجہ سے حلال خیال کرنے لگتے تھے، قرآن نے ان کے اس طرز عمل کو بھی شرک قرار دیا، اس آیت پر مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے جو نوٹ تحریر فرمایا ہے وہ قابل مطالعہ ہے، لکھتے ہیں :

"اس آیت میں اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہود و نصاریٰ کی تمام فکری و عملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی یعنی انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو پروردگار بنا لیا ہے، پروردگار بنا لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انھیں رب السموات والارض کہتے ہیں، کیونکہ اس طرح تو کبھی کسی نے کسی کو رب نہیں بنایا، مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے فقیہوں کو اور عیسائیوں نے اپنے پوپ اور ان کے مقرر کیے ہوئے پادریوں کو دین کے بارے میں جو منصب دے دیا ہے اور وہ اپنے زاہدوں اور درویشوں کی نسبت جیسا کچھ اعتقاد رکھتے ہیں وہ فی الحقیقت انھیں مثل پروردگار کے بنا دینا ہے۔

چنانچہ خود پیغمبر اسلام نے اس کا یہی مطلب قرار دیا، عدی بن حاتم نے پوچھا جیسا اللہ تعالیٰ کہتا ہے

آنحضرتؐ نے جب یہ آیت کی یہ آیت پڑھی تو میں نے عرض کیا: ہم انہیں پوجتے تو نہیں! آپ نے فرمایا: کیا یہ نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرا دیتے ہیں تم حرام کر لیتے ہو اور جس بات کو حلال کر دیتے ہیں حلال مان لیتے ہو؟ عرض کیا: ہاں! فرمایا: یہی ان کو رب بنانا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی پیشواؤں کو تشریع دین کا حق دے دینا کہ وہ جو کچھ اپنی خواہش اور رائے سے ٹھہرا دیں اس کی بے چون و چرا تقلید و اطاعت کرنی چاہیے، قرآن کے نزدیک انہیں رب بنا لینا ہے، کیونکہ اس بات کا حق اللہ سوا اللہ کی وحی کے بتلانے کے سوا اور کسی کو نہیں، پس جب دوسروں کو بھی یہ حق دے دیا گیا تو گویا وہ خدائی میں شریک کر لیے گئے۔" (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۳۳)

جب علماء و مشائخ اور راہبوں اور درویشوں کو یہ کلی اختیار اور کھلی چھوٹ دے دی گئی کہ وہ خدا کی کتابوں اور اس کے احکام و شرائع میں جو اور جس طرح کا بھی چاہیں رد و بدل کر دیں یہاں تک کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں تو اس کا لازمی نتیجہ نکلا کہ نصاریٰ کا دین بازیچۂ اطفال بن گیا، اور وہ حلول و تثلیث جیسے گمراہ کن مشرکانہ عقائد کا مجموعہ بن گیا، حافظ ابن تیمیہؒ نے جا بجا نصاریٰ کی اس کھلی ہوئی گمراہی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"نصاریٰ نے اپنے اکابر کے لیے یہ بات جائز قرار دے دی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت و قانون کو اپنی رائے سے منسوخ اور تبدیل کر دیں، حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے علماء و فقہاء ان کے لیے عقائد و شرائع وضع کرتے تھے، شہنشاہ قسطنطین کے زمانہ میں مسیحی کونسل نے متفقہ طور پر جو کچھ اختیار کیا گیا تھا، اریوس وغیرہ نے ان فیصلوں کی مخالفت کی لیکن وہ مردود قرار دے دیے گئے، حالانکہ ان کا قول [illegible] تھیں وہ منصوص کتاب الٰہی بلکہ نقل مسیحؑ کے بھی سراسر خلاف تھیں۔

نصاریٰ کے مجموعہ دینی احکام و قواعد کا بعض حصہ تو انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے اور بعض حضرت مسیحؑ کے حواریوں کے ارشادات ہیں، مگر اکثر چیزیں ان کے علماء و مشائخ کی

مخالف اور بدشکل ہیں اور وہ انبیاء کی تعلیم و شریعت کے سراسر خلاف ہیں۔ اس طرح ان کا دین بھی یہودیوں کے دین کی طرح حق و باطل کا مجموعہ ہے[1] ..... نصاریٰ اپنے اکابر و مشائخ کے لئے یہ روا سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی اس شریعت میں ترمیم و تنسیخ کر دیں جس کو دے کر اس نے اپنے رسول کو بھیجا تھا، چنانچہ یہ مشائخ ان چیزوں کو حلال کر دیتے ہیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا تھا جیسے انھوں نے سود اور دوسری ناپاک چیزوں کو حلال کر دیا، نیز ان کے نزدیک خبائث سرے سے حرام ہی نہیں ہیں، اسی طرح خدا نے جن چیزوں کو حلال کیا تھا، انھیں حرام کر دیتے تھے، جیسے رہبانیت کو انھوں نے خود گھڑ لیا تھا اور خدا کی حلال کردہ طیبات کو حرام بنا دیا تھا، علاوہ ازیں لازمی اور ضروری چیزوں کو خدا کی شریعت سے خارج اور ساقط کر دیا تھا، جیسے ختنہ، غسل، طہارت اور نجاست وغیرہ کے ضروری احکام کو دین سے ساقط کر دیا تھا اور جن چیزوں کو خود خدا نے ساقط کیا تھا، انھیں اپنے لیے لازمی اور ضروری کر لیا، اس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے اوپر ایسے احکام و قوانین تھوپ لیے جن کو اللہ اور اس کے نبیوں نے ضروری نہیں کیا تھا[2]۔

ان مشرکانہ عقائد کی بنا پر نصاریٰ کے مذہب میں مختلف قسم کی رسمیں اور ضعیف الاعتقادی وغیرہ شامل ہو گئی تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

" مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے، وہ ان کے لیے باعث ننگ ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اہل روم بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل مصر کو قابو میں کرنے کے لیے کی گئی جس سے حضرت مسیحؑ کی "توحید" کی تعلیم ہمیشہ کیلئے ان کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر شے

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ج۱ ص ۱۱۸ و ۱۱۹ [2] ایضاً ج۲ ص ۱۰۰

پادریوں سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی ملک شام میں جو جسے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقدان کو سجدے کرتے تھے، مسیحؑ و مریمؑ، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بناکر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانۂ ابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔" (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۳۲۵، بحوالہ سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ ۳۶۔۳۵)

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نصاریٰ کی تاریخ دین میں نئے اضافوں اور بدعتوں سے بھری ہوئی ہے، گذشتہ عقائد و احکام سے انحراف کر کے ان میں حذف و اضافہ اور اصلاح و ترمیم کرنا ان کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا، شروع ہی سے ان کے بنیادی عقائد میں کتر بیونت ہوتی رہی ہے، اور احکام و قوانین میں تبدیل و تنسیخ کا عمل بھی مستقل جاری رہا ہے، کل تک جو چیز حرام تھی آج اسے جائز کر لیا گیا اور کل جو جائز تھا، آج وہی ناجائز ہو گیا، ابتدا میں تثلیث اقانیم کا تصور ایجاد ہوا، آگے چل کر حضرت مریمؑ کو بھی چوتھے اقنوم کی حیثیت حاصل ہو گئی، پھر ان کے رفع جسمانی کا عقیدہ بھی وضع کر لیا گیا اور اس کو ماننا بھی نجات کے لیے ضروری قرار دیا گیا، اس طرح جن عقائد کو وہ اس وقت مان رہے ہیں اور جن احکام و عبادات پر عمل پیرا ہیں ان میں یہ امتیاز کرنا اور پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ کون سی چیزیں حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات پر مبنی ہیں اور کون سی چیزیں حواریوں کے ارشادات ہیں اور کون سی باتیں خود ان کے علماء و فقہاء کے خود ساختہ نظریات ہیں۔ (باقی)

مقالات سلیمان جلد سوم

قرآن کے مختلف پہلوؤں پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مقالات اور علمی مضامین کا مجموعہ جس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے خود ساختہ جدید یت کے اجتہادات کی تصحیح اور غیر مسلموں کے اعتراضات کا رد کیا گیا ہے۔ قیمت ۔۔ ۱۴

منیجر

نقیبِ حرکت و زندگی "میرزا عبدالقادر بیدل"

از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ
(ریڈر و صدر شعبۂ اردو و فارسی جین کالج آرہ)

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست — ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

میرزا عبدالقادر بیدل ہندوستان کی اس عظیم عبقری شخصیت کا نام ہے جن کی نسبتِ وطنیت سے اہلِ عظیم آباد کا سر ہمیشہ فخر سے اونچا رہے گا، محققین کو بیدل کے عظیم آبادی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا، مگر عظیم آباد ان کا مولد و وطن نہ تھا، اس کی دلیل بھی وہ آج تک فراہم نہ کر سکے، بہرحال اب تک کی معلومات سے یہ واضح ہے کہ میرزا عبدالقادر مغلوں کے مشہور قبیلۂ برلاس کے ایک فرد تھے، ان کے آبا قدمان ماوراءالنہر سے منتقل ہو کر بخارا میں آباد ہو گئے، اور کئی پشت اوپر سے سپہگری ان کا پیشہ تھا، میرزا عبدالقادر کے والد میرزا عبدالخالق مغل فوج میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، مگر عین جوانی میں وہ پیشے سے دل پھر گیا اور تصوف کی راہ اختیار کر لی، وہ ہندوستان میں مولانا کمال رانی ساگری کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے، ایامِ کہولت میں بعہدِ شاہجہانی ۱۰۵۴ھ میں ان کے گھر فرزندِ نیک بخت پیدا ہوا جس کا نام موسسِ سلسلۂ قادریہ سے نسبتِ عقیدت سے عبدالقادر رکھا گیا، سید ابوالقاسم ترمذی نے جو میرزا عبدالخالق کے یارانِ طریقت میں تھے، مادۂ تاریخِ ولادت "فیضِ قدس" اور "انتخاب" نکالا نیز نومولود کے درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کی، عبدالقادر ساڑھے چار سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، چچا میرزا قلندر نے پرورش کی، ساڑھے چھ برس کی عمر میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا،

مسائل مہینوں میں ہی ناظرہ ختم کر لیا، اسی زمانہ میں والدۂ مشفقہ نے داغِ مفارقت دیا، دس سال کی عمر میں صرف و نحو عربی پڑھ کے نثر و نظم فارسی کی طرف رجوع کیا اور اسی کمسنی میں سب سے پہلے ایک فارسی رباعی کہی۔

مذکور ہے کہ میرزا عبد القادر ابتداً رمزی تخلص کرتے تھے، مگر گلستانِ سعدی کا یہ مصرعہ

بیدل از بے نشاں چہ گوید باز[1]

دیکھ کر ایک کیف محسوس کیا اور روحِ حافظ سے استمداد پر اپنا تخلص رمزی کے بجائے بیدل اختیار کیا۔ وہ دورانِ طالبعلمی میں اپنے ذہن رسا کا حال یوں قلمبند کرتے ہیں:

"ہر انزوعاے کہ بشا ہدۂ ام می رسید بحیث کتبی در راہِ تکامل من خدمت می کرد، و ہر کلمہ کہ بگوشم مواصلت می کرد، مراقدے بلوتر می کشانید، معنیٔ نکتۂ باز یک در مقابلم یک کتاب اسرار را می کشود، و ہر نکتۂ دفترہائے حقیقت را بازی کرد، خداوند کریم چنیں یک ہوش تند بمن عنایت کردہ بود"

(بحوالہ بیدل شناسی صفحہ ۶)

اب از خود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبد القادر نے اپنا تخلص رمزی سے بدل کر بیدل کیوں رکھ لیا؟ سمجھتا ہوں اس میں بھی ایک رمز ہے، دل کی حقیقت اہلِ دل سے پوشیدہ نہیں، دل تو سرچشمۂ زندگی ہے، حرکت ہے، آئینۂ جمالِ الٰہی ہے، سراپردۂ حقیقت ہے، پھر میرزا نے تخلص بیدل کیوں پسند کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بیدل تخلص محض اپنے جذبۂ عجز و انکسار کے تحت اختیار کیا تھا ورنہ جو حقیقت عظمیٰ میں فنا دیکھتے ہیں، ورنہ حق یہ ہے کہ بیدل سے بڑا صاحبِ دل دنیائے ادب نے کم دیکھا۔

[illegible]

---

[1] گر کسے وصف او ز من پرسد ❊ بیدل از بے نشاں چہ گوید باز — سعدی

من بیدل بجالِ تو عجب حیرانم — اللہ اللہ چہ جمال است بریں بوالعجبی

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے۔

خسرو نے اسی جمالِ جہاں تاب کے مشاہدے پر کہا تھا ؎

پری پیکر نگاری، سرو قدی، لالہ رخساری — سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم

اور اسی شدتِ احساس کو شاعرِ مشرق نے ان الفاظ میں مصوّر کیا ہے:

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے — جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

دل تو ہر سینے میں دھڑکتا ہے، مگر صرف دھڑکن ہی سے زندگی عبارت نہیں، صاحبِ نظور میں زندگی زندہ دلی کا نام ہے، ورنہ حالیؔ کبھی نہ کہتے ؎

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

حالیؔ کے اس زبان زد عام شعر کے پردے کھولیے اور دیکھیے یہ سادہ سی بات فکر و فلسفۂ حیات کی کس سرحد کو پہنچتی ہے۔

بیدلؔ نے روحِ حافظؔ ہی سے استمداد کے بعد رمزیؔ سے بدل کر تخلص بیدلؔ اختیار کیا، حافظؔ کا مشہور شعر ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اسی طرح مقیمانِ کوئے دلداریم کی صدائے دلپذیر گونجتی ہے، کیونکہ عقل و دل و نگاہ مرشدِ اولین عشق ہی تو ہے، عشق حیات کا فلسفۂ عشق سازِ ازل کی فغاں ہے، آج بھی اس سے دمادم صدائے کن فیکون بلند ہے، نمو، تغیر، انقلاب، ارتقا، یہی تو اصل و حقیقتِ زماں ہے، کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ، میرزا بیدلؔ کے فلسفۂ حرکت و حیات کا یہی نغمہ شاعرِ مشرق کے یہاں بھی گونجتا ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی　　　روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

پس منظر میں احساسِ بے دلی سے متعلق خود میرزا بیدل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بیتابِ وصال و طاقتِ دوری چہ حرفست این　　　اسیری را کہ عشقت خواند بیدل دل کجا دارد

عشقِ حقیقی نے ان کے شعور و ادراک کی دنیا منور کر دی تھی، اپنے دل کا حال وہ خود لکھتے ہیں:

نمی دانم چہ برق افتاد در بنیاد دامانم　　　کہ دل داغ شرارِ کاغذی شد در کنارِ من

کوسِ محبت کی صدا نے طلسم خانۂ دل ہی کو زیر و زبر کر دیا ؎

بشکست طلسمِ دل و زد کوسِ محبت　　　باشید غبار نفس و آہ حزین شد

بیدل پر دلِ روشن کی حقیقت آشکارا تھی، وہ آزاد اور صاف دل کی اہمیت خوب جانتے تھے، نہ کبھی نہ کہتے ؎

گر حیاتِ جاوداں داری دلِ روشن طلب　　　آبِ حیواں موجہ از آئینۂ اسکندر است

بیدل صوفی تھے اور ایک فلسفی صوفی، غوامضِ تصوف سے آشنا، رموزِ عرفانیات سے آگاہ، صوفیا میں عزلت نشینی اور خلوت گزینی کی بڑی اہمیت ہے، مگر بیدل اس راہ میں بھی زندگی کی حرکت ہیں اور حیات کا درس دیتے ہیں جو عین حرکت و عمل سے عبارت ہے، گویا ان کی نظر میں بھی دم بدم ہم زوال ہر دم جواں ہے زندگی، اور یہ زندگی آزادی و روانی کا دوسرا نام ہے، کیا اچھی تمثیل پیش کرتے ہیں ؎

بر دلِ دانا اثر عزلت مبند افسردگی　　　ہر کجا آبِ رواں یخ بست سنگِ مرمر است

ہیں نہ ؎

دلِ افسردہ نہ دید تابِ دتپ نفس　　　ببرید ناخنِ مطرب از گرہ بریشم چنگ

بیدل خود ایک عظیم صاحبِ دل تھے اور صاحب دلی کی برکتوں سے باخبر ان کا شعر ہے ؎

بہ علایق می فزاید الفتِ صاحبدلاں — بید تخلص کہ پیوندش کنی شیریں تر است

مگر انھوں نے اپنا تخلص بیدل پسند کیا، یہ صرف ان کی کسرِ نفسی، عجز اور انکسار ہے، کہتے ہیں ؎

بلند است آنقدر با آشیانِ عجزِ ما بیدل — کہ بے سعیِ شکستِ بال و پر نتواں رسید آنجا

بیدل کے قصیدوں میں ایک قصیدہ "قصیدۂ نیرومندی در مدحِ شہزادۂ اعظم" ہے، اس قصیدہ میں بھی بیدل نے اپنے تخلص کی طرف واضح اشارہ کیا ہے ؎

صورتِ احوالم از طرزِ تخلص روشن است — بیدلی با چیدہ ام بر خود ز وضعِ روزگار

گر شود ابرِ عنایت آبیارِ مزرعم — خوشہ ساں از پائے تا سر جملہ دل آرم بار

چنانچہ استاد صلاح الدین سلجوقی نے بھی اپنی کتاب "نقدِ بیدل" کی تمہید میں لکھا ہے :

"صوفیِ متواضع را با اینکہ پُر دل و سراپا دل است، خود را بیدل می خواند، با وجود اینکہ روحِ خالص و عقلِ مجرد است، خود را در قطارِ جمادات بے جان و بے حس می شمارد۔"

(بحوالہ "بیدل شناسی" از غلام حسن مجددی ص ۳۶۰)

میرزا عبدالقادر نے جب آنکھ کھولی اور شعور کو پہونچے تو ہر سمت صولت و دبدبۂ شاہجہانی کا مشاہدہ کیا، ان کی رگوں میں مغول چنگیزی کا خون گردش کناں تھا، چونکہ شخصیتیں نسل اور ماحول کی زائیدہ و پروردہ ہوتی ہیں اور ان ہی کے زیرِ اثر تصورات و تخیلات بار پاتے ہیں، لہٰذا میرزا بیدل کی شخصیت بھی بہر جہت معتبر، توانا اور عہد ساز ہوئی، بلند حوصلہ، جواں عزم، عالی ہمت اور مردانہ جرأت ان کی شخصیت کے عناصر ٹھہرے، اس معیاری شخصیت نے ان کے رشحاتِ قلم کو فکر و خیال کی وہ درخشندگی عطا کی جس نے ادب میں فلسفہ و اخلاقیات کے طلسم خانے جگمگا دیے، مثنوی "عرفاں" ہو یا "طلسمِ حیرت" و "محیطِ اعظم"، "نکات" پر ارزش ہوں یا قصائد و رباعیات، ہر جگہ اپنی بے مثال قدرتِ سخن سے فکر و فلسفۂ حیات کا نگار خانہ سجا دیا ہے، بالخصوص جب ہم بیدل کی غزلیات کا

مطالعہ کرتے ہیں تو ایک ایسے آہنگ تند و تیز کا احساس ہوتا ہے جو زندگی سے لبریز اور حرکت آفرین ہے۔

غالباً یہی سبب ہے کہ کلامِ بیدل وسط ایشیا کے ان حصوں میں زیادہ مقبول و متداول ہے جہاں کی زندہ و فعال قومیں حرکت و عمل آشنا ہیں، افغانستان، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ کے مدارس میں اشعار بیدل داخلِ نصاب ہیں، اور عوام بیدل کو اپنا محبوب شاعر سمجھتے ہیں۔

بیدل ایک صوفیٔ باصفا، ایک شاعر خوشنوا، ایک مصلحِ اخلاق، ایک مبلغِ انسانیت اور ایک دانشور بے مثال تھے، ایک بیدار ذہن مفکر کی حیثیت سے بیدل نے الٰہیات و خلقتِ کائنات، نظامِ عالم و آویزشِ خیر و شر اور حیات انسان کے انفرادی و اجتماعی پہلوؤں پر غور کیا ہے، ان کے سینہ میں ایک عارف کا دل تھا، جو عشق خداوندی و محبت بشر سے مملو، حسن و جمال کے احساس شدید کا حامل اور مظاہر کائنات کی نیرنگیوں کا رمز آشنا تھا، بیدل عظمت بشری کے قائل تھے، لہٰذا انسانیت کا درس اور اخلاقیات کا سبق ان کے کلام کی آبرو ہے، ایک عظیم دانشور کی حیثیت سے اس نابغہ بے عدیل کا مرتبہ بہت بلند ہے، بیدل کے اشعار میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، تصوف و عرفان کے اعلیٰ مسالک اور اجتماعی علوم کی بہترین قدروں کی ترجمانی ہے۔

بیدل نے یہ سب کچھ ایک طرزِ بدیع، اسلوب منفرد اور پیرایۂ خاص میں پیش کیا ہے جس کی پیروی مشکل ہی نہیں ناممکن سمجھی گئی، بیدل کا یہ سبک مخصوص انھیں سبک ہندی کے دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ انفرادی تزکیۂ نفس کی تعلیم ہو یا ارتقائے اجتماعی کا درس، رموز و اسرار زندگی کی تفہیم ہو یا حصول اقدار عرفانی کی تشویق، ہر جگہ بیدل نے سعی و مجاہدہ کو ایک شرط لازم قرار دیا ہے، اور اس کی [illegible] کتنا دلآویز پیرایۂ بیان ہے:

[illegible] اگر چہ آید جستجو پیدا — اگر عنقاست پیش نیست دشوار

بقدر جہد ہر کس مزد یاب است — خوش آن جہدے کہ منظورش ثواب است

کتنی تاکید ہے ان اشعار میں ؎

جہد را تا فرصت، جہل گیر | در طلب فیضہاست سہل گیر
شبنمے گر بجہد می تازد | اشک را آفتاب می سازد

زندگی خود ایک جہاد مسلسل ہے، اس میں محنت و مشقت اور حرکت و عمل کی کتنی اہمیت ہے؟ اس پر ہر اہل نظر نے روشنی ڈالی ہے، اقبالؒ نے بھی کہا ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم | جہاد زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

بیدل کا تعلق تاریخ ہند کے جس باب سے ہے وہ سیاسی آویزشوں اور شکست و ریخت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، شاہجہاں کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جو رزم آرائی رہی بیدل نے بہت نزدیک سے اس کا مشاہدہ کیا تھا، میرزا عبداللطیف قرابتدار بیدل کے چچا میرزا قلندر کے قرابت دار اور شجاع کی فوج میں کماندار تھے، بیدل بھی میرزا عبداللطیف کی فوج کے ساتھ تین ۳ ماہ تک رہے، اورنگ زیب نے جب ۱۶۵۹ء میں شجاع کو شکست فاش دی تو دس ۱۰ دنوں تک بیدل میرزا عبداللطیف کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر جنگلوں میں پھرتے رہے،

بیدل جسمانی طور پر نہایت قوی اور طاقت ور تھے، سیاسی الٹ پھیر کے بعد دہلی میں انھوں نے ۱۰۸۰ھ میں شادی کر لی، اور خاندانی پیشۂ سپہگری کو ہی وسیلۂ معیشت بنایا، شہزادۂ اعظم شاہ نے بیدل کی فارسی و ترکی زبان دانی سے متاثر ہو کر انھیں منصب پنج صدی پر فائز کیا، بیدل کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ کشتی لڑتے تو اپنے حریف کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر زمین پر دے مارتے، عراقی گھوڑے کے ساتھ دوڑ لگاتے تو اس کو پیچھے چھوڑ دیتے (سفینۂ خوشگو ص ۱۱۰ - ۱۱۱)

یہاں اس تذکرے سے میری مراد صرف یہ دکھانا ہے کہ بیدل کی نظر میں قوت و طاقت جسمانی و روحانی کی کتنی اہمیت تھی، غلام حسن مجددی لکھتے ہیں :

"بیدل بہ تربیت بدنی و اساسات نیز اہتمام داشت و عصائے فیلی وزنی و قوی بدست می گرفت۔

..... بیدل در ستایش عصای خود چنیں گفتہ است "

سنت الانبیاء، زینت الصلحاء، مونس الاعمٰی، ید الضعفاء، دافع الاعداء۔"

(بیدل شناسی ج ۱ ص ۹۴)

بیدل اپنی ایک رباعی میں اس فلسفۂ قوت کو یوں بیان کرتے ہیں :

بیدل بر خلق کسر شاں نہ نمای ـ تاثیر تواں شدن کماں نہ نمای

خاصیت ایں معرکہ عاجز کشی است ـ اینجا زنہار ناتواں نہ نمای

حسین علی خاں کے قاتل محمد امین خاں نے ایک بار بیدل کے داڑھی تراشنے پر طنز کیا تھا۔ بیدل نے فوراً کہا: "من ریش خود را می تراشم و قلب کسے را نمی خراشم" یہ سن کر خان مشتعل ہو گیا اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ لے گیا، بیدل نے کھڑے ہو کر امین خاں کو جنگ باشت کی دعوت دی، مگر حاضرین نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔

بیدل کی قوت برداشت اور تحمل کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۱۲۳ھ میں ان کا اکلوتا بیٹا دو سال نو مہینے آٹھ روز کا ہو کر فوت ہوتا ہے تو انھوں نے بڑے صبر و ضبط اور تحمل کے ساتھ اس کے دفن کا انتظام کیا، خود کفن پہنایا اور تابوت گھر سے باہر لائے، اس اندوہ عظیم کا اظہار بیدل نے ایک جگر گداز مرثیہ میں کیا ہے جو مخمس کے اٹھارہ بند پر مشتمل ہے۔

یہ تحمل بیدل کی تربیت قلبی و روحانی جو صرف تصوف کی دین ہے، بیدل کے نزدیک تصوف تمام علوم میں بہترین و عمیق ترین علم ہے، محمد افضل سرخوش نے بھی جو بیدل کا رقیب تھا، ان الفاظ میں معترف کیا ہے کہ

"بیدل در تصوف کل بادشاہ وقت خود است۔"

لہٰذا بیدل کے منفرد اسلوب میں جو قوت و شدت ہے اس کے بھی مختلف اور گوناگوں اسباب ہیں بیدل کا عقیدۂ راسخ، پختہ ایمان، جذبۂ عشقِ الٰہی، طمانیتِ قلبی، ارتقائے روحانی، مشاہدۂ عرفانی، نیز شجاعت و مردانگی اور اعلیٰ صفاتِ انسانی۔ ان تمام عوامل نے شخصیتِ بیدل کی تعمیر میں ویسی صلابت پیدا کر دی جس کا انعکاس ان کی تصانیف لطیف میں ناگزیر تھا، بیدل نے اپنے اشعار میں زندگی کا ڈرامائی فلسفہ پیش کیا ہے، ان کی شعری اصطلاحیں، الفاظ کا انتخاب، طویل مترنم بحریں، لب و لہجہ کا بانکپن، فکر و تخیل کی نازکی ہیں جس متحرک زندگی کا شعور بخشتی ہیں، اس کا اندازہ بیدل کی غزلیں پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نشد درین درسگاہ عبرت بفہم چندیں رسالہ پیدا جنون سوادے کہ کردم امشب ز صبح اوراق لالہ پیدا
اگر بصد رنگ بر فشانم ز دام جستن نمی توانم کہ کرد پرواز بے نشانم زبال طاؤس بالہ پیدا
ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ
عشق اگر در جلوہ آرد پرتو معتمد دررا از گداز دل دہد روغن چراغ طور را
از فلک بے نالہ کام دل نمی آید بدست شہد خواہی آتشی زن خانۂ زنبور را
تہی شو از خودت راحت شمر آفاتِ دنیا را گر این کشتی نداری از محیطِ بیکران مگذر
بخوانِ نعمتِ اہلِ دول ننگ است خو کردن اگر آدم سرشتی در چراگاہ خران مگذر

یہ سبک بیدل سبک ہندی ہے، اکثر ناقدین نے بیدل کو پیچیدہ گوئی، دشوار فہمی اور مشکل پسندی سے متہم کیا ہے۔ حالانکہ اشعار بیدل کا معتدبہ حصہ صفائی زبان و سلاست بیان اور شیرینی و دلآویزی کا آئینہ ہے، فلسفیانہ نکات، عارفانہ مسائل اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات عام فہم اور جالب توجہ یوں بھی نہیں ہوتے، اگر بیدل نے اسے سہل گر مستحکم انداز بیان سے پیش کیا ہے، نازک مضامین اور باریک خیالات کے لیے ذہن رسا ہی کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہتے ہیں

سخن بلند من فہم تست می خواہد	سپہر فکر آسماں نیست کو ہم دگنل دارم
مدعی درگذر از دعوی طرز بیدل	سحر مشکل کہ بہ کیفیتِ اعجاز رسد

دل را ولی می شناسد کی طرح فلسفی را فلسفی می داند، علامہ اقبال نے میرزا بیدل کے عنوان سے مقالے لکھے ہیں، بیدل کے ایک فلسفیانہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے ان کی خوب گوئی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

حقیقت یا مری چشمِ غلط بیں کا فساد	یہ زمیں، یہ دشت، یہ کہسار، یہ چرخِ کبود
کوئی کہتا ہے نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہے	کیا خبر ہے یا نہیں ہے، تیری دنیا کا وجود
بیدل نے کس خوبی سے کھولی یہ گرہ	اہلِ حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود
"دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن	رنگ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود"

حکمت کے ایک ادق مسئلہ کو کس آسانی سے حل کر دیا، یہی وہ سحرِ مشکل ہے جس کو اعجاز کی کیفیت نے بیدل کے یہاں سحرِ حلال بنا دیا ہے۔

زندگی کے سوتے دل ہی سے پھوٹتے ہیں، مادی ہوں یا روحانی، وہی گردش ہی زندگی کا دوسرا نام ہے ؎

جہد ہرگز نمی شود پامال	ریشہ از دویدن است نہال

بیدل کی فنکاری یہ ہے کہ فکر و خیال کے تانے بانے وہ اسی مرکزِ حیات کے گرد بنتے ہیں، جس سے خورشیدِ حقیقت کا طلوع ہوتا ہے، اور اس کی تو مرکزی کرنیں ذہنِ بیدل کی اختراعی صلاحیتوں سے فکر و فن کے متنوع اور متحرک پیکر تراشتی ہیں، صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں

چشم کی نزندہ با جنوں دلِ تنگ ما	کہ ہزار میکدہ می دود بر کابِ گردشِ رنگِ ما
[illegible]	کہ شتاب اگر بہ خطر شود نرسد بگردِ سنگِ ما

زدلِ فسردہ بنالہ نرسید تاب و تبِ نفس بریدہ ناخنِ مطرب از گرہ و بریشم چنگِ ما

بیدل کا قولِ گرامی ہے کہ "گراہ قوت جسم جہد آدمی است":

اس کی روشنی میں ان کا عالمگیر پیغام ملاحظہ ہو، پیامِ عزم و حوصلہ، پیامِ جرأت و مردانگی ؎

بوصولِ مقصد، عافیت نہ دلیل جونہ عصا طلب تو ز اشک ایں ہمہ کم نہ قدمے ز آبلہ پا طلب

اور ان سب کی اساس اس یقینِ محکم پر ہے جو قلبِ مومن کی جان ہے ؎

خوشت آنکہ ترکِ سبب کنی بیقیں رسی و طرب کنی ز حقیقت انچہ طلب کنی بطریقِ بیدلِ ما طلب

وہ حرکت و اضطراب کو زندگی کی بیّن علامت ہی نہیں اس کا مرادف سمجھتے ہیں ؎

تا نفس آئینہ است زیرِ طپشم چارہ نیست ذرہ عدم می شود از عدمِ اضطراب

ہیچ موجودے بعرضِ شوقِ ناقص جلوہ نیست ذرّہ ہم در رقص مو ہوے کہ دارد کامل است

اور یہی زندگی ذروں کے جگر میں خورشید کے لہو کی ضمانت ہے۔

مجدّدی لکھتے ہیں:

"نیروی ذہنی ذوق العادہٗ بیدل تا آخریں لحاتِ حیاتش بصورتِ صحیح فعال

بودہ است"

بیدل اواخرِ محرم ۱۱۳۳ھ میں تپِ محرقہ کے شکار ہوئے، دوم صفر کو تمام رات تیز بخار رہا، ان کے دوست نواب غیرت خاں بہادر صلابت جنگ ساری رات جاگتے رہے، بیدل کبھی بیہوش ہو جاتے اور کبھی انھیں ہوش آ جاتا، اسی درمیان میں حواس بحال ہوئے تو بے اختیار ہنستے رہے۔ وقتِ سحر بحران ہوا، اور بالآخر مالکِ حقیقی سے جا ملے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

قبال انسٹیٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر کا ایک سیمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۱۳ر اکتوبر سے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۱ء تک کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے اقبال انسٹیٹیوٹ کی طرف سے سیمینار "اسلام عصر جدید میں: اس کے مسائل اور امکانات" کے عنوان سے تھا، اس کے ح رواں پروفیسر آل احمد سرور تھے، جو اس وقت اقبال انسٹیٹیوٹ کے "ڈائرکٹر ہیں" اور یہاں سے پہلے وہ اردو ادب کے مایۂ ناز ادیب، نقاد اور خوش بیان مقرر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، ں نے کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے یہ سیمینار منعقد کرا کے کشمیر کی مذہبی اور علمی زندگی میں بڑی حرکت اکر دی۔

کشمیر پہلے بھی جا چکا تھا، مگر اس سیمینار کا دعوت نامہ آیا تو کشمیر کی پرانی یاد تازہ ہو گئی، فیضی کے ار ذہن میں آئے ؎

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر — کہ بارِ عیش کشاید بعرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصہ کہ دیدنِ او — ورق نگارِ خیال است نقش بندِ ضمیر
ہوائے او متنوع چو فکرتِ نقاش — زمینِ او متلوّن چو صفحۂ تصویر

پھر عرفی کے ان اشعار کی وجہ سے کشمیر پہنچنے کا شوق اور تیز ہو گیا ؎

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر در آید — گر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

بنگر کہ زفیضش چہ شود گوہر کیتا — جائے کہ خزف گر دو و آنجا گہر آید
وانگہ بچنیں فصل کہ در ساحت گلزار — از لطف ہوا چاشت نسیم سحر آید

اس دعوت نامہ کے آنے سے پہلے سری نگر کے ایک علم دوست، معارف نواز اور میرے انتہائی کرم فرما جناب محمد امین بٹ صاحب کا بڑا دیرینہ اصرار تھا کہ میں کشمیر میں ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں، وہ دوستی کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھانے کو سعادت سمجھتے ہیں، اور یہ شعر ان کے سامنے رہتا ہے ؎

براہِ دوستی ہا ہر کہ بے منت قدم ساید — بہر گامے کہ بر دارد ز پائے زمن چشمے

ان کا خاندان بڑا علم دوست رہا، انھوں نے کشمیر کے نغز گو شاعر، عارف باللہ، مولانا شمس الدین کاملی حیرتؔ کے دامن میں برسوں تربیت پائی جو سلسلۂ کبرویہ سے منسلک اور کشمیر کے مشہور بزرگ طریقت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے معتقد تھے، جناب محمد امین صاحب کے ذریعہ سے ان کی یہ دو پُر کیف غزلیں پڑھ کر محظوظ ہونے کا موقع ملا :

من مست مے ہوشم پیمانہ بہ پیمانہ — نظارۂ خاموشم جانانہ بہ جانانہ
آں صاف سفالستم در کسوت مینائی — صد آتش مے دیدم میخانہ بہ میخانہ
در دے کہ در آنجا بود پس ماندۂ میخوارا — سر داد بہ شیدائی مستانہ بہ مستانہ
حرف شکن زلفش عبدیت کہ می گوید — زیں قصہ ہمی زاید افسانہ بہ افسانہ
جائے کہ ودیعت بود اندر جگر حیرتؔ — فرہاد ز مجنوں یافت دیوانہ ز دیوانہ

جگر بہ یاد عقیق لعلش بہن نہ گردد دگر چہ گردد — دل از ہوائے عبیر زلفش ختن نگردد دگر چہ گردد
چو خوش نصیبی بناز اے صبا بجا کم ار بگذری خرامان — ز حسن بوئے تو کنج قبرم چمن نگردد دگر چہ گردد
چو بگذری بر سر مزارم کشیدہ داماں کشادہ ابرو — کف امیدم بدامن جیب کفن نگردد دگر چہ گردد

بہ درد نامِ امیر ہمدان علیِ ثانی ظہیرِ دوران چو لعل ولد از شکر افشاں دہن نگردد دگر چہ گردد
چو شمس شیدا بپیر آمد گدائے کوئے امیر آمد اگر بمدحش ز شوق محوِ سخن نگردد دگر چہ گردد

جناب محمد امین صاحب جناب مولانا شمس الدین کاملی حیرت کی تربیت کے اثر سے بقول ان ہی کے صاحبدلوں، عارفوں اور عالموں کے خادم بنے رہے، گو اخبار نویس ہونے کے ساتھ سرکاری ملازمت بھی کی، اور حکومت کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، سری نگر کے ایک مشہور اخبار چنار کے اڈیٹر بھی رہے، ان کا موجودہ خاندان بھی بڑا تعلیم یافتہ ہے، ان کے ایک بھائی خواجہ محمد یوسف مسلم یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر خواجہ منظور حسین کے بڑے محبوب شاگرد تھے، انھوں نے ۱۹۴۲ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے میں جو ریکارڈ قائم کیا اس سے آگے اب تک کوئی نہیں جاسکا ہے، وہ حکومت پاکستان کے وزیر رہنے کے بعد اس وقت اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے ایک مشیر ہونے کی حیثیت سے نیویارک میں مقیم ہیں، ان کے ایک اور بھائی خواجہ غلام نقشبند (ایم۔ ایس سی۔ علیگ) آنڈین فارسٹ سروس میں چیف کنزرویٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد دہلی میں حکومت کشمیر کی طرف سے ریڈیزنٹ کشمیر رہے، اب پنشن پاتے ہیں، جناب محمد امین بچھ صاحب کے بڑے لڑکے مصباح انور بچھ صاحب سعودی عرب میں انجینیر ہیں، ان کے داماد محمد یعقوب قریشی صاحب بھی انجینیر ہیں جو جیون میں اس وقت ہیں، ان کے چھوٹے لڑکے شاہد روح الامین بزنس میں لگے ہوئے ہیں۔

ایسے خاندان کے ساتھ کچھ دن گذارنے میں بڑی خوشی تھی، مگر ہم راستے کی خرابی کی وجہ سے اپنی فیملی کے ساتھ سری نگر بڑی پریشانی میں وقت مقررہ سے چونتیس ۳۴ گھنٹے دیر کرکے پہنچے تو دس بجے رات کا وقت تھا، جناب محمد امین بچھ صاحب کو اپنے ایک دوست جناب عبدالحق برق کے ساتھ مسلسل چند گھنٹے انتظار میں گذارنا پڑا، جس سے ہم کو بڑی تکلیف ہوئی، رات کافی گذر چکی تھی اور ہم تھکے

تو تھی سرینگر کے آخری حصہ بریں میں تھی، جہاں اس وقت جانا مناسب نہیں سمجھا گیا، اس لیے سرینگر کے وسط میں ریزیڈنسی روڈ پر ایک ہوٹل اوشا این میں قیام ہوا۔

دوسرے دن جب محمد امین نچھ کے ساتھ جناب پروفیسر آل احمد سرور سے ملا تو معلوم ہوا کہ سیمینار کے مہمانوں کے قیام کا انتظام یونیورسٹی کے مہمان خانوں میں کیا گیا ہے، وہیں منتقل ہو گیا، جہاں سبھی جانے بوجھے لوگ آکر مقیم ہو چکے تھے، ان ہی میں جناب سید شہاب الدین دسنوی اور جناب ضیاء الحسن فاروقی تھے جن کی وجہ سے بڑی عافیت پہونچی، اس سیمینار میں جناب آل احمد سرور صاحب کے بعد سب سے زیادہ متحرک اور سرگرم عزیزی ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کو پایا، جن کا بچپن دارالمصنفین کے احاطہ میں گذرا ہے اس وقت وہ اقبال انسٹیٹیوٹ میں فارسی کے ریڈر ہیں، انھوں نے ہر طرح کی عافیت پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

۳ر اکتوبر کو جناب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر کی صدارت میں روایتی شان کے ساتھ سیمینار کا آغاز ہوا، شیخ صاحب کا خطبہ پُر مغز اور پُر اثر تھا، ان کا یہ کہنا بڑا معنی خیز تھا کہ اسلام جمہوریت کی روح، تنگ نظری کا دشمن اور بھائی چارہ کا درس دیتا ہے، جیسے جیسے ہندوستان میں جمہوریت جاگزیں ہوتی جائے گی اور سیکولرزم وظیفۂ لب ہونے کے بجائے دل کی دھڑکن اور ذہن کی کرن بنتا جائے گا، ویسے ویسے اسلام کی عالمگیر قدروں کا احساس بڑھتا جائے گا، کیونکہ اسلام ساری انسانیت کی نجات کا پیغام لے کر آیا ہے۔ شیخ صاحب اپنے خطبہ میں اقبال کے اشعار پڑھنے لگے تو ان پر رقت طاری ہو گئی، معلوم ہوا کہ اقبال کے کلام سے ان کو بڑا عشق ہے، سیمینار کا افتتاح جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کیا، جن کا خطبہ انگریزی میں تھا، اس میں جو علمی، تاریخی اور تحقیقی رنگ تھا، اس کو سن کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کسی ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس کا خطبہ ہے یا ایک پختہ کار اور دیدہ ور اہل قلم کی تحریر ہے، افسوس ہے کہ جناب شیخ عبداللہ اور جناب سید حامد کے خطبات

تقسیم نہیں کیے گئے۔ ان کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں بروقت تیار نہیں ہو سکیں، حالانکہ ایسے باوقار خطبے تمام حاضرین و سامعین کے ہاتھوں میں ہونے چاہیے تھے، جناب بدرالدین طیب جی ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس اور سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو سیمیناروں سے بڑی دلچسپی ہے، وہ ہر اچھے سیمینار میں جلوہ گر ہوتے ہیں، انھوں نے اس موقع پر اپنا کی نوٹ ایڈریس یعنی کلیدی خطبہ پڑھا، اس میں بہت سی مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی، لیکن جب انھوں نے پنڈت سندر لال آنجہانی کی ایک گفتگو کا ذکر کیا تو جذبات میں بڑا ارتعاش پیدا ہوا، پنڈت جی نے کہا کہ ہندو مذہب پانچ چھ ہزار برسوں سے قائم ہے، لیکن اس عرصہ میں اس میں ایسی ایسی چیزیں شامل ہو گئی ہیں کہ اس کی اصلی صورت بہت بگڑ گئی ہے، لیکن مسلمان جس طرح اپنے پیغمبر کی اعلیٰ، ارفع اور بے مثال تعلیمات سے دور ہو رہے ہیں، اس بنا پر ڈر ہے کہ اسلام اس کی نصف مدت ہی میں مسخ ہو کر نہ رہ جائے جتنے میں کہ ہندو مذہب ہوا، پنڈت جی کی یہ بات ہر مسلمان کے ذہن میں حاوی اور طاری رہنی چاہیے۔

سیمینار میں قدیم اور جدید عالموں اور دانشوروں دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مولانا ابوالحسن علی ندوی تو اس کا افتتاح کرنے والے تھے، مگر وہ اپنے بیرونی سفر کی وجہ سے وہاں تشریف نہ لا سکے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی مدعو تھے، مگر وہ بھی نہ پہونچ سکے، علماء کی نمایندگی باہر سے مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولانا مجیب اللہ ندوی کی وجہ سے ہوئی، دارالمصنفین، جامعہ ملیہ دہلی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی نمایندگی بھی تھی، سیمیناروں میں ایسے لوگوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے جو اچھا بول سکتے ہیں اور ہر مقالہ پر بحث کر کے مناظرانہ رنگ پیدا کر سکتے ہیں، خواہ وہ اپنے خیالات کیسے ہی رکھتے ہوں، اسی لیے اس سیمینار کا جو موضوع تھا اس کی مناسبت سے اس میں یہ باتیں بھی خلاف توقع سننے میں آئیں کہ خلفائے راشدین نے فتوحات کا دائرہ وسیع کر کے بڑی غلطی کی، خلافت راشدہ کے عہد کے معاشرہ کو آئیڈیل

کیسے کہا جا سکتا ہے، جب کہ اس کے تین خلفاء قتل کیے گئے، بدعتیں بالکل غیر اسلامی چیز ہے، یہ کیا فضول ہے کہ علماء ہی کو اسلام سمجھنے اور سمجھانے کا حق حاصل ہو، غیر علماء بھی اسلام کو سمجھ کر سمجھا سکتے ہیں، پہلے خدا اور انسان کے درمیان کے ایچ کی وضاحت کر لی جائے، پھر مذہب کی نوعیت کا تعین کیا جائے، مذہبی عقیدہ ذاتی عقیدہ ہوتا ہے، اس میں بیرونی مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی، اسلامی قوانین کی تعبیرات اور اجتہادات میں ہم کو ایک امیر علی، ایک فیضی اور ایک طیب جی کی ضرورت ہے، وحدت ادیان کا تصور عین اسلامی شعائر میں سے ہے، قرآن اور سنت کی میکنیکل تعبیرات اور تصریحات سے اسلامی مسائل کا حل نہیں نکالا جا سکتا ہے، سیکولرزم کے علاوہ اسلامی سیاست میں کسی دوسرے تصور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی آوازیں زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے اٹھائی جاتی ہیں جو اسلام کے بائیں بازو سمجھے جاتے ہیں، اس اصطلاح کی آڑ میں ان کے بہت سے نظریے کی ترویج ہو جاتی ہے، جس کو وہ خود اپنی زبان سے کہنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ایسے سیمیناروں میں روشن ضمیر اور گویا قسم کے علماء بھی شرکت کرتے رہیں، تاکہ ان بائیں بازو کے علمبرداروں کی طلاقت لسانی کا جواب اپنی قوت گویائی سے دیتے رہیں، کیونکہ ایسے سیمیناروں میں علم و فضل سے زیادہ قوت گویائی زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

مگر اس سیمینار کا روشن پہلو یہ تھا کہ اس میں کچھ لوگ خصوصاً بعض نوجوان طلبہ ایسے بھی تھے کہ جب حیلہ طرازی اور عقل کی رو باہی سے کوئی بات اسلامی عقائد و روایات کے خلاف کہی جاتی تو وہ حملہ کرنے کے لیے تیار رہتے، سیمینار میں ایسے پُر جوش اور حاضر جواب طلبہ کسی اور یونیورسٹی میں کم دیکھنے میں آئے، ان کی علمی تیر اندازی اور صید افگنی کی وجہ سے سیمینار میں اسلامی فضا قائم رہی اور ہر نشست میں حاضرین کی تعداد توقع سے زیادہ تھی جو اس مجلس سے کچھ سیکھ کر کچھ تحفے لے جانے کے لیے آتے رہے اور وہ یقیناً

رہتے ہوں گے، جب ان کے کانوں میں یہ باتیں بھی پڑیں کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، زندگی کو انفرادی و اجتماعی انداز سے سنوارنے، نکھارنے، پروان چڑھانے اور اس میں ن پیدا کرنے کا نام ہے، اس کے آفاقی اور انقلاب آفریں پیغام کو آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے سے چودہ سو سال پہلے حاصل تھی، موجودہ دم توڑتی اور سسکتی انسانیت کے لیے اسلام کی قدریں یات کا درجہ رکھتی ہیں، ایک مقالہ میں یہ بھی کہا گیا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی آل اندیشی سے یہ اندازہ تھا کہ آئندہ زمانہ اور ماحول کے بدلنے سے نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے، جن میں سے نئے ہوں اور مطالبوں کو قبول کرنا ناگزیر ہوگا، اسلام کی ہمہ گیری اور عالمگیری کو قائم رکھنے اور اس کو سے بچانے کی خاطر حالات کی تبدیلی کا ساتھ دینا ضروری ہوگا، اس لیے حضرت عمرؓ نے اجماع ہ قیاس کا بھی اضافہ کیا کہ جس چیز کی نسبت تم کو قرآن و حدیث میں حکم نہ ملنے کی وجہ سے شبہ س پر غور کرو، غور کرو، خوب غور کرو، اس کے ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو دریافت کرو، ئی فیصلہ کر لو، مگر اس کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جو مسئلہ قیاس شرعی سے ثابت کیا جائے اس کے یں یقین کر لیا جائے کہ قرآن مجید یا حدیث میں کوئی خاص حکم موجود نہیں ہے، اور پھر قیاس دی نہ ہو بلکہ اجتماعی ہو، اور اگر اجتماعی نہ ہو تو اہل الرائے کی اکثریت سے ہو، اہل الرائے سے فقہاء ہیں، ایک مقالہ میں یہ بھی کہا گیا کہ رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے امت کے روز اپنے سارے اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا، لیکن اللہ کے بندوں کے سارے پامال کیے ہوگا، وہ آخرکار جہنم رسید ہوگا، ایک مقالہ میں یہ بھی دکھایا گیا کہ اسلام انفرادی ملکیت نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے، وہ معاشی مساوات کا غیر فطری نعرہ نہیں لگاتا بلکہ معاشی انصاف کا فلسفہ اور عملی حل پیش کرتا ہے۔

ان تمام مقالات پر اچھی بحثیں بھی ہوتی رہیں، صرف جناب حسن ثانی کا ایسا مقالہ تھا جس

کوئی بحث نہیں ہوئی، یہ اسلامی تصوف پر تھا، اس کو انھوں نے ایسے خوبصورت انداز میں پڑھا کہ پورے مجمع کو لوٹ لیا، ہر طرف سے داد و تحسین کی صدا بلند ہوئی جس سے پتہ چلا کہ لوگ علماء کے دار و گیر سے اگر پریشان ہوتے ہیں تو صوفیائے کرام کی رواداری اور باطنی تعلیمات سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔

کچھ ایسے مقالے بھی تھے جن کا تعلق سیمنار کے اصل موضوع سے نہ تھا، البتہ اس کے داعی پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ جو "جدید دنیا میں اسلام۔ مسائل اور امکانات" کے عنوان سے تھا، وہ اس موقع کے لیے بہت ہی موزوں تھا، وہ اچھے ادیب اور انشاء پرداز بھی ہیں، اس لیے اپنے غیر ادبی مضمون میں بھی اپنے خاص اسلوب بیان سے ادب اور انشاء کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں، ادھر میں ان کا ایک خاص موضوع "ادب میں روایت اور بغاوت" بھی رہا ہے، وہ روایت کی عظمت کے قائل ہیں، لیکن اس کی بعض باتوں سے بغاوت کرنے کے بھی حامی رہے ہیں، اسی بات کو اپنے موجودہ مقالہ میں اعتدال اور توازن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی، اسلام کی قدیم قدروں کے معترف ہونے کے ساتھ وہ موڈرنزم کی موج کی عظمت اور طاقت کا بھی احساس دلانا چاہتے ہیں، موڈرنزم کے لیے جدیدکاری کی اصطلاح استعمال کی جو شاید ان ہی کی وضع کردہ ہے، انھوں نے اس کی طرف بہت ہی اچھے انداز میں توجہ دلائی کہ موجودہ دور میں مادی خوشحالی نے بدن کو بیدار اور روح کو خوابیدہ کر دیا ہے، انسان مشین پر حکومت نہیں کر رہا ہے، بلکہ مشین انسان پر حکومت رہی ہے، جمہوری ادارے جمہور کی آواز نہیں رہے، حکومت یا سرمایہ کے ہاتھوں میں کھلونے بن گئے ہیں، فرد کی آزادی کی لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد ہونا چاہتا ہے، طاقت کی پرستش نے بے رحمی اور سخت دلی پیدا کی ہے، عورت کی بے لگام آزادی نے اسے شتر بے مہار بنا دیا ہے، وہ مردوں سے ہزاروں سال کے ظلم و جبر کا انتقام لینا چاہتی ہے، تعلیم نے مہارت پر زور دیا ہے، سیرت سازی پر توجہ نہیں کی، اس نے علم دیا ہے، بصیرت نہیں دی،

ہے، نظر نہیں پیدا کی، سرمایہ دارانہ سماج اشتراکی ریاست کے ذریعہ سے اپنی اصلاح کی ناکام
جد وجہد ہے، مگر اشتراکی سماج نے بھی جو عوام کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے ایک نئے طبقے کو جنم
، جو مادیت اور اقتدار کو سب کچھ سمجھتا ہے' اور پرانے تہذیبی ورثہ سے صرف ایک عجائب خانے
ت کا کام لیتا ہے، یہ جدید کاری پر کیسا جامع اور دلآویز تبصرہ ہے، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے
طرف بھی توجہ دلائی کہ جدید کاری کو گمراہی اور پستی، شیطنت اور بے راہ روی سمجھنا بھی غلط ہے'
یہ مشورہ دیا کہ اس زریں اصول پر عمل کیا جائے جو خذ ما صفا ودع ما کدر کے مقولے
پوشیدہ ہے، اور ان کی یہ تجویز ہے کہ صحیح دانشوری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ہماری مذہبی قدروں سے
نہ واقف ہو بلکہ ان پر ایمان رکھتی ہو' اور جدید دور، جدید علوم اور جدید زندگی کے تقاضوں
سے واقف ہونے کے بجائے ان کا معروضی طور پر جائزہ لے سکتی ہو' اور ان کے ذریعہ سے انسان کو
ے دیتی ہو، اس سے صحیح طور پر کام لینے کا گر جانتی ہو۔

یہ آواز نئی نہیں پرانی ہے، مگر ذرا نئے انداز میں پیش کی گئی ہے' یہ صرف پروفیسر آل احمد سرور کے
آواز نہیں کہی جاسکتی بلکہ ان تمام مسلمانوں کے دل کی آواز ہے جو ایک طرف تو درخشندہ فلزات بینکوں کی
ں' سفیدانِ فرنگی کی کرامات سے مسحور ہو رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ اپنے سینوں میں آتش تکبیر کی
یا رکھتے ہیں، کعبے کو جبینوں میں بسا کر اور قرآن کو سینوں سے لگا کر اپنے نفس سوختہ میں شام
تازگی بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور جب نہیں کر سکتے تو گھبرا کر زبان حال سے کہتے نظر آتے ہیں
ت الٰہی کا یہ نگہبان کدھر جائے، یہی ذہنی کشمکش پروفیسر آل احمد سرور کے مقالہ میں ہے جو ان کیلئے
فکر دیتی ہے، جو صحیح معنوں میں اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مقالہ میں حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام کی اصطلاحات استعمال کی ہیں
ناظرین کو شک پیدا ہوگیا، انھوں نے حقیقی اسلام کی تعریف تو صحیح کی کہ یہ اپنے کو خدا کے حوالے کر دینے

نہیں ہے، اگر مذہبی اسلام سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو تو تاریخی اسلام کے بجائے اس کی وضاحت پولٹیکل یعنی سیاسی تاریخ کے اسلام سے کر دی جاتی تو پھر کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی، کیونکہ اسلام کو یزید، حجاج بن یوسف، علاءالدین جہاں سوز اور تیمور وغیرہ جیسے ظالم اور سفاک حکمرانوں یا معزالدین کیقباد، محمد شاہ رنگیلے اور جہاندار شاہ جیسے فاسق اور فاجر بادشاہوں کے کرتوتوں کے ذریعہ سمجھنا حقیقی اسلام کے ساتھ بے انصافی ہے۔

مقالہ نگاروں میں پروفیسر طاہر محمود صدر شعبۂ قانون انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی نے اپنی خطابت کا اچھا اثر پیدا کیا، ان کے مقالہ کا عنوان "ریاست جموں وکشمیر میں مسلم پرسنل لا کا پس منظر اور اس کے امکانات" تھا، جو انگریزی میں تھا، مگر بڑے خطیبانہ انداز میں اور پورے اعتماد کے ساتھ اس کی وضاحت اردو ہی میں کی، اس سے پہلے ان کی تقریر انگریزی میں سننے کا اتفاق ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ذہانت اور صلاحیت عطا کی ہے، وہ اگر مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی میں سلامت روی سے استعمال ہوتی رہی تو ان کی دلکش شخصیت مسلمانوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ بن جائے گی، انھوں نے اپنے مقالہ میں اس پر زور دیا کہ ریاست جموں وکشمیر میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلم پرسنل لا کی تدوین شرعی قوانین کے ماتحت ہونا چاہیے، تاکہ کشمیر سے باہر کے مسلمانوں کے لیے نمونہ ہو، اس مقالہ سے غیر کشمیری نمایندوں کو شاید پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ وہاں خانہ داماد، پسر پروردہ، دختر خانہ نشین کو وراثت میں اسلامی شریعت کے بجائے مقامی اور قبائلی روایت کے مطابق حصے دیے جاتے ہیں، مقالہ مفید اور پُر مغز تھا، مگر جب اس پر بحث شروع ہوئی تو بعض کشمیری دانشوروں نے اس پر زور دیا کہ مقامی اور قبائلی روایتوں کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں، لیکن اس کو سوچنا چاہیے کہ جموں وکشمیر کی ریاست سے مسلمانوں کے پرسنل لا کی تدوین میں قیادت نہیں ملے گی تو پھر ہندوستان کے کس گوشہ سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے، اقبال نے کشمیر کے متعلق جو یہ کہا ہے،

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

کیا وہ محض شاعری ہی ہے

کشمیر یونیورسٹی کے ایک استاد جناب عبدالاحد صاحب کا بھی ایک مقالہ انگریزی میں "کشمیر میں اسلام۔ اس کے مسائل اور امکانات" کے عنوان سے تھا لیکن اس میں زیادہ تر یہ دکھایا گیا کہ یہاں اسلام کو کیسے فروغ ہوا۔ اسی کے ساتھ اس میں کشمیر کے پیروں، پیرزادوں اور بابا داسوں سے مقالہ نگار کے سوءِ ظن کا اظہار ہے، اور اس سے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ خانقاہوں اور آستانوں کے سامنے جو فقیر بھیک مانگتے ہیں، اس میں متولی کا بھی حصہ ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ آخر میں یہ بھی شکایت تھی کہ کشمیریوں کو مرکزی حکومت میں کوئی ملازمت نہیں دی جاتی، وہ بحری، برّی اور ہوائی فوج کی ملازمتوں سے تو بالکل محروم ہیں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بھی ان کا داخلہ نہیں ہوتا۔

جناب سید شہاب الدین دیسنوی کا ایک مقالہ "قرآن اور سائنس" پر تھا، وہ میرے عزیز بھی ہیں، بچپن سے ان کا ساتھ رہا، ان کے اس مقالہ کو سن کر پہلی دفعہ یہ انکشاف ہوا کہ ان کی نظر قرآن مجید پر بھی اچھی ہے۔

جناب ضیاء الحسن فاروقی کا مقالہ تو تقسیم نہیں ہوا، مگر انھوں نے جو کچھ پڑھا اس میں مسلمانوں کے بعض مصلحین پر ان کے اپنے انداز میں کچھ کڑی تنقیدیں تھیں، وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کو ایسے اچھے انداز میں پڑھتے ہیں کہ سننے والوں پر ان کی تنقیص کا برا اثر نہیں پڑتا۔

میرے مقالہ کا عنوان یہ تھا "حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے اجتہادات سے ہم کو کیا ملا اور کیا مل سکتا ہے؟" کئی اور مقالے بھی پڑھے گئے، لیکن کسی وجہ سے نہ سن سکا، ان کا ذکر رہا جاتا ہے۔

سیمینار کے ہال کے بغل میں ایک کمرہ نماز کے لیے مخصوص تھا، مگر وہاں کے مصلے پر دو چار دقیانوسی مصلّی ہی ہوتے، ایسے ہی لمحات میں علماء کو ہمارے دانشوروں کی جدید کاری سے وحشت ہوتی ہے جو اسلام سے متعلق اپنے نظری و فکری تصورات کو بڑی بلند آہنگی سے پیش کرتے

لیکن جب ارکانِ اسلام کے ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو ان سے بالکل بیگانہ نظر آتے ہیں۔

ایک رات ہم لوگ جناب شیخ عبداللہ کے یہاں "وازوان" پر مدعو تھے، جو کشمیر کی بڑی پُرتکلف روایتی دعوت ہوتی ہے، ہم لوگ ایک بڑے ہال میں سفید چاندنی پر بٹھائے گئے، تھوڑی دیر میں ایک بڑے طشت میں سادہ عمدہ چاول یعنی خشکہ آیا جس کے اردگرد چار چار آدمی بیٹھ گئے، پھر جن باورچیوں نے جو خاص خاص چیزیں پکائی تھیں، وہ انکی چھوٹی چھوٹی دیگیں سامنے لاکر اپنے بڑے چمچوں سے مہمانوں کے طشت کے چاول پر ایک ایک چیز رکھتے گئے، طشت کے اردگرد بیٹھنے والوں میں میرے ساتھ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب اور جناب ضیاء الحسن فاروقی تھے، کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب چیزوں کے نام بتاتے گئے کہ یہ رستہ، یہ طین ماش، یہ مرچی، یہ روغن جوش، یہ قورما، یہ کباب سیخ، یہ ہاک، یہ پنیر، یہ بندرو، یہ دہی اور یہ گشتابہ ہیں، طشت پر اتنی چیزیں رکھی گئیں کہ مشکل سے ہم چاروں نے اس کا بیسواں حصہ کھایا ہوگا، جناب سید حامد صاحب بولے کہ یہ ان کی زندگی کی یادگار دعوت ہے، میٹھی چیزیں صرف سوجی کا حلوا تھا، کشمیر میں پلاؤ اور بریانی کا رواج شاید نہیں ہے، سارا زور گوشت کی مختلف چیزوں کی تیاری میں صرف ہوتا ہے، گشتابہ یہاں کی خاص چیز ہے، جو کشمیر کی بہت ہی محبوب، مرغوب اور ہاضم غذا ہے،

کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے بھی ایک رات یہ وازوان تھا، اس میں بھی چیزیں تو وہی تھیں، مگر ہر شخص کے لیے علٰحدہ علٰحدہ پلیٹ تھی،

اس دعوت میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، وہ اردو کے مشہور ادیب جناب مہدی افادی کے لڑکے کے داماد ہیں، مہدی افادی کو جو لگاؤ علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنفین اور معارف سے رہا، اس کا ذکر رہا،

علم یونیورسٹی پر گفتگو شروع ہوئی تو ان سے عرض کیا کہ اس وقت وہاں انیس ہزار لڑکے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہاں ایسے طلبہ تیار کیے جائیں جو آئی۔ اے۔ ایس، ڈاکٹری، انجینیری اور دوسرے مقابلے کے امتحانات میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوں، مگر ایسے کتنے لڑکے وہاں سے بنائے جا سکتے ہیں، فرض کر لیجیے کہ پانچ ہزار، ایک صاحب بول اٹھے: پانچ ہزار؟ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار، اور وہ بھی مشکل سے، عرض کیا کہ مان لیجیے بڑی محنت کی گئی اور مقابلہ کے مختلف امتحانات کے لیے پانچ ہزار تیار کر لیے گئے تو بقیہ چودہ ہزار کا کیا حشر ہوگا، یہ چودہ ہزار کے تو وہ ہیں جو کسی نہ کسی طرح ڈگری ڈپلومہ حاصل کر کے محض روٹی کمانے میں لگ جائیں گے آگے چل کر چودہ ہزار خاندانوں کی پرورش کریں گے، یہی تو ہمارا اصلی سرمایہ ہوں گے۔ کیا ان کو بھی اسی طرح ضروری نہیں جس طرح اچھے سے اچھے باصلاحیت لڑکوں کے نکالنے کی ہے، میری باتوں کو سن کر جناب سید حامد صاحب نے کہا کہ یہ بھی ضرور سوچنے کی چیز ہے۔

ایک شام ہم لوگ مولوی محمد فاروق میر واعظ کشمیر کے یہاں ایک پرتکلف چائے پر مدعو تھے، وہ خود تو موجود نہ تھے، مگر ان کے گھر والوں نے ہر طرح کی پذیرائی کی۔

جناب محمد امین بچہ صاحب اسی اثناء میں میرے سایہ بن کر رہے، بقرعید کا دن اپنی فیملی کے ساتھ ان ہی کی پھولوں سے لدی ہوئی اور نئی نویلی دلہن کی طرح سجی سجائی کوٹھی پر ان کے خاندان کے درمیان گذارا، یہاں ان کے بھائی جناب غلام نقشبند بھی آ گئے تھے، وہ اپنی باتوں سے بہت ہی مہذب اور شایستہ تھے، دن کے کھانے میں امین صاحب کا دسترخوان بھی بڑا پرتکلف تھا، مگر ان کے یہاں چیزیں وہی تھیں جو شمالی ہند کی دعوتوں میں ہوا کرتی ہیں، ہر چیز میں نفاست، ستھرائی اور خوش سلیقگی نظر آئی، امین صاحب کو فارسی زبان کے بلند پایہ شعراء کا کلام بکثرت یاد ہے، وہ چاہیں تو دیر تک فارسی اشعار میں گفتگو کر سکتے ہیں، ان کے اس وصف سے برابر

گفتگو ہوتا رہا، وہ اقبال کے بڑے شیدائی ہیں، کشمیر کے علمی حلقہ میں تو اقبال چھائے ہوئے ہیں، جمعہ کی رات کو کھانا محمد امین صاحب کے داماد جناب محمد یعقوب قریشی کی طرف سے تھا، اس میں میرے ذوق کی ساری چیزیں تھیں، البتہ دوسرے دن جناب محمد امین صاحب بچو کے سمدھی جناب پیر غلام حسین کے یہاں وازدان پر مدعو کیا گیا، تو ایک بار پھر اس کی مختلف چیزوں کو کھانا آسان نہ تھا، یہاں ان کے بھائی جناب میر غلام حسن سے بھی ملاقات رہی جو پرانے علیگ ہیں، اور ڈپٹی کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، ان کے لڑکے امریکہ میں ہیں، ہم لوگوں کا موضوع زیادہ تر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ رہا، کیونکہ اس میں اور مدعوین علیگ ہی تھے، محمد امین صاحب کے بھائی جناب غلام نقشبند (ایم۔ ایس۔ سی) بھی اس دعوت میں تھے، جنھوں نے علی گڑھ کے بہت سے واقعات دہرا کر گفتگو کو دلچسپ بنایا۔

کشمیر میں دو جمعہ کی نمازیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ایک تو جناب امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی خانقاہ معلی کی مسجد میں پڑھی، جو ہر طرح مرصع اور مزین تھی، اس کی دیواروں پر پوری صنعت گری کے ساتھ قرآنی آیتیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کے اسمائے مبارک وغیرہ کی خطاطی سے آنکھیں روشن ہوئیں، یہاں تین بجے نماز کی جماعت کھڑی ہوتی ہے، اس سے تقریباً دو گھنٹے پہلے ایک قاری صاحب کلام پاک کی مختلف سورتیں، نعتیں، منقبتیں اور دعائیں پڑھ کر مصلیوں کے قلوب کو روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو نعت یا منقبت قاری صاحب پڑھتے، اس کو ان کے سامعین دہراتے، جس سے معلوم ہوتا کہ یہ ان سب کے ورد زبان ہیں، بعض مصلیوں کو روتے ہوئے بھی پایا، قاری صاحب کوئی دعا پڑھتے تو کچھ لوگوں کے ہاتھ والہانہ انداز سے اٹھ جاتے، جیسے وہ دعاؤں کی برکتوں کو سمیٹ رہے ہیں، ایسی پر کیف اور باوقار نماز جمعہ کہیں اور نہیں پڑھی، امام صاحب نے جمعہ کا خطبہ پڑھنا

شروع کیا تو تمام مصلیوں نے تحریمہ باندھ لیا، نظریں اسی طرح نیچی کیے رہے جیسے اپنی نمازوں میں کرتے ہیں، دوسرے خطبہ میں تحریمہ نہیں باندھا، دعائیں رسمی طور پر نہیں مانگی گئیں، دیر تک خضوع و خشوع کے ساتھ جاری رہیں، ایسی نمازوں سے خاص قسم کی کیفیت کا طاری ہونا لازمی ہے، مسجد کے بغل میں جناب امیر ہمدانی کا حجرہ ہے، جس کے سامنے کھڑے ہوکر مصلی فاتحہ پڑھتے ہیں۔

شالیمار، نشاط باغ، چشمۂ شاہی، ڈل جھیل اور گل مرگ وغیرہ کی بھی سیر کی، جہاں لیا، جامی کا یہ شعر ذہن پر چھایا رہا ؎

مقامِ خوب رویاں آں زمین است
بخوبی رشکِ فردوس زمین است

جناب محمد امین بچھ کی مساعی سے کشمیر میں دارالمصنفین کی مطبوعات کے سول ایجنٹ جناب شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجر کتب، ایکسچینج روڈ، گاؤ کدل، سرینگر بنائے گئے، کشمیر کے جو لوگ دارالمصنفین کی مطبوعات خریدنا چاہیں، ان کے یہاں سے طلب کر سکتے ہیں۔

سری نگر میں اردو اخبارات پڑھنے کا بھی موقع ملا، یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اب وہاں سے یہ انگریزی اخبارات کے سائز میں اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، وہاں کا روزنامہ اخبار آفتاب کئی روز پڑھا، معلوم ہوا کہ اس کی اشاعت بیس ہزار سے زیادہ ہے، امید ہے کہ اردو کی اخبار نویسی اور صحافت نگاری میں کشمیر کے اردو روزنامے اہم رول ادا کریں گے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ فلسفۂ خودی :۔ مرتبہ جناب نشور واحدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت ۳ روپیہ، پتہ: نیاز احمد واحدی ۱۰۹/۱۰۰ بیکن گنج، کانپور۔

جناب نشور واحدی ایک ممتاز شاعر ہیں، اب انھوں نے نثر کی مملکت میں بھی قدم رکھا ہے، یہ غالباً ان کی پہلی نثری تصنیف ہے، اس میں فلسفۂ خودی کی تاریخ بیان کی گئی ہے، مقدمہ میں خودی یا انا کی اہمیت دکھائی ہے جو شعور، خودشناسی اور عرفانِ ذات کے مترادف ہے، اصل کتاب خودی کے متعلق اربابِ فکر و دانش کے افکار و نظریات اور تصورات و اشارات کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے، اس کے ۲ حصے ہیں، ایک میں عرب و عجم کے نظریاتِ خودی پیش کئے گئے ہیں اور دوسرے میں ہندوستان کے مسلم مفکرین کے افکار بیان کیے گئے ہیں، سب سے پہلے قرآن مجید سے انسانی عظمت و کرامت اور عبدیت کو پیش کرکے خودی کی اہمیت واضح کی ہے، پھر رموزِ انا کی تفسیر میں نامور صوفیہ و مشائخ کے اقوال کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں خواجہ حسن بصریؒ، سلطان ابراہیم ادہمؒ، ذوالنون مصریؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، شیخ شبلیؒ اور منصور حلاج کے نظریاتِ خودی پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، پھر حکمائے اسلام کے ارشادات اور فلسفیانہ افکار کی روشنی میں تاریخ خودی بیان کی ہے، اس ضمن میں حکمائے یونان سقراط، افلاطون، ارسطو اور فلاطینس کا ذکر بھی آگیا ہے، اور مسلمانوں کے فرقہ معتزلہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے الگ الگ اسکولوں کی نشاندہی کرکے فارابی، ابن مسکویہ، بوعلی سینا، امام غزالی، خیام، حکیم سنائی، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ابن رشد، شہاب الدین مقتول اور شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریۂ خودی کا ذکر ہے، عجمی مفکرین کے نظریۂ خودی اور فلسفۂ عشق کے متعلق معلومات تحریر کرتے ہوئے حکیم نظامی، شیخ عطار، مولانا روم، شیخ سعدی، امام ابن تیمیہ، خواجہ محمد بہاء الدین نقشبندیؒ، حافظ شیرازیؒ

ابن خلدون، شیخ عبدالکریم جیلی، مولانا جامی، جمال الدین افغانی، اور نطشے وغیرہ کے نظریات خودی پیش کئے ہیں، دوسرے حصہ میں ہندوستان کے حضرت مجدد الف ثانی، بیدل عظیم آبادی، شاہ نیاز احمد، مرزا غالب اور ڈاکٹر اقبال کے نظریۂ خودی کی وضاحت ہے، لائق مصنف نے خودی کے متعلق ان سب مفکرین کے منتشر خیالات اس طرح یکجا کیے ہیں کہ فلسفۂ خودی کی ایک مرتب تاریخ ہو گئی ہے، جو اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، لیکن ان کی ہر بات اور تمام نتائج سے سب کا اتفاق ضروری نہیں ہے، حوالے عموماً ثانوی اور ثانوی ماخذ کے دئے گئے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں "سب سے پہلے تفسیر ابن کثیر سے ایک عبارت نقل کی جا رہی ہے" (صفحہ ۱۲) لیکن یہ عبارت درج نہیں ہے، صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں، "مولانا مودودی نے جو دور جدید کے تصور عبادت کے معمار ہیں،" معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ کتابت وطباعت کے اغلاط بکثرت ہیں، ص ۲۰ پر عرفت کا ر بالکسر لکھ گیا ہے، صحیح بالفتح ہے، ص ۹۰ پر سن کو حسن لکھا ہے، امام ابن تیمیہ کا نام کئی جگہ صرف تیمیہ ہی درج ہے،

مغربی تمدن کی ایک جھلک

از ترجمۂ مولانا روشن علی صاحب پرنسپل منصبیہ عربک کالج تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۹۶ قیمت ۱۲ روپیے، ناشر منصبیہ عربک کالج، میرٹھ،

یہ کتاب ایک ایرانی مصنف سید مجتبیٰ موسوی کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں مغربی تمدن کی جھلک دکھائی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں اسلام کا ذکر ہے، شروع میں مصنف نے مغربی تمدن کی ترقی اور اسکی خوبی کا اعتراف کیا ہے کہ اس کی وجہ سے زندگی کے مختلف شعبوں میں گوناگوں سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں اس کا دوسرا رخ پیش کرکے تہذیب، معاشرت، سیاست اور تمدن کی خرابیاں دکھائی ہیں اور اخلاقی، روحانی، مذہبی زوال وانحطاط کا حال تحریر کیا ہے، انھوں نے مغربی زندگی کا یہ تضاد بھی بتایا ہے کہ کچھ لوگوں کو ہر قسم کی شان وفراغت میسر ہے، مگر کچھ ...... لوگ نان جویں کے محتاج ہیں، ایک طرف کتوں اور بلیوں سے محبت کی جاتی ہے، مگر دوسری طرف انسانوں میں فرط محبت اور دوستانہ روابط کی کمی ہے، اور والدین اپنے بچوں کی

پرورش بھی نہیں کرتے، معاشرتی خرابیوں کے ضمن میں نسلی امتیاز، گورے کالے کے فرق، گھریلو اور شہری زندگی کی تلخی، زوجین میں الفت و محبت کے فقدان، طلاق کی بہ کثرت رواج، فواحش و منکرات کے فروغ، ملک بعد اپنی ہتھیا، ایجاد کرنے وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے کلیسا کے مظالم، عیسائیوں کے تصور و طریقہ عبادت کی کی خامیوں اور عبادت گاہوں کو بھی رقص و سرود اور لطف و تفریح کی جگہ بنا لینے کا ذکر کیا ہے اور عیسائی مذہب کی ترقی و اشاعت، عیسائی مشنریوں کی بے نظیر تبلیغی مساعی، مذہب اسلام کے خلاف ان کے زبردست پروپگنڈے اور مسلمانوں کی تبلیغ و اشاعت دین سے غفلت کا افسوس کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، مگر اس کے باوجود اسلام کی مقبولیت میں اضافہ اور افریقہ میں اس کی ترقی کے امکانات بھی دکھائے ہیں، دوسرے حصہ میں دنیا کی موجودہ مشکلات کا حل اسلام کو بتا دیا گیا ہے، اور مغربی مفکرین کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ ان کے تمدن کی اچھی چیزوں میں اسلامی اثرات و نقوش کی چھاپ ہے، جس زمانہ میں مغربی قومیں نیم وحشی تھیں اس وقت مسلمانوں نے علوم و فنون کو ترقی کی معراج پر پہنچا دیا تھا، اور طبقہ واریت اور نسلی امتیاز کے خاتمہ اور معاشرتی اصلاح کے بارہ میں اسلام کے اصول و آئین بتائے ہیں، اس سلسلہ میں عورتوں کے حقوق، ناگزیر حالات میں طلاق و تعدد ازدواج کی ضرورت واضح کی ہے، مصنف نے جہاد کی حقیقت و غرض بھی بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ اس کا مقصد وحشت و بربریت اور قتل و غارت گری اقوام نہیں ہے، اردو میں اس موضوع پر بعض کتابیں پہلے سے موجود ہیں، یہ کتاب بھی اچھی ہے، لیکن اسلامی تاریخ کے واقعات بطور مثال پیش کرتے ہوئے صرف حضرت علیؓ اور عباسی خلیفہ مامون کے دور کے واقعات ہی منتخب کئے گئے ہیں، ایک جگہ دور فاروقی کے واقعات نقل کئے ہیں، مگر حضرت عمر فاروقؓ کا نام نہیں آنے دیا ہے، ایک حقیقت پسند مصنف کو فرقہ و مسلک کے اختلاف سے بالاتر اور اس قسم کی عصبیت سے خالی ہونا چاہئے، متعہ کے جواز اور محاسن کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس مختصر تبصرہ میں اس کی تردید کی گنجائش نہیں، لیکن اس کی حرمت کو صرف حضرت عمرؓ کی فاقی رائے قرار دینا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے، ترجمہ میں زبان و بیان کی فرو گذاشتیں رہ گئی ہیں، عبارت میں کہیں بیانی حشو و زوائد اور لفاظی کے علاوہ جملوں کا دروبست بھی ٹھیک نہیں ہے، کہیں تو ہوبہو نقل اور نامانوس الفاظ استعمال

نمبر ۶ جلد ۱۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت بیس روپے سالانہ

دار المصنفین اعظم گڈھ

.....

دارالمصنفین کی نئی کتاب

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

غالب کی زندگی سے ۱۹۶۹ء تک غالب کی مدح و قدح میں لکھا گیا ہے، اس کا پوری دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس پر ناقدانہ [illegible] کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں،

حصہ اول	حصہ دوم
اس میں مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۵ء تک اُن کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے،	اس میں مرزا غالب کی حمایت و مخالفت میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۶۹ء تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے

قیمت [illegible]

[illegible]

سید صباح الدین عبدالرحمن

ماہ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۱ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات

دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر جناب ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی استاذ شعبۂ عربی و فارسی [illegible] نے بڑی محنت سے یہ [illegible] معلومات کتاب لکھی ہے [illegible] تقسیم کیا ہے، یہ اپنے موضوع پر اب تک اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی اور منفرد کتاب ہے جس کا انتساب فاضل مصنف نے اپنے مربی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے نام کیا ہے۔ قیمت :- ۳۰ روپیے،

"ضیاء"

شذرات

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے سلسلہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بے شمار لوگوں کی پیشانیاں اوقاتِ سحر شب بسجود ہوئیں جن کی یہ دعائیں تھیں کہ "خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظِ مسلم کا ذریعہ پیدا کر" حاجی امداد اللہ مہاجر مکی خوش تھے کہ یہ دارالعلوم ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔

یہاں جو تعلیمی نظام قائم ہوا، اس سے دینی و روحانی تربیت کا ایک عمدہ سانچہ بن گیا جس میں ڈھل کر نکلنے والوں میں اعتقادی و عملی اور ظاہری و باطنی عناصر کا ایک ایسا امتزاج دیکھنے میں آیا کہ ابنائے دارالعلوم فخر سے کہنے لگے کہ اس کی مثال ہندوستان تو ہندوستان شاید بیرونِ ہند کے کسی اسلامی ملک میں آسانی سے نہیں مل سکتی، مگر اسی شہرۂ آفاق ادارہ میں وہاں کے موجودہ علماء میں جو باہمی لااعتباری، بے مقداری، آبروریزی، الزام تراشی، بہتان طرازی، عیب جوئی اور ہرزہ سرائی کے نمونے برسرِ عام آرہے ہیں اس سے اس برصغیر کے مسلمانوں کی گردنیں ندامت اور ذلت سے جھکی ہوئی ہیں۔

وہاں کے اختلافات میں کون فریق حق پر ہے اور کون نہیں ہے، اس پر فیصلہ کرنے کا وقت شاید ابھی نہ آیا ہو لیکن تماشائی کو یہ کہنے کا حق حاصل ہو گیا ہے کہ جب تک یہ خدمت اور ایثار کا مرکز تھا تو اپنی مالی تنگی اور صبر آزما عسرت کے باوجود سارے برصغیر کے مسلمانوں کے ذہن کا محور رہا، اہرامِ مصر، قصرِ شیریں اور لال قلعہ بنا رہا، اس سے [illegible] اور انبساط آمیز عقیدت کا اظہار اس کے صد سالہ جشن کے موقع پر [illegible] میں ہوا، ایک بے پناہ ہجوم نے اپنی محبوب اور مایہ ناز درسگاہ کی عظمت و جلالت کے غیر فانی پیکر کو اپنی مذہبی شان، اور سرشارانہ محبت کا خراج پہنچایا، اس پر مختلف گوشوں سے دولت کی ایسی بارش ہوئی کہ اس کے خزانہ میں اتنا بڑا سرمایہ جمع ہو گیا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔

مگر اس جشن کے بعد ہی وہاں جو اختلافِ مذموم کا آغاز ہوا تو یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی کہ اس سحرگاہی دعاؤں کے

ثمرہ کے احاطہ میں دولت آئی تو اس کے پیچھے دنیا کی برائی بھی آئی، حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے عہد کا یہ سبق آموز واقعہ ہے کہ سنہ [illegible] میں جلولا فتح ہوا تو بہت کثرت سے مال غنیمت ہاتھ آیا، اس میں سے پانچواں حصہ مدینہ منورہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھیجا گیا تو مسجد نبوی میں اس کا ڈھیر لگا دیا گیا، شام ہو چکی تھی اس لیے اس کی تقسیم نہیں ہو سکی، اس پر چادر ڈال دی گئی، رات بھر پہرہ پڑا، صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ تشریف لائے، مجمع عام میں چادر ہٹائی گئی، درہم و دینار کے انبار اور جواہرات پڑے تھے حضرت عمرؓ ان کو دیکھ کر بے ساختہ رو پڑے، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ رونے کا کیا محل ہے؟ فرمایا کہ جہاں دولت کا قدم آتا ہے وہاں رشک بھی آتا ہے اور حسد بھی۔

رشک اور حسد عموماً بدگمانی سے پیدا ہوتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق شیطان بن کر انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتی ہے، مگر ہماری تاریخ میں علمائے ربانی کی ایک کثیر جماعت ایسی بھی رہی ہے جنھوں نے رشک و حسد سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کی مذہبی، ملی اور معاشرتی زندگی سنواری ہے، ابراہیم بن یزید تیمی بڑے جلیل القدر تابعی تھے، ان کا مسلک ان ہی کے قول کے مطابق یہ تھا کہ میں آسمان سے منہ کے بل گرنا پسند کرتا ہوں مگر یہ گوارا نہیں کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کا سوء ظن رکھوں۔ حضرت جعفر صادقؓ کی رگوں میں صدیقیت کا بھی خون تھا، فرماتے کہ جب تمہارے بھائی کی جانب سے تمہارے لیے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لیے ایک سے ستر تک تاویلیں تلاش کرو، اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کی کوئی تاویل ضرور ہوگی جس کا تم کو علم نہیں، حضرت عمرؓ نے یہی فرمایا کہ اگر تم کسی مسلمان کا کوئی کلمہ سنو تو اس کو بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو، جب وہ محمول نہ ہو تو اپنے نفس کی ملامت کرو۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے کارکنان اپنے اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو ان کو مشہور تابعی حضرت مطرف بن عبداللہ کے اس قول کی تائید کرنی ہوگی کہ فتنہ رہبری اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ مومن کو اس کے نفس سے لڑا دینے کے لیے ہے [illegible] کا نفس [illegible] کو اس کا زیب دیتا ہے [illegible] برباد کر دینا ہے وہ شرک ہے [illegible] نفس کو [illegible] اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں [illegible] برباد کر [illegible]

[illegible]

مدرسہ تباہی کے دہانے میں نہیں آگیا ہے؟ دونوں فریقین بزبان حال یہ کہہ رہا ہے ؎

آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے مجھ کو کیا خراب　　دل یہ کہے کہ آنکھوں نے مجھ کو ڈبو دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے درد عشق میں　　دونوں کی ضد نے مجھ کو بلا میں ڈبو دیا

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کی وفات پر سرسید احمد خاںؒ نے لکھا تھا کہ ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی ناراضی یا خوشی کا ہو کسی طرح نفسانیت یا ضد و عداوت پر محمول نہیں کرسکتے ان کے تمام کام اور افعال بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کیلئے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا اور خوش ہونا بھی خدا کے واسطے تھا کسی شخص کو وہ اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ جسے برا کہتے یا بات کہتا ہے خدا کے واسطے برا جانتے تھے مسئلہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا خاص آدمی تھا ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی تھیں۔"

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) کی تعلیم یہ تھی کہ کسی کو اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہئے حب جاہ نہایت برباد کرنے والی چیز ہے یہاں تک لکھا ہے کہ صوفیہ فرماتے ہیں میرے بھائی نفس بڑا عدو انسانی ہے اس کے مکر و فریب سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے ہم لوگوں سے اپنی قلبی اور نفسانی شرارتوں کو چھپا سکتے ہیں مگر جس سے کچھ چھپا ہوا نہیں اس سے نہیں چھپا سکتے۔ (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ صفحہ ۲۹۰)

دارالعلوم دیوبند کے علماء کیلئے اب بھی موقع ہے کہ وہ اسلاف کا اسوۂ حسنہ اختیار کریں ورنہ ان پر علماء سوء اور دنیادار علماء کا الزام ہے کہ جن سے گذشتہ تاریخ میں ہمارے مذہبی اور ملی معاشرہ کو بڑا نقصان پہونچا ہے۔ ایک مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ سے حجاج بن یوسف نے پوچھا کہ مسلمانوں کی ہلاکت کس بات سے ہوگی؟ فرمایا کہ ان کے علماء کے ہاتھوں۔ علماء سے ان کی مراد دنیادار علماء تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ مخلوقات کی خرابی علماء سوء کی وجہ سے ہے اور دین کی بربادی انہی سے وابستہ ہے دنیا کا فساد بھی ان ہی کی بدولت ہے۔ بہترین خلائق علماء ہیں اور بدترین خلائق بھی علماء ہیں تمام دنیا کی ہدایت اور گمراہی ان ہی پر موقوف ہے۔ حضرت مجددؒ کے خیال میں علماء کیلئے دنیا کی محبت اور رغبت ان کی جبین پر بدنما داغ ہے وہ علماء کو پارس پتھر کی طرح دیکھنا چاہتے تھے کہ اگر دنیا بھی اس سے مس ہو جائے تو سونا ہو جاتا ہے۔

اس برصغیر کے مسلمان دارالعلوم دیوبند کے جھگڑے کو دور دیکھنے کے منتظر ہیں [illegible] جس [illegible] دارالعلوم دیوبند کے جھگڑے کا [illegible]

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۵)

دار المصنفین کی بزم میں شرکت کی دعوت

میں جامعہ میں مشکل سے چھ مہینے رہا کہ سید صاحبؒ نے مجھ کو دار المصنفین طلب کر لیا اور ایک خط میں تحریر فرمایا کہ دار المصنفین میں تاریخ ہند پر کام شروع کر دیا گیا ہے، تم کو تاریخ ہند سے دلچسپی رہی ہے، تم پسند کرو تو یہاں آجاؤ اور تاریخ ہند پر کاموں میں حصہ لو، یہ پورا خط مقالات سلیمان جلد اول ص ۱۲ پر چھپ گیا ہے۔

دار المصنفین میرا ذہنی کعبہ بنا ہوا تھا، میں جنوری ۱۹۳۹ء میں وہاں پہونچ گیا، میں نے شروع میں خود ہی یہاں سے کوئی ماہانہ تنخواہ لینا پسند نہیں کیا، کیونکہ ابھی صحت کی خرابی کی وجہ سے ایم۔ اے نہ ہونے کی کھٹک باقی تھی، اور جلد از جلد یہ ڈگری حاصل کرنے کی فکر میں تھا، یہ خیال بھی غالب رہا کہ میں یہاں کے کام کے لائق بن بھی سکوں گا یا نہیں، اس زمانہ میں دار المصنفین میں تاریخ ہند کی تدوین اور ترتیب کی اسکیم نے زور و شور سے جگہ پائی تھی، خیال تھا کہ یہ پندرہ جلدوں میں لکھی جائے گی، مولانا عبد السلام ندوی کو ایک جلد لکھنے کے لیے دی گئی تھی، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی بھی اس سلسلہ میں دار المصنفین بلا لیے گئے

اور وہ تاریخ سندھ لکھ رہے تھے، سید صاحب نے مجھ کو بھی تاریخ ہند کے کام میں لگایا اور میرے لیے ایک سخت موضوع کا انتخاب کیا، یہ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا فوجی نظام" تھا، موضوع سنتے ہی پسینہ آگیا، مگر ان کا اصرار تھا کہ میں اس پر پوری محنت کروں، ان کی پوری علمی زندگی محنت شاقہ پر مبنی تھی، اس لیے اپنے شاگردوں میں وہی محنت اور ریاضت دیکھنا پسند کرتے تھے، ان کے یہاں اس راہ میں تن آسانی اور سہل انگاری علمی جرم کی حیثیت رکھتی تھی، وہ خود محنت کرتے کرتے محلول ہو چکے تھے، ان کا جسم روئی کی طرح ہو گیا تھا، اس کو چھونے سے معلوم ہوتا کہ اس میں ہڈی باقی نہیں رہ گئی ہے، اس محنت کی بدولت ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی، خدا جانے کن کن امراض میں مبتلا ہوئے،

معارف کی مضمون نگاری

اب میں اپنے کو دار المصنفین کے معیار کے مطابق بنانے میں لگ گیا، اس میں جناب شاہ معین الدین احمد ندویؒ بہت معاون ہوئے، حضرت سید صاحبؒ کی ذات گرامی کی خوبی یہ تھی کہ ان کی لکھنے کی میز پر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو معلوم ہوتا کہ ان کے آفتاب علم کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، ذہن اور ادراک دونوں پر علم کی چاندنی پھیل رہی ہے، وہ اپنی علمی و ادبی رہنمائی کے سلسلہ میں صرف دو جملے کہہ دیتے تو ساری چیزیں روشن اور منقح ہو جاتیں، علم کے بند دریچے خود بخود کھل جاتے، ان کے سامنے کوئی تحریر پیش کی جاتی تو اس کو یا تو پسند کر لیتے یا رد کر دیتے، یا ضروری ہدایات دے کر پھر سے لکھنے کو کہتے، مگر ان کو کاٹ پیٹ کر موادیا زبان کو درست کرنے کی فرصت نہ ملتی، اپنی تحریروں کو تو مسلسل کاٹ چھانٹ کرتے رہتے، یہاں تک کہ کاتب کو پڑھنے میں دقت ہوتی، اسی لیے بعض اوقات کسی خوشنویس سے اپنا مسودہ صاف کراتے، اور جب وہ صاف ہو کر سامنے آتا تو مزید کاٹ چھانٹ کرنے لگتے، فرماتے کہ اپنے صاف مسودہ کی تحریروں کو کاٹ پیٹ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے، مگر دوسروں کے مسودے کاٹنے پیٹنے میں بار خاطر محسوس کرتے، صرف اتنا کہہ کر واپس کر دیتے کہ زبان ٹھیک نہیں ہے، مواد کی کمی کی وجہ سے ہلکا ہے، اتنا کہہ دینا کافی ہوتا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کو شگفتہ اور فصیح زبان لکھنے میں بڑی قدرت تھی، مگر وہ دوسروں کی زبان کو درست کرنے سے گریز کرتے، صاف کہہ دیتے کہ یہ کام ان سے نہ ہوگا، دارالمصنفین میں یہ کام صرف شاہ صاحب انجام دیتے، ان کو زبان درست کرنے کا بڑا ملکہ تھا، بلکہ فطری ذوق تھا، خود بہت اچھی، سلیس اور رواں زبان لکھتے، دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے، کسی کی بھی تحریر ہوتی، اگر ان کے ذوق کے مطابق نہ ہوتی تو ان کا قلم ضرور چل جاتا، وہ اس کو گوارا نہ کرتے کہ تحریر میں زبان اچھی نہ ہو، میں دارالمصنفین آیا تو ان کے اس وصف سے پورا فائدہ اٹھایا۔ معارف کے لئے کوئی بھی تحریر لکھتا تو ان کو ضرور دکھاتا،

شروع میں تو میں دارالمصنفین کی صحبت میں بے تکلف نہیں رہا، لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں سے قریب تر ہوتا گیا، کھانے، ناشتے اور سہ پہر کی چائے کی اجتماعی صحبت جاری تھی، سید صاحبؒ کی اصلی علمی مجلس عموماً سہ پہر کی چائے پر ہوتی، ان کے انداز بیان میں کچھ ایسی نکتہ آفرینی اور دیدہ وری ہوتی کہ اس سے بڑی علمی بصیرت حاصل ہوتی رہتی، ان کی گفتگو کی جیسی لذت کسی اور علمی مجلس میں نہیں ملی، بڑے بڑے علماء اور فضلاء کی گفتگو سنی، مگر انکی باتوں سے جس طرح لذت آشنا ہوتا رہا، کسی اور سے نہیں ہوا، خدا جانے علم کی کتنی گتھیاں ان کی باتوں سے کھلتی اور سلجھتی رہیں،

اس مجلس سے اٹھنے کے بعد پھر بڑی بے تکلفی رہتی، عزیز صاحب، شاہ صاحب اور نیاز احمد صدیقی صاحب دارالمصنفین ہی میں رہتے، بشیر احمد صدیقی صاحب تقریباً روزانہ شام کو آجاتے، مولانا عزیز الرحمن شبلی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے، کانپور سے فاضل الٰہیات تھے، وہ بھی ہفتہ میں کئی بار دارالمصنفین آجاتے، یاد ش بخیر جناب حاجی عبدالغفور خستہ شہر میں رہتے تو صبح کے ناشتے میں ضرور شریک ہوتے رہتے، پھر شام کو بھی کبھی آجاتے، بالکل ان پڑھ تھے، لیکن جناب نیاز احمد صدیقی نے اپنی تفریحی باتوں سے ان کو شاعر بنا دیا، ان کا کوئی مصرع یا شعر درست نہ ہوتا، مگر ان کو اپنی تک بندی سے اتنی خوش فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ دارالمصنفین کے معزز مہمانوں کے سامنے بھی اپنا راگ ضرور الاپتے، اور داد کے طلبگار ہوتے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے

جناب رشید احمد صدیقی دارالمصنفین آئے تو حاجی صاحب نے ان کو اپنا پورا کلام سنایا، رشید صاحب کو اپنے طنز و مزاح کے لیے ایک اچھا موضوع مل گیا، اور ان پر ایک مضمون لکھنے کو تو لکھ گئے، مگر حاجی صاحب کے لیے ان ہی کی رائے کے مطابق یہ سند ان کو زندۂ جاوید بنانے میں کام آ گئی، آخر میں وہ اس کے بھی متوقع رہے کہ جب ان کے کلام کا مجموعہ شایع ہوگا تو حضرت سید صاحبؒ نے جس طرح جگر مرادآبادی پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اسی طرح ان پر بھی ایک عمدہ تحریر لکھیں گے، حاجی صاحب شاہ صاحب کی بھی مجلسوں میں برابر شریک رہتے۔ آخر وقت تک صبح کا ناشتہ ان ہی کے ساتھ کرتے رہے،

ارکان صحبت | سن کے اعتبار سے بشیر احمد صدیقی صاحب سب سے بڑے تھے، نیاز احمد صدیقی صاحب اور عزیز صاحب ہمسن تھے، سب سے چھوٹے شاہ صاحب تھے، مگر میر مجلس وہی ہو جاتے، بشیر احمد صدیقی صاحب شبلی اسکول کے بہت ہی کامیاب ہیڈ ماسٹر تھے، ان کی تشرع داڑھی ان کے گورے اور روشن چہرے پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی، بڑے مجلسی آدمی تھے، آواز اچھی تھی، کبھی کبھی گایا بھی کرتے، شہر کے حکام سے تعلق پیدا کرنے میں بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے، اسکول میں ان کی وجہ سے گورنر تک مدعو ہوئے، جس سے اسکول کی مقامی شہرت بڑھتی گئی، ان کی مساعی جمیلہ سے یہ اسکول ڈگری کالج ہو گیا، یہاں سے وہ پاکستان چلے گئے، کراچی میں محکمۂ تعلیم میں اچھے اچھے عہدوں پر رہ کر ریٹائر ہوئے تو کئی ڈگری کالجوں کو چلاتے رہے، دسمبر ۱۹۷۵ء میں کراچی میں وفات پائی۔

نیاز احمد صدیقی صاحب کی فروتنی، خدمت گذاری اور خاکساری سے سب ہی متاثر تھے، یہاں تک کبھی کبھی لوگوں کو خیال ہو جاتا کہ بعض صحابۂ کرام بھی ایسے ہی رہے ہوں گے، ان کی اصابت رائے کے سب ہی قائل تھے، وہ شبلی کالج سے جونپور محمد حسن انٹر کالج کے پرنسپل ہو کر چلے گئے تھے اللہ کے فضل و کرم سے ابھی تک بقید حیات ہیں، اب اپنے گھر مڑیا ہو میں پنشن پاکر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عزیز صاحب اپنی سنجیدگی کے لیے پسند کیے جاتے، بہت کم ہی باتیں کرتے، دارالمصنفین میں آٹھ سال رہ کر مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ

میں لکچرار ہوکر چلے گئے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد کراچی چلے گئے، وہ فضل الٰہی سے اب تک بقید حیات ہیں، ان کی تاریخ دولت عثمانیہ دارالمصنفین کی مقبول کتابوں میں ہے، مسلم یونیورسٹی میں رہ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، ان کے مقالہ کا عنوان تھا "اردو زبان میں غیر مسلم مذاہب کے لٹریچر"، مولوی عزیز الرحمٰن شاہ صاحبؒ کی آخر زندگی تک یہاں آتے رہے، اور جب ان کی حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات ہوئی تو وہ اس وقت ان ہی کے پاس موجود تھے، اور ان ہی کی گود میں اللہ کو پیارے ہوئے، یہ تمام حضرات دارالمصنفین کی شام کی مجلس میں شریک ہوجاتے تو پھر بڑی دلچسپی رہتی، شاہ صاحب اس بزم مجلس میں اپنے قہقہوں سے جان پیدا کیے چھائے رہتے، گفتگو زیادہ تر دوسرے کرتے، وہ صرف داد دیتے جس سے اندازہ کچھ ایسا ہوتا کہ اسی کی خاطر ان کے پاس لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے، اس میں علمی گفتگو کم ہوتی، زیادہ تر تفریحی رنگ ہوتا، جس سے دن بھر کے علمی کام کے بعد تازگی پیدا ہوجاتی، سیاست پر بھی گفتگو چل نکلتی، اخبار کی تازہ خبروں کے ساتھ گرما گرمی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مونجے وغیرہ سب ہی موضوع بن جاتے، پنڈت جواہر لال کی محبوبیت پر ہم سب متفق تھے، اس وقت ان کا طوطی بولتا تھا، تمام مسلمانوں کو ان کی مخلصانہ سیاست پر اعتماد کلی تھا، اس زمانہ میں ہم میں سے کسی کو بھی خیال نہ تھا کہ سیاست کا رخ کچھ ایسا بدل جائیگا کہ تقسیم ہند ناگزیر ہوجائے گی، مولانا عبد السلام ندوی کو ان مجلسوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی، وہ ان اوقات میں شہر کے بازاروں، چوراہوں اور گلیوں میں دکھائی دیتے، جو ان کی نظروں میں خوب سے خوب تر تھیں، وہ جب کبھی ان مجلسوں میں شریک ہوجاتے تو اپنی گلگشت مستانہ ہی کی روداد سناتے، جس کو سن کر مجلس زعفران زار ہوجاتی، ان مجلسوں میں شاہ صاحبؒ ہی کا حکم چلتا، کوئی موضوع طویل ہوجاتا تو اپنی پاٹ دار آواز سے اس کو روک دیتے اور سب اس حکم کی تعمیل کرتے، اس سے ان کی محبوبیت کا اندازہ ہوتا، شاہ صاحبؒ نیاز احمد صدیقی صاحب کو بہت عزیز رکھتے، دونوں سولہ سال تک ایک ساتھ

رہے، نیاز صاحب بھی ان کی بڑی عزت کرتے، سید صاحبؒ کی وفات کے بعد وہ شاہ صاحبؒ سے مخلصانہ کسی اور کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس صحبت میں مگل اور جھوکو شہر کے ممتاز طبیب حکیم محمد آسحق صاحب بھی شریک ہوتے

اس بے تکلف مجلس میں مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی بھولے بھٹکے شریک ہوتے، وہ سید صاحبؒ کے سگے بھتیجے تھے، ان کے والد بزرگوار حکیم مولوی سید ابو حبیب صاحب بڑے ہی عابد اور زاہد بزرگ تھے، مجددیہ سلسلہ میں حضرت مولانا ابو احمد بھوپالی سے بیعت تھے، ان ہی سے روحانی تربیت پاتے رہے، سید صاحب سے اٹھارہ سال بڑے تھے، مولانا ابوظفر صاحب نے ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، مولانا عبدالباری ندوی ان کے ہم درس رہے، ان کی ملازمتوں کی داستان بڑی طویل ہے، ندوہ سے فارغ ہو کر کچھ دنوں ملتان میں رہے، پھر رنگون جا کر ایک عربی مدرسہ میں مدرس ہو گئے، وہاں برمی زبان سیکھی، برمی بول چال کے نام سے ایک کتاب لکھی، اپنا سفرنامہ برما بھی مرتب کیا، رنگون سے احمد آباد چلے آئے، جہاں گاندھی جی کے قائم کردہ کالج مہا ودیالیہ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، وہاں بڑی محنت سے تاریخ گجرات لکھی جو بعد میں ۱۹۵۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شایع ہوئی، ان ہی دنوں انھوں نے مرآۃ احمدی کا ترجمہ تاریخ ادبیات گجرات کے نام سے کیا، یہ ۱۹۳۲ء میں احمد آباد سے شایع ہوئی، احمد آباد سے مدراس چلے آئے تو وہ سیٹھ جمال کے جمالیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، وہاں سے جناب نواب علی وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ نے ان کو جوناگڈھ بلا لیا، جہاں ان سے علمی و مذہبی کام لیے گئے، یہاں کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے اردو کے مشہور اہل قلم اختر جوناگڈھی کے ساتھ مل کر ایک علمی رسالہ بھی شہاب کے نام سے نکالا، احمد آباد اور جوناگڈھ میں رہنے کی وجہ سے ان کو بوہروں کی تاریخ سے دلچسپی ہوئی تو بوہروں کے بعض اکابر کی فرمایش پر ان کی ایک تاریخ لکھی، جب یہ چھپ کر تیار ہوئی تو بوہروں کے کچھ فرقوں کو اس کے بعض حصوں پر اعتراض ہوا، اس لیے اس کی اشاعت روک دی گئی، وہاں سے دارالمصنفین آئے، تاریخ سندھ لکھنے کے لیے خاص طور پر بلائے گئے، مگر وہ اس شرط پر آئے کہ

ان کو دارالمصنفین کے احاطہ میں رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، وہ ندوہ میں مولانا مسعود علی ندوی سے اوپر درجہ میں تھے، مولانا مسعود علی کا احترام اس احاطہ میں جس طرح کیا جاتا وہ ان کے اقتضائے طبیعت کے خلاف تھا، اس لیے وہ شہر میں ایک مکان لے کر رہنے لگے، وقت پر کتب خانہ آتے اور وقت پر چلے جاتے، مولانا مسعود علی ندوی سے ملنا پسند نہ کرتے، شکل وجیہ پائی تھی، لباس بھی اچھا پہنتے، زلفی رکھتے، ٹوپی گول پہنتے، مولانا مسعود علی ان کو تفریحاً شہزادہ تاج الملوک کہا کرتے، مگر وہ مولانا مسعود علی کو لایقِ التفات نہ سمجھتے، جب دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ہم لوگوں کو ڈر لگا رہتا کہ دونوں میں اَن بَن نہ ہو جائے، مگر وہ شاہ صاحبؒ کے اخلاق کے معترف رہے، ان کی تحریروں کی ادبی شان کے مداح تھے، کہتے کہ ان سے تاریخ لکھانے کے بجائے ادبی کتابیں لکھانی چاہیے تھیں، جس محنت اور ریاضت سے وہ اپنی علمی چیزوں کو تیار کرتے، اس کے معترف شاہ صاحبؒ بھی رہے، کہتے کہ ان کے جسم کو کھرچو تو اس سے ہندوستان کی تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو کی صدا نکلے گی، دارالمصنفین کے قیام میں تاریخ سندھ لکھی، جو چھپ کر بہت مقبول ہوئی، معارف میں حسب ذیل مضامین بھی لکھے: (۱) ہندوستان میں توپ کا استعمال (۲) ہندوستان کے کتب خانے، (۳) ہندوستان میں کاغذ سازی (۴) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ڈاک کا انتظام، وہ کچھ دنوں کے بعد دارالمصنفین سے شانتی نکیتن چلے گئے، وہاں سے پھر اینگلو ورنیکولر سوسائٹی احمد آباد آگئے، جہاں رہ کر گجرات کی تمدنی تاریخ لکھی، جو دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے، ۱۹۵۰ء میں وفات پائی، شاہ صاحبؒ نے جولائی ۱۹۵۰ء کے معارف میں ان پر جو شذرات لکھے، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری جماعت کے ایک نامور رکن مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے انتقال کیا، ان سے دارالمصنفین کے گوناگوں تعلقات تھے، وہ ندوہ کے مشہور فاضل، نامور اہل قلم اور حضرت سید صاحب کے حقیقی بھتیجے تھے، دارالمصنفین میں کئی سال تک رہے تھے، ان کی پوری زندگی علم و تعلیم کی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گذری۔۔۔۔ علمی کمالات کے ساتھ بڑے دیندار، نیک نفس اور

سادہ مزاج تھے، علمی کاموں کے ساتھ کچھ دینی و ملی کام بھی کرتے رہتے تھے، حضرت سید صاحبؒ کے گھرانے میں وہ آخری علمی یادگار تھے، وفات کے وقت ستر سال کے قریب عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم و دین کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے ؎

راقم دارالمصنفین آنے کو تو آگیا، مگر یہاں ابھی پورے طور پر جم نہ سکا تھا، ایم۔ اے کرنے کی فکر تھی، ۱۹۳۶ء کے اکتوبر میں شادی بھی ہونے والی تھی، اس لیے پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ نہ دے سکا، میرے منجھلے چچا جناب سید قطب الدین صاحب مجھ کو اپنا فرزند سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے بڑے حوصلے کے ساتھ یہ شادی انجام دی اور خرچ کا کوئی خیال نہیں کیا، اس میں شرکت کے لیے سید صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ دیسنہ آئے، خیال تھا کہ دارالمصنفین کے اور لوگ بھی شرکت کریں گے، مگر صرف مولانا مسعود علی ندوی پہونچے، میں ان کا بیحد ممنون ہوا، شاہ صاحب اور عزیز صاحب بعض اسباب کی بنا پر نہ پہونچ سکے، دارالمصنفین میں میرے آنے کے کچھ ہی دنوں بعد یہ شادی ہوئی تھی، اس لیے ان لوگوں سے ابھی بہت قربت نہیں ہوا تھا، مولانا مسعود علی ندوی سید صاحبؒ کے وطن کی کشش کی وجہ سے بھی وہاں تشریف لائے، وہ پہونچے تو بلبل ہزار داستان بنے رہے، میرے ہم وطن اور اعزہ ان کی پُر لطف باتوں سے بہت محظوظ ہوئے، وہ بہار کی شادی کے رسم و رواج، گیت، راگ، ہاتھی، گھوڑے، لاؤ لشکر، باراتیوں کے ہجوم، جہیز میں سونے چاندی کے سامان کی فراوانی دیکھ کر متاثر ہوئے، دیسنہ کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اس بیجا اسراف پر بہت ہی دلچسپ انداز میں نکتہ چینیاں کیں، جو وہاں کے لوگوں کو پسند آئیں، وہاں سے رخصت ہوئے تو میرے اعزہ نے چاندی کے ظروف میں کھانے پینے کی بہت کچھ چیزیں ساتھ کر دیں، اعظم گڈھ واپس آکر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں شادی کا ذکر کرتے رہے، کہتے کہ ان کو تو معلوم ہوتا رہا کہ وہ جہانگیر آباد کے راجہ کے یہاں کی تقریب میں شرکت کر رہے ہیں، شاہ صاحبؒ کو بڑا افسوس رہا کہ وہ اس میں شریک نہ ہو سکے، جب وہ حیات سلیمان لکھ رہے تھے تو سید صاحبؒ کے وطن کا ذکر لکھتے وقت بار بار کہتے کہ

وہ میری شادی میں شریک ہو جاتے تو اس گاؤں کا ذکر کرنے میں ان کا قلم خوب چلتا۔

مولانا مسعود علی ندوی کا [illegible]

اس زمانہ میں دارالمصنفین کے اندر مولانا مسعود علی ندوی ہی کا طوطی بول رہا تھا، وہ تہجد کیلیے اٹھ جاتے، پھر کچھ وظائف پڑھ کر مسجد میں فجر کی نماز ادا کرتے، تھوڑی دیر تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے، اشراق پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے، کچھ دور ٹہلنے کے لیے جاتے، واپس آکر ناشتہ میں شریک ہوتے پھر چاشت کی نماز پڑھتے، اس کے بعد دس بجے دن تک تلاوت کلام پاک کرتے، اس سے فارغ ہو کر [illegible] بیٹھ جاتے اور اپنا دربار عام کرتے، شہر کے کچھ لوگ آجاتے، پھر ان کی گل فشانیاں شروع ہو جاتیں، پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ترک موالات کی تحریک میں کام کر چکے تھے، اس لیے ان دونوں کے نام ان کی نوک زبان ہوتے، بلا ناغہ اپنی مجلسوں میں ان کا ذکر کسی نہ کسی طرح لے آتے، ایک ہی بات کو طرح طرح سے ادا کرتے، سامعین روزانہ اسی بات کو سنتے، مگر ان کے بیان کرنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ ان کی باتوں میں باسی پن محسوس نہ ہوتا، ان کو فن تعمیر میں بڑا فطری ملکہ تھا، دارالمصنفین کی ساری عمارتیں ان ہی کی نفاست ذوق کی شاہد ہیں، اور یہی ان کی تصانیف ہیں، رہنے سہنے میں بھی ان کی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی رہتی، دعوتوں کا بڑا اچھا انتظام کرتے، دارالمصنفین کے اندر بات بات پر دعوت کراتے رہتے، وہ ۱۹۱۵ء میں اعظم گڈھ آئے تھے، اس وقت اس قصبہ کا معیار زندگی کچھ اونچا نہ تھا، اس لیے لوگ ان کی خوش سلیقگی سے متاثر ہو کر اعتراف کرتے رہے کہ ان ہی نے یہاں کے لوگوں کو رہنا سہنا سکھایا، اسی لیے ایک مدت تک شہر کے بے تاج بادشاہ بھی بنے رہے، جب شہر میں نکلتے تو کچھ لوگ ان کے آگے پیچھے ضرور رہتے، رمضان شریف میں ایک ایک روز اپنے مخصوص ملنے والوں کے یہاں افطار کی دعوت کراتے، اس طرح پورا مہینہ دعوتوں میں گذر جاتا، جہاں بیٹھ جاتے اپنی باتوں سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے، ان کے مقابلہ میں کوئی بول نہیں سکتا تھا، اگر کوئی منہ پھاڑ سکتا تھا تو وہ شاہ صاحب ہی تھے، جو بیچ میں کوئی نہ کوئی پھڑکتا ہوا جملہ کہہ دیتے [illegible] کبھی تو خوش، کبھی [illegible] کبھی جز بز ہو جاتے، مگر شاہ صاحب کا [illegible]

خوشگوار ہوتا کہ دوسرے لوگوں کے لیے ہنس دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔

مولوی صاحب نے شہر میں اپنے ملنے والوں کا اچھا حلقہ بنا لیا تھا، اس زمانہ میں جتنی معزز شخصیتیں تھیں اُن سب سے ان کے تعلقات تھے، ان میں سب سے مخلص ترین جناب مرزا احسان احمد صاحب تھے ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، ان کے بڑے بھائی مرزا سلطان احمد اس وقت یو۔پی کے سول سروس کے بڑے محبوب اور ممتاز عہدیدار تھے، مختلف اضلاع میں کلکٹر کے عہدہ پر رہ کر آخر میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، پنشن پاکر اعظم گڈھ آئے تو ہر شخص ان کا گرویدہ رہا، ان کا دل گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تھا، ان کی باتیں قلاقند سے بھی زیادہ شیریں ہوتیں، مولوی مسعود علی اور دارالمصنفین کے تمام لوگوں سے بہت ہی قریب تر رہے، مولوی مسعود علی صاحب کے بے تکلف ملنے والوں میں شاہ محمد صاحب فاتح بھی تھے جو اس وقت کے چیف جسٹس سر محمد اقبال کے بہنوئی تھے، میونسپلٹی کے انتخاب میں ان کا نمایاں حصہ ہوتا، عین وقت پر انتخاب کا رخ بدل دیتے، مولوی صاحب خود کبھی اس انتخاب میں کھڑے نہیں ہوئے لیکن شبلی منزل ہی میں بیٹھ کر ان کے ساتھ انتخاب لڑاتے رہے۔

مرزا مرتضیٰ بیگ شہر کے ممتاز ترین وکلاء میں تھے، ان کی قانونی لیاقت اور وضعداری مشہور تھی، سیاسی رائے میں مولوی صاحب سے اختلاف کرتے رہتے، مگر دارالمصنفین کے بڑے قدردان رہے، کہتے کہ شہر کے لوگوں نے رہنے سہنے کا سلیقہ شبلی منزل ہی سے سیکھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہوئے، آخر وقت میں پاکستان چلے گئے تھے، جہاں ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔

شاہ علاء الحق بھی شہر کے ممتاز وکیل تھے، لباس، وضع قطع، رہنے سہنے میں نفاست کے دلدادہ آخر وقت تک مولوی صاحب اور دارالمصنفین سے بڑا تعلق رکھا، وہ بھی پاکستان چلے گئے تھے [illegible] وفات پائی۔

جناب محمد ظہور صاحب شہر کے بڑے اچھے تاجر تھے، اپنی وضعداری اور شرافت و خلق کے

مشہور رہے، وہ ہر اتوار کو شبلی منزل ضرور آتے، اور ہفتہ بھر کے اخبارات کا مطالعہ کرتے۔

امین الدین صاحب مولوی مسعود علی صاحب سے سن میں بہت چھوٹے تھے، اس زمانہ میں وکالت کرتے تھے، بڑی اچھی تفریحی گفتگو کرتے، اس لیے مولوی مسعود علی اور دارالمصنفین کی صحبت کے اہم رکن رہے، ابھی تک بقید حیات ہیں، ریونیو افسر ہو گئے تو وکالت چھوڑ دی، پھر شبلی کالج میں قانون کے پروفیسر ہو گئے وہیں سے ریٹائر ہوئے، ان کے داماد لندن میں ہیں، اس لیے وہاں کئی بار گئے، ان کے چھوٹے بھائی معین الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر ہوئے تو کوآپریٹیو سوسائٹی کے ڈپٹی رجسٹرار ہو کر ریٹائر ہوئے، وہ بھی مولوی مسعود علی کے مخلص ملنے والوں میں رہے، یہ دونوں بھائی دارالمصنفین سے اپنے پرانے تعلقات کی وضعداری کو بڑے اخلاص سے نباہ رہے ہیں،

یہ حضرات شبلی منزل میں جمع ہو جاتے تو پھر دیر تک بارونق مجلس رہتی، جو پرانی تہذیب کی بھی یاد تازہ کرتی، جناب اقبال سہیل اعظم گڈھ میں گو وکالت کرتے، مگر اس پیشہ کے باوجود ان کی شاعری میں وہ نغمہ پیدا ہوئی، ہندوستان کے ممتاز ترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا، گو وہ اپنے اس بلند رتبہ سے بے نیاز رہے وہ اپنے علمی ادبی ذوق کی وجہ سے مولوی مسعود علی صاحب سے زیادہ حضرت سید صاحبؒ سے قریب تر رہے، وہ شبلی منزل آجاتے تو پھر یہاں کی مجلس شعر و ادب کی محفل بن جاتی، جس میں سید صاحب کی موجودگی کی وجہ سے بڑی باوقار شائستگی پیدا ہو جاتی، ان مجلسوں کا ذکر زیب قلم اس لیے رہا ہے کہ ان سے مقامی حیثیت سے دارالمصنفین ایک خاص تہذیبی مرکز بھی بن گیا تھا، شاہ صاحبؒ ان مجلسوں میں برابر شریک رہتے جس سے ان کی تہذیبی شخصیت کے ابھرنے میں مدد ملی، ان کو اپنے گھر اور خاندان سے بھی تہذیبی وراثت ملی تھی، دارالمصنفین کی مجلسوں میں اور جلا پیدا ہو گئی،

شاہ صاحب کی معاشی تنگی جنوری ۱۹۲۵ء میں میری شرکت دارالمصنفین میں ہوئی تو شاہ صاحبؒ گیارہ برس کے بعد ترقی کر کے پچاس روپے تک پہونچے تھے، اس وظیفہ میں بڑی اچھی زندگی بسر کرتے،

ان کی ننہالی اور دادھیالی جائداد سے انہیں خاص سالانہ آمدنی ہوجاتی تھی، دو باغ تھے، مکانات کے کرایے بھی مل جاتے، جائداد سے ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی بھی ہوجاتی، جب تک ان کے والدین زندہ رہے اس آمدنی سے کچھ بھی نہیں لیتے، والدین کی وفات کے بعد مذکورۂ بالا آمدنی ان کے چھوٹے بھائی لیتے رہے، شاہ صاحب اپنے اخراجات کے لیے دارالمصنفین میں جو کچھ پاتے اس کو کافی سمجھتے، ان کے پاس ایک ملازم محمد نصیر نامی تھا، اس کو ماہانہ تنخواہ دینے کے علاوہ سال بھر کے کپڑے بھی دیتے اور اپنے ہی اخراجات سے اس کو ساتھ گھر بھی لے جاتے، وظیفہ میں سے کچھ بچاکر اپنی اہلیہ کو بھی ماہانہ خرچ بھیجتے رہتے۔ روزمرہ کی زندگی اچھا پہنتے اور اچھا کھاتے، بہت صاف کپڑے پہنتے، ہر تیسرے دن کپڑے اہتمام سے بدل دیتے، کبھی ان کے جسم پر میلے کپڑے نہیں دیکھے گئے، گرمیوں میں تن زیب کے کرتے پہنتے، جن کو پھٹنے سے پہلے اپنے ملازم کو دے دیتے، جاڑوں میں ذرا موٹے کپڑے کے کرتے بنواتے، پورا سرمائی سامان رکھتے، بہت اچھے درزی کی سلی ہوئی شیروانی پہنا کرتے، دارالمصنفین کے لوگوں کے لیے جو بال بچوں کے ساتھ نہیں رہتے ایک علیحدہ باورچی خانہ تھا جس میں طرح طرح کے کھانے شاہ صاحب کے حکم سے پکتے، ملے جلے دسترخوان پر اس باورچی خانہ سے کھانا آتا تو دسترخوان بھر جاتا، دو تین مہمان اچانک آجاتے تو دسترخوان پر کھانے کی کمی نہ ہوتی، شاہ صاحب میٹھی چیزیں بہت پسند کرتے، اس لیے ان زمانہ میں میٹھی چیزیں برابر پکا کرتی تھیں، وہ اپنے کمرے میں دیسی گھی اور بھیلی ضرور رکھتے، دوسروں کو کھلاتے تو کہتے کہ اس سے بہتر حلوہ بھی نہیں ہوسکتا۔

ان کی دوسری اہلیہ جب تک زندہ رہیں اعظم گڈھ سے ہر چھٹے مہینے رُدولی جاتے، جاتے وقت ان پر ایک خاص قسم کا نشاط رہتا، چہکتے رہتے، واپسی کے بعد کئی روز تک افسردہ اور پژمردہ رہتے، کسی کی باتوں سے دلچسپی نہ لیتے۔

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام سرودِ زندگی پر شاہ صاحب کا مضمون

ستمبر اور اکتوبر ۱۹۳۵ء کے معارف میں شاہ صاحب نے اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام سرودِ زندگی پر جو ناقدانہ مضمون لکھا اس کی داد ان کو ادبی حلقہ

بہت ملی، اس وقت اصغر گونڈوی کی شاعری اپنے پورے عروج پر تھی، ان کا نام فانی، جگر اور حسرت کے ساتھ لیا جاتا، یہ چاروں اس وقت کی غزل گوئی کے عناصر اربعہ ہوئے تھے، فانی یاسیات کے امام سمجھے جاتے، موت کو اپنی غزل میں خنجر کی آڑ میں اور اسے منہ چھپاتی ہوئی دلھن بنا کر پیش کر رہے تھے، انھوں نے موت کو جو چمکار اور پیار دیا اس سے اردو غزل گوئی کے ذریعہ غم کی دکھتی ہوئی رگوں کو اپنی چٹکیوں اور گدگدیوں کے لطف ان سے طبیعت میں گداز، نظر میں بصیرت اور احساس میں گہرائی پیدا کرنے کا درس ملا، انھوں نے ہم کو یہ بھی سکھایا کہ زندگی کب موت اور موت کب زندگی ہوتی ہے، جگر کی شاعری میں کوئی نیا موضوع تو نہیں لیکن ان کے یہاں جو روحانی دردمندی، والہانہ گم شدگی اور مدہوشانہ ربودگی ہے، وہ اردو غزل گوئی کے لیے اس زمانہ میں ایک نیا عنوان تھا، حسرت کی غزلوں میں بھی فکر کی گہرائی نہیں مگر ان کا دل ربایانہ اور دلبرانہ انداز کچھ ایسا ہے کہ ان کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں ہلچل پیدا کر رہے ہیں، اور جانی بوجھی چیزوں کو رسیلا پن اور بانکپن دے رہے ہیں، اصغر کے یہاں حسنِ تخیل کے ساتھ ذوقِ عرفان اور علم و حکمت کی جو خوش نوائی اور زمزمہ سنجی ہے اس سے اردو کی غزل گوئی میں جو کیف سوز اور وقار پیدا ہوا۔

یہ بات اعظم گڈھ کی ادبی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے کہ جگر اور اصغر دونوں کے کمالات کو اجاگر کرنے میں اعظم گڈھ ہی کے اربابِ نظر کا حصہ ہے، اصغر کا مجموعۂ کلام نشاطِ روح شائع ہوا تو مرزا احسان احمد بیگ اور جناب اقبال سہیل نے اس پر جو مقدمے لکھے ان سے اصغر کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مدد ملی، دونوں بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس لیے وہ شاعرانہ رموز و نکات کے ادا شناس بھی تھے اس لیے اصغر کی شاعری کو وہی پرکھ سکتے تھے، اقبال سہیل اصغر کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ جناب اصغر کی شاعری عام سطح سے بہت بلند ہے، ان کے یہاں ٹھبلی ہوئی بھبھک، بھڑکتی ہوئی آنکھیں، استعمال ترک کر چکیاں، خشک زنانہ رنگ، شرم ناک بند آتیاں کہیں نظر نہیں

ان کی شاعری حسن معانی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آنسو کا ایک ایک قطرہ ان کے جوشِ طبیعت کے فیض سے کبھی ستارۂ سحری بن کر چمک اٹھتا ہے اور کبھی شوق کا ہمرکاب بن جاتا ہے۔"

پھر مرزا احسان احمد نے ان کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے :

" ان کی نگاہیں صرف اسی عالم قدس کے روح پرور مناظر کی اداشناس ہیں جہاں ایک لازوال تاثر، ایک روح نواز ترنم، ایک ابدی لذت، ایک جاں فزا تجلی، ایک نشاط آفریں رقص، ایک دلگداز ذوق، ایک آتش فشاں وجد کے سوا کوئی سماں نظر نہیں آتا، اس لیے موجودہ مذاق اور عالم مادی کے حوادث و افکار کی مرقع نگاری کے دلدادہ ممکن ہے کہ حضرت اصغر کی اس لغزشِ مستانہ کے خیر مقدم کے لیے تیار نہ ہوں، لیکن ذوقِ لطیف عشق و محبت کے ان اسرار رنگیں پر جو درحقیقت صحیفۂ شاعری کے ابدی نقوش ہیں بغیر وجد کیے ہوئے نہیں رہ سکتا۔"

شاہ صاحب ان دونوں بزرگوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، مگر جب انھوں نے اصغر صاحب کی شاعری پر لکھنا شروع کیا تو ان دونوں کی صف میں کھڑے نظر آئے، اصغر صاحب نے مجموعۂ کلام 'نشاطِ روح' کے بعد دوسرا مجموعہ 'سرودِ زندگی' کے نام سے شایع کیا، شروع میں انھوں نے خود ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جو بقول شاہ صاحب ان کے علوئے نظر اور بلند نظری کا آئینہ دار تھا، اس کے بعد سر تیج بہادر سپرو کا ایک مقدمہ تھا جو فارسی اور اردو زبان کے رچے ہوئے ذوق کی وجہ سے اس زمانہ میں علمی حلقہ میں بھی مشہور تھے، آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک مختصر تقریظ تھی، جس شاعر کو سر تیج بہادر سپرو اور مولانا ابوالکلام آزاد پسند کریں ظاہر ہے کہ پھر اس کے نہ صرف باکمال بلکہ باوقار ہونے میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اصغر نے اپنے وقار کو قائم رکھ کر جس طرح اپنی شاعری کو باوقار بنایا وہ ان کے ہمعصروں کو نصیب نہیں تھا، باوقار شاعر پر لکھنے کے لیے جو باوقار انداز ہونا چاہیے وہی شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحب کی شاعری پر لکھنے کے لیے اختیار کیا، اپنے مضمون کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

"حضرت اصغر اور ان کی شاعری باذاق اور سخن فہم میں بیگانہ نہیں، وہ دور جدید کے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے لیلائے تغزل کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو سنوارا ہے، اور اس کے دلفریب جمال کو جس کا پرانا و قیانوسی سامانِ زینت جمال شاعری کے ساتھ اربابِ نظر کی نگاہوں کو بھی مجروح کر رہا تھا جدید طرز سے آراستہ اور نئے آب و رنگ سے نکھار کر اربابِ نظر کی محفل میں آنے کے قابل بنایا۔"

اس کے بعد مولانا ابوالکلام کی تقریظ پر ان کی رائے ہے، 'سرودِ زندگی' کی اشاعت سے پہلے مولانا کی اس تقریظ کا ذکر اخباروں اور رسالوں میں آتا رہا۔ اس کے متعلق شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"سرودِ زندگی پہلا دیوان بلکہ غالباً پہلی کتاب ہے جسے مولانا کی تقریظ کا طرۂ افتخار حاصل ہوا ہے، دیوان کی اشاعت سے پہلے مولانا کے "مقدمہ" کی شہرت سن کر اس کے دیکھنے کا حیرت آمیز اشتیاق پیدا ہوا تھا، کہ مولانا کے پُربہار قلم نے معلوم نہیں کیا کیا گل کاریاں کی ہوں گی اور اردو میں مرحوم بجنوری کے مقدمۂ دیوانِ غالب کے بعد ایک اور معیار قائم ہو جائے گا۔ لیکن دیوان دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس شہرت کی حیثیت اشتہار سے زیادہ نہ تھی۔"

اس تحریر سے تو اصغر صاحب پر حرف آتا ہے کہ انھوں نے تقریظ کو اس کی اشاعت سے پہلے اشتہاری رنگ دے دیا تھا، مگر شاہ صاحبؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی عظمت کو برقرار رکھا ہے، ان کی تقریباً پوری تقریظ اپنے مضمون میں نقل کر دی اور لکھا:

"مولانا نے حسب معمول اس معاملہ میں اپنی انفرادیت اور امتیازی شان قائم رکھی ہے، تقریظ نگار کے قلم سے کس خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں جو ان کا مخصوص کمال ہے، لیکن اس کے قلم سے یہ منقصہ بھی بہت ہے۔"

پھر ماہ جوری [illegible] کے ایک ۲۲ صفحات پر مشتمل مقالہ بتاتے ہیں دو ایک نظمیں تھیں، اس کے بعد [illegible] ہوا تو غزلیں اور متفرق اشعار تھے۔ فارسی کلام بھی تھا، ان کی ترتیب ردیف وار کے بجائے

زبانی تھی۔

شاہ صاحبؒ اصغر صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام 'نشاطِ روح' اور اس کے بعد کے مجموعۂ 'سرودِ زندگی' دونوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ 'نشاطِ روح' کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان کا پہلا کلام (یعنی نشاطِ روح) اس دورِ نشاط کے اثرات کا نتیجہ ہے جب کہ ہر جلوہ زیبا جنتِ نگاہ اور ہر نغمۂ رنگین فردوسِ گوش اور ہر خیال عشق کا بیان اور حسن کی تفسیر ہوتا ہے، اور فضائے عالم میں ہر طرف رنگینی و مستی چھائی ہوئی نظر آتی ہے، ولولوں اور جذبات میں طوفان کا جوش و خروش ہوتا ہے، اس لیے 'نشاطِ روح' میں رنگینی و مستی، کیف و سرور کا وفور ہے، لیکن اس نشیلی اور بے بار فضا سے بھی شرابِ حقیقت کے قطرات ٹپکتے نظر آتے ہیں۔"

'سرودِ زندگی' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"'سرودِ زندگی' اس عہد کا کلام ہے جب کہ جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے، جوش و خروش کی جگہ فکر و تدبر لے لیتے ہیں، نگاہیں ظاہری آب و رنگ سے گذر کر حسنِ حقیقت کی تلاش میں لگ جاتی ہیں اس لیے 'سرودِ زندگی' میں پختگی ہے، گہرائی ہے، فکر و تدبر ہے، بیانِ حقیقت ہے، اخلاق ہے، فلسفہ ہے، تصوف ہے، غرض اس سرود کے تمام نغمے لاہوتی ہیں، اگرچہ کہیں کہیں مجاز کا رنگین حجاب بھی نظر آتا ہے، لیکن وہ اتنا لطیف اور ہلکا ہے کہ اندر سے حسنِ حقیقت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، لیکن ان تمام محاسن کے باوجود بڑا حصہ جذبات کی بے ساختگی سے خالی ہے، اور خیال آفرینی کا غلبہ ہے۔"

یہ موازنہ شاہ صاحبؒ کے رچے ہوئے تنقیدی اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے جس سے اصغر کے بڑے سے بڑے مداح اور پرستار بھی اختلاف کرنا پسند نہ کریں گے۔

اس کے بعد اصغر صاحب کی شاعری جو صوفیانہ رنگ ہے، اس کا تجزیہ شاہ صاحبؒ نے کیا ہے

شاہ صاحب نے تصوف و عرفان و حقیقت اور فلسفہ و حکمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصغر صاحبؒ کے نزدیک ظاہر پرست مقامِ حقیقت اور راہِ سلوک کے مختلف احوال و کوائف کے متحمل نہیں ہو سکتے، مقامِ سلوک وہ ہے جہاں خود سالک کا بھی گذر نہیں، اس راہ میں قدم رکھنے کے بعد قیل و قال اور وجد و حال سب ختم ہو جاتے ہیں، اس مقام کے ابھرے راز و نیاز، کفر و ایمان کی سرحد اور اک سے اوراء ہیں، یہاں پہونچ کر قلب و دماغ، خیال و نظر سب پر مطلوب ہی مطلوب چھا جاتا ہے، اور سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں، جمالِ مطلوب اور خیالِ مطلوب کے علاوہ خود اپنا ہوش بھی باقی نہیں رہتا، اس عالمِ بے خودی میں بس ایک سجدۂ شوق کی بے قراری رہ جاتی ہے، سرِ نیاز اور آستانِ ناز کی بھی خبر نہیں رہتی، جلوۂ بے رنگ کی نمود سے حسنِ حقیقت کا چہرہ بھی نہیں پہچانا جاتا، لیکن پھر چشمِ حقیقت نگر تمام حجابوں کو چاک کر ڈالتی ہے اور سازِ روح نغمہ سرا ہو جاتا ہے، جن پردوں میں وہ نظر آتا ہے ان کی رنگینی اور تابانی کا عجیب عالم ہوتا ہے، کبھی خود پاک نظر دیکھنے والا احترامِ حسن میں مجاز کا پردہ ڈال لیتا ہے، مگر جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ سب ظاہری آب و رنگ کا فریب ہے، حقیقت کی کسی کو خبر نہیں، اس بے خبری اور بیہوشی کی وجہ سے ساز اور آواز کی تمیز بھی نہیں رہتی، لیکن اس بے خبری اور بے ہوشی میں بھی ساقی کی محفل دیکھنے والے کچھ باخبر ہیں جو خطِ ساغر میں حق و باطل کا امتیاز کر لیتے ہیں، دماغی علم و حکمت سے عقدہ کشائی نہیں ہوتی، اس کے لیے میخانۂ دل چاہیے، خرد کے سامنے حجابِ عالم ہے، اور نگاہِ عشق بے پردہ دیکھتی ہے، ایمان کی بینا حقیقت کفر ہے، کیونکہ کفر ہی میں قیود لگانے سے ایمان بنتا ہے، حرم نشینوں پر سکونِ مطلق طاری ہے اور صنم کدۂ دل میں تجلیوں کی بارش ہے، وغیرہ وغیرہ، شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحب کے ان تمام خیالات کو ان ہی کے اشعار سے ثابت کیا ہے، جو شعر و ادب میں ان کی یعنی شاہ صاحبؒ کی بصیرت کی نکتہ رسی کی بھی دلیل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحب کے تغزل کے مجازی رنگ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے،

لکھتے ہیں کہ اصغر صاحب اس چمن کے بھی ایک خوشنوا نغمہ سرا ہیں، اپنی خوش مذاقی سے انھوں نے ایسے رنگ برنگ کے اور بوقلموں پھول کھلائے ہیں کہ ان کے کلام کا یہ حصہ تختۂ بہار نظر آتا ہے لیکن اس پر تصوف کا رنگ ایسا چھایا ہوا ہے کہ مجاز و حقیقت میں امتیاز دشوار اور انھیں علیحدہ کر کے دکھانا دشوار تر ہے، پھر کچھ کلام کی رنگینی اور کچھ مذاق سلیم کی مدد سے ایک خیالی حد قائم کی جا سکتی ہے، انھوں نے اس رنگ میں آنا اور ایسا کہا ہے کہ اس سے پوری روداد عشق و محبت مرتب ہو سکتی ہے، جس میں عشق و محبت کی وسعت، ہمہ گیری اور عظمت بھی ملے گی، حسن تخیل بھی، تڑپ جذبِ شوق بھی، التجائے خلوت بھی، جوشِ تمنا بھی، جذب و عشق کا اثر بھی، التجائے جاں نوازی مشاہدۂ جمال بھی، نیرنگیِ حسن بھی، تصورِ نظر بھی، ذوقِ بندگی بھی، بہار نقش پا پر سجدۂ نیاز بھی، انجامِ عشق بھی، ان سب کے ثبوت کے لیے شاہ صاحبؒ نے اپنے حسنِ ذوق سے اصغر صاحب کے اشعار کا بہترین انتخاب کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اصغر کی شاعری میں یہ بھی دکھایا ہے کہ انھوں نے حافظؔ کے اتباع میں حسن و عشق کی کیفیات اور تصوف کے مسائل و کوائف کو موج شراب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے جو خمریات کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان کے میخانہ میں وہ تجلی ہے کہ پینے سے زیادہ کھو جانے کا مزا ہے، ان کا میخانہ اسرار حقیقت کا عقدہ کشا ہے، ان کی پیمانے کی نور افشانی کے سامنے آتشِ وادیٔ ایمن بھی چھپ جاتی ہے، ان کے جامِ رنگیں کی تجلی سے زمین سے آسمان تک عالم ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک گداز عشق اور سوز غم تغزل کی جان ہے، اس سے مدح سفر کا ہوتی ہے لیکن سوز و گداز بھی کوائف عشق کی ابتدائی کیفیت ہے، اس کا بلند تر درجہ لذت آشنا جب دل درد عشق سے ذوق یاب اور جراحت غم سے لذت گیر ہو نے لگتا ہے، شاہ صاحب

سوز و گداز کی پرانی اصطلاح کے بجائے اس کو لذت الم سے تعبیر کیا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ اصغر صاحب کا درد عشق اسی منزل میں ہے، اس کی بہار رنگین بھی خزاں کی پروردہ ہے، وہ اشکباری میں بھی مسکرائے جاتے ہیں، لذتِ الم کے لیے خود آپ زخم لیتے ہیں اور درد کے بہانے سے مطلوب کو یاد کرتے ہیں، مستقل غم خود ایک کیفیت بن جاتا ہے، اور درد کی لذت جاتی رہتی ہے، اس لیے وہ تلخی غم کو قائم رکھنے کے لیے کبھی کبھی صہبائے خوشگوار بھی چاہتے ہیں، تاکہ درد ان کے لیے متاعِ زیست بن جائے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے اس مضمون میں اردو شاعری پر اس اعتراض کو دہرایا ہے کہ اس میں اخلاقی بلندی کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ یہ پستی سکھاتی ہے، حالانکہ شاعری تہذیب اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سعدی کے علاوہ کسی نے اصلاحِ اخلاق کو مستقل موضوع نہیں بنایا، اردو کے دورِ جدید کے شعراء میں آزاد، حالی، اکبر اور اقبال نے بھی اس کو مستقل موضوع بنالیا، اصغر صاحب اگرچہ کوئی اخلاقی اور مصلح شاعر نہیں ہیں، لیکن ان کا دیوان اخلاقی عناصر سے خالی نہیں ہے، شاہ صاحبؒ نے ان کے مجموعہ میں سے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن میں خودداری، آزادی، حوصلہ کی بلندی کی تعلیم ہے، اور ان کی یہ بھی تلقین ہے کہ کوتاہیٔ عمل گرفتاری اور رعائیت کے قفس موت ہے، اور زندگی خطرات کی زندگی کا نام ہے۔

شاہ صاحب کے اس مضمون کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں اصغر کی شاعری کی خاصیاں دکھائی ہیں، اصغر صاحب کے مجموعۂ نشاطِ روح کو بلاغتِ ادا کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں جس میں وہ رنگین نوا شعر نظر آتے ہیں، ان میں حسن معانی کے ساتھ حسنِ الفاظ کا ایسا مرقع دکھائی دیتا ہے کہ اس کی غزلیں گلدستۂ معانی اور دلکشیٔ بیان کے لحاظ سے خوش رنگ گلدستہ اور الفاظ کی مرصع کاری کی حیثیت سے زرد وزی کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں، نشاطِ روح کا یہ تجزیہ کرکے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سرودِ زندگی میں اصغر صاحب

معلوم نہیں اپنی ان خوبیوں سے اس قدر کیوں بے پرواہ ہو گئے ہیں کہ بعض اشعار میں بیان کی دلکشی تو کجا خیالات بھی مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہو سکے ہیں، بیان کی ژولیدگی اور طرزِ ادا کی خامی کی وجہ سے ان کے بہت سے اشعار نہ صرف حسنِ ظاہری سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ ان کے معنی نکالنا مشکل ہیں۔

شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کے خیالات رفعت و بلندی اور لطافت و پاکیزگی کی معراج تک پہونچ گئے ہیں، مگر اس پرواز میں ان کا مرغِ خیال کہیں کہیں ایسا بہک جاتا ہے کہ ان کے بعض اشعار بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں، اور عرب کے کاہنوں کی نثر معلوم ہوتے ہیں۔

اسی کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحبؒ کے اشعار کی بہت سی اور خامیاں دکھائی ہیں جن کے کچھ نمونے ہم یہاں پر اس لیے نقل کرنا چاہتے ہیں تاکہ موجودہ دور کے نقادوں کو یہ معلوم ہو کہ پہلے تنقیدیں کیسی دیدہ وری سے کی جاتی تھیں، اور اب کسی تنقید میں ایسی وقتِ نظر دکھائی نہیں دیتی، ذیل میں پہلے اصغر صاحب کے اشعار نقل کیے جائیں گے، پھر شاہ صاحب کی ناقدانہ رائے اختصار کے ساتھ درج کی جائیگی۔

اصغر صاحب: وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب ٭ وہ عینِ زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

شاہ صاحبؒ: اس میں ایک بلند خیال کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن طرزِ ادا کی خامی نے سارا لطف بے مزہ کر دیا ہے، لفظی عیب یہ ہے کہ 'کہتے ہیں جس کو سکون سب' میں نہایت فاحش تنافرِ حروف ہے، اور 'عین' زائد ہے، معنوی اعتبار سے دونوں مصرعوں کا تقابل صحیح نہیں، یہ اس طرح درست ہو سکتا تھا:

جو زندگی سکون میں گذرے وہ موت ہے ٭ ہے زندگی وہی جو رہے اضطراب میں

اصغر صاحب: ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بیخودی طاری ٭ تم ہی کو میں نے دیکھا تھا، کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

شاہ صاحبؒ: 'یاد ہوتا ہے' صحیح نہیں، 'یاد آتا ہے' ہونا چاہیے، محض ردیف کی پابندی کی وجہ سے یہ تصرف کیا گیا ہے۔

اصغر صاحب: بے خودی عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر ٭ یہ شہیدِ نغمہ ہے وہ مبتلائے ساز ہے

شاہ صاحبؒ: اس شعر سے یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر خرد اور عشق کی تحقیر کرنا چاہتا ہے یا عشق کو خرد پر ترجیح دینا چاہتا ہے، یا دونوں کی حقیقت بتانا چاہتا ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حقیقت سے باخبر کرنا مقصود ہے کہ ایک شہید نغمہ ہے، دوسرا مبتلائے ساز ہے، لیکن ہستی پر نظر سے یہ مطلب واضح نہیں ہوتا ہے، اسے یوں کہنا چاہیے ؎

ہے خرد اور عشق دونوں کی حقیقت پر نظر

اس سے ایک مصرع میں تین تین "کی" کے اجتماع کا عیب بھی جاتا رہے گا۔

اصغر صاحب: طور پہ لہرا کے جس نے پھونک ڈالا طور کو ٭ اک شرارِ شوق بن کر میرے آب و گل میں ہے

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں اولاً پہلے مصرع میں دو مرتبہ "طور" کی تکرار اچھی نہیں معلوم ہوتی، دوسرے اس میں گذرے ہوئے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو اگرچہ بغیر علامت ماضی کے اظہار کے بھی صحیح ہے، اور معنی بھی سمجھ لیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس کا اظہار ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، تیسرے لفظ "جس نے" کا اقتضا یہ ہے کہ مصرع ثانی میں "اک" کے بجائے "وہ" کی ضمیر لائی جاتی اور اس موقع پر "اک" کے کوئی معنی بھی نہیں ہیں،

اصغر صاحب: جہاں ہے محوِ تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند ٭ حسن کو حسنِ بیاں، حسنِ نظر سمجھا تھا میں

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں چند در چند لفظی اور معنوی نقائص ہیں، لفظی اور نہایت فاحش نقص یہ ہے کہ [illegible] معطوف معطوف علیہ کے بعد "ہیں بند" کا ٹکڑا لگا دیا ہے، جو اگرچہ قاعدہ کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن [illegible] ثقیل اور ناہموار ہے کہ ذوق سلیم کیا، کانوں کو بھی [illegible] معلوم ہوتا ہے، معنوی [illegible] یہ ہے کہ [illegible] مصرع ثانی میں حسن بیان [illegible] نہیں ہے، دوسرے دونوں مصرعوں میں [illegible] شاعر کا منشا یہ ہے کہ میں حسن کو حسن بیان اور حسن نظر سمجھتا تھا لیکن جہاں [illegible] لب سب محو حیرت ہو گئے، اور حسن نظر اور حسن بیان باقی نہیں رہا، [illegible]

دیکھنے والے کے لیے حسن نظر تو ہر حالت میں ہے، اس لیے اس کا تعلق تو اس سے صحیح ہے لیکن حسن بیان [illegible] حسن بیان کا تعلق حسن سے البتہ ہو سکتا ہے، لیکن یہاں یہ مقصود نہیں ہے، دوسرے محویت جلوہ خود ایک حسن نظر ہے، اس لیے کہ تجلی چشم ظاہر سے دیکھی جاتی ہے، اگر محو تجلی کے بجائے محو حقیقت ہوتا تو شاعر کا خیال صحیح ہو سکتا تھا۔

اصغر صاحب: جسم کو اپنا سا کرکے لے اڑی افلاک پر ؎ اللہ اللہ! یہ کمال روح جولاں دیکھیے

شاہ صاحبؒ: جولان عربی مصدر ہے، اس کو فارسی اسم فاعل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔

اصغر صاحب: در پہ تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا ؎ گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں بارہا

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں "آگیا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً نہیں، بلکہ پھرتا پھراتا اتفاقیہ آگیا، اس کے بجائے در تک پہونچ جانے کا اہم مفہوم جلد ہونا چاہیے تھا، "اب نہ کہیں مجھے اٹھا" سے گو کچھ مطلب نکل آتا ہے، لیکن اس کے بجائے "اب نہ یہاں سے تو اٹھا" ہوتا تو زیادہ مناسب تھا، معنوی نقص یہ ہے کہ گردش مہر و ماہ دیکھنا کوئی ایسا کمال نہیں ہے جو نہ اٹھانے کا سفارشی بن سکے، اگر گردش کے بجائے جلوہ ہوتا تو زیادہ مناسب اور معنی خیز ہوتا کہ تیرے آستان تک پہونچنے میں مہر و ماہ کے جلوے بھی نظر آئے لیکن میں نے ان پر نگاہ نہیں ٹھہرائی۔

اصغر صاحب: جہاں کی خیر ہو جانِ حزیں کی خیر ہو یارب! ؎ کہ لو اونچی ہوئی جاتی ہے اب سوزِ محبت کی

شاہ صاحبؒ: پہلی خامی یہ ہے کہ "لو" "سوز" کی نہیں ہوتی، اس کے لیے شعلہ ضروری ہے، جو بھڑکتا ہے [illegible] عموماً شمع کے لیے آتا ہے، معنوی اعتبار سے یہ خرابی ہے کہ کسی عاشق [illegible] سوز محبت کی زیادتی پر جہان کی خیر منانا شان عشق سے بعید ہے، اس کا تو کام یہ ہے کہ خود سوز عشق میں جل کر خاکستر ہو جائے اور منہ سے اُف نہ نکلے۔

اصغر صاحب: کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا ÷ خود اپنا طرز نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

شاہ صاحبؒ: اس موقع پر "کبھی" کا لفظ مقابل چاہتا ہے، اس لیے مصرع ثانی میں مصرع اول کا مقابل مفہوم ہونا چاہیے، دوسرا مصرع یوں ہوتا تو اچھا تھا۔

ع۔ خود اپنا پرتو ہے جو کچھ کہ دیکھتا ہوں میں

اصغر صاحب: اشارہ کیا ہے اس نے اپنے جلوے کو قیامت ÷ قیامت ہے وہ جلوہ اس کو کیا حاجت قیامت کی

شاہ صاحب: مصرع ثانی اس طرح ہونا چاہیے

قیامت ہے وہ خود ہی اس کو کیا حاجت قیامت کی

اصغر صاحب: یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا ÷ یہی ہے دید تو پھر دید بھی اے فتنہ گر ہوتا

شاہ صاحب: یہ شعر نقص ادا اور ژولیدگی بیان کا بدترین نمونہ ہے، نقص بیان کی وجہ سے اس کا مطلب بھی خبط ہو گیا ہے، شاعر جمال حقیقت کی نیرنگی اور شعبدہ بازی دکھانا چاہتا ہے کہ جب وہ جلوہ بھی دکھاتا ہے تو خود ہی نظر بن جاتا ہے، اس کے بعد کہتا ہے کہ جب یہی شعبدہ بازی ہے تو دید کا لطف بھی تیرا ہی رہا لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جو الفاظ انتخاب کیے گئے ہیں اور ان کی جو ترکیب ہے اس سے زیادہ غیر فصیح قیاس میں بھی نہیں آسکتے، پہلا مصرع تو قابل انگیز ہے لیکن دوسرا مصرع تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی مبتدی کا کہا ہوا ہے، لفظی خوبیوں سے قطع نظر اس کے معنی کیا ہوئے۔

اصغر صاحب: تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا ÷ میں ان کا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

شاہ صاحبؒ: یہ شعر نقص بیان کی وجہ سے مہمل الفاظ کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے، غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ ناز و نیاز کی کشاکش کا تماشا ہے کہ میں ان کا دل اپنا سمجھتا ہوں اور وہ میرا دل اپنا سمجھتے ہیں، لیکن شعر کے الفاظ سے یہ مطلب ادا نہیں ہوتا، بلکہ اس سے عشق دل شناسی کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے جو بہت مضحکہ انگیز ہے۔

اصغر صاحب: یہ ذوقِ دید کی شوخی، وہ عکسِ رنگ تجلی ؛ نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہم اٹھا کے تنہا دیکھیں

شاہ صاحب: اس شعر میں "تنہا" کا لفظ بالکل بے محل اور بے جوڑ ہے، تنہا کہنا اس وقت صحیح ہوتا جب پردے اور جلوے کی حیثیت دوئی کی ہوتی، حالانکہ یہ دونوں کیفیتیں ہیں جن میں کوئی تعلق اور دوئی کو کوئی علاقہ نہیں۔

اصغر صاحب: نظارۂ پُرشوق کا اک نام ہے جینا ؛ مرنا اسے کہیے کہ گزرتے ہیں ادھر سے

شاہ صاحب: اس شعر میں لفظی نقص یہ کہ "اک" حشو ہے، معنوی خرابی یہ ہے کہ جب جینا نام ہے نظارۂ شوق کا تو مرنا اس کے مقابلہ میں محرومی کا نام ہوتا، لیکن مصرع ثانی سے اس کے برعکس مطلب نکلتا ہے کیونکہ معشوق کا ادھر سے گزرنے سے نظارۂ شوق کے اور مواقع پیدا ہوتے ہیں اور اگر "گزرنا" "چلے جانے" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں۔

اصغر صاحب: اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں ؛ ایسا بھی ربط صورتِ لیلیٰ نہ چاہیے

شاہ صاحب: یہ شعر معنی سے بے نیاز اور خالص صوفیانہ چیستاں ہے، اسی قبیل کا یہ شعر ہے ؎

کائناتِ دہر کیا، روح الامیں بے ہوش تھے ؛ زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

شاعر کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سالکینِ راہِ حقیقت کی موت وصلِ حبیب کا پیام ہوتی ہے، اس لیے ان کی زندگی قضا کا جو وصل کا دیباچہ ہے مسکرا کر استقبال کرتی ہے، لیکن الفاظ سے یہ معنی ظاہر نہیں ہوتے اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس پر کائناتِ دہر اور روح الامین کے بے ہوش ہونے کے کیا معنی؟

آخر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہم نے نمونے کے طور پر بعض تھوڑے سے اشعار نقل کیے ہیں ورنہ اس مجموعہ میں اس قبیل کے بہت اشعار ہیں جن میں طرزِ ادا کے نقص ہیں تو ان کے بہت کم اشعار خالی ہیں، امید ہے کہ اصغر صاحب آئندہ اپنی شاعری کے بادۂ بے رنگ میں مینا کی شفافیت کی جانب بھی پوری توجہ رکھا کریں گے، ان کے جیسے بلند مرتبہ شاعر کے یہاں اس قسم کے اسقام زیبا نہیں ہیں۔

سرودِ زندگی میں اصغر صاحب کا کچھ فارسی کلام بھی ہے، اس کے متعلق شاہ صاحب نے لکھا کہ خیالات کے اعتبار سے یہ کلام بھی اردو کا ہم پایہ ہے، لیکن زبان میں فارسیت نہیں ہے، اس سے ... تقاضا نہیں کر سکتے ہیں کہ تغزل نگاری کا جو ذوقِ سلیم کے ساتھ دیدہ وری اور بصیرت ہو

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات راحت القلوب کا مطالعہ

از مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۲)

اس قسم کی بعض اور روایتیں بھی ہیں، ان سے واضح ہے کہ راحت القلوب معتبر و مستند بھی ہے، ما بعد کی کتب ملفوظات کا ماخذ بھی ہے، اب ان کی سیر و سیاحت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حت سیاحت عہد وسطیٰ کے درویشوں کا محبوب مشغلہ رہا تھا، وہ اس پر آشوب زمانہ میں بھی برابر ت میں رہے ہیں، حرکت میں برکت بھی ہے اور سفر وسیلۂ ظفر بھی ہے، حضرت بابا صاحبؒ نے بھی عہد میں سیاحت فرمائی، بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب ہوئے، اور اپنے فیوض و برکات سے مخلوق کو نوازا ت بڑا کام تھا، جسے انجام فرمایا، اسرار الاولیاء میں اور راحت القلوب میں آپ کے ملک غیر سے سیاحت کا ذکر بھی ملتا ہے، راحت القلوب سے جو مقامات کی سیر و سیاحت کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہیں:

، غزنی، سیستان، بدخشاں، بغداد اور سمت مغرب۔

سمت مغرب سے مراد ملک شام اور فلسطین خصوصاً بیت المقدس ہو سکتے ہیں جہاں آپ نے

جاروب کشی کی خدمت بھی انجام دی تھی،

یقین ہے کہ بعض مقامات کا ذکر ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہوگا جو دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے، اور آج نایاب و ناپید ہیں، فوائد الفواد میں صرف ایسے سفر کا ذکر ملتا ہے جس کا تعلق اندرون ملک سے ہے، بیرونی ممالک کی سیاحت کا ذکر اس میں نہیں ہے، مگر یہ وجہ انکار نہیں ہو سکتی، خواجہ امیر حسن علا سجزی کے اسلوب کا وصف ایجاز ہے، جس کی بدولت کتنی ہی اطلاعات ناتمام رہ گئی ہیں۔

فوائد الفواد میں وہ سب کچھ ہے جو حاضرین مجلس کے دکھ درد کی دوا ہے، مگر یہ سمجھنا کہ جو کچھ فوائد الفواد میں نہیں ہے اس کا وجود ہی نہیں ہے، معقولیت سے بعید ہے، اس میں روغن فروش کی بیوی کا اور میر تیشکا واقعہ کا ذکر بھی نہیں ہے، جو نہایت درجہ حیرت انگیز اور بصیرت افروز ہے، اس میں لق و دق صحرائے میں بڑے اور گھن دار درخت کے نیچے حضرت بابا صاحبؒ کے قیام فرمانے کا اور حضرت بابا صاحبؒ چلہ معکوس کا ذکر بھی نہیں ہے (جو دیگر کتب میں ہے) تو کیا ان سبھی سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ فوائد الفواد بلاشبہ رشد و ہدایت کا صحیفہ ہے اور سالکانِ راہ سلوک کے لیے خضر راہ ہے، مگر انسانی کارنامہ ہے جو سہو و خطا سے مبرا نہیں ہوتا، لہٰذا تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ راحت القلوب کا بیان صداقت پر مبنی ہے، جس کا تعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے قلم سے ہے، اور اس باب میں راحت القلوب کو ہر اعتبار سے فوقیت ہے۔ اس بنا پر حضرت بابا صاحبؒ کی غیر ملکی سیاحت کا ذکر لائق تسلیم اور قابل قبول ہے۔

۱۳۔ خرق عادت و کرامت | کائنات عالم کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہر شے عجائبات قدرت سے مالا مال ملے گی، جب یہ ہے تو خرق عادت اور کرامت سے وحشت کیوں؟ البتہ اتنی بات ہے کہ دیکھنے میں آتے رہتے ہیں، طبیعت اُن سے مانوس ہو جاتی ہے، تو ان کا جوہر نظروں سے اوجھل اور جو کبھی گاہ بگاہ واسطہ پڑتا ہے انھیں دیکھ کر انسان محو حیرت ہو جاتا ہے، ایسی باتیں بھی ہوتی

ے خیر المجالس ص ۲۳۰ ے خیر المجالس ص ۱۴۶، ۱۴۰ ے خیر المجالس ص ۸۹ ے سیر الاولیاء ص ۶۰ و ۶۹

فہم و ادراک میں سماتی نہیں، جیسے نابالغ بلوغ کی کیفیت کے احساس سے نابلد ہوتا ہے، مگر فی نفسہٖ بلوغ کی کیفیت کیفیت ہے، جو عمر کی مخصوص منزل سے متعلق ہے، اس سے انکار کی گنجائش نہیں حضرت محبوب الٰہیؒ نے کیسی پیاری بات کہی ہے :

"جو بات عقل سے بعید ہے وہ کچھ اور ہے، اور جو عقل میں نہ سمائے وہ کچھ اور ہے، وہی کرامت ہے"

(فوائد الفواد ص ۷)

ادراک کی معذوری اور ادراک ہی کا نقص ہے، ورنہ کرامت و خرق عادت فی نفسہٖ حقیقت حقہ ہیں جو بالطبع انسان کو مرغوب ہیں، صوفیۂ کرام نے اس وصف سے بھی کام لیا ہے جو آج نایاب ہے، جس سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے ہیں، راحت القلوب میں بھی محیر العقول واقعات ہیں جو عہد وسطیٰ کے ادب عالیہ کا طرۂ امتیاز ہے، اگر راحت القلوب میں یہ وصف نہ ہوتا تو عصری اثرات سے محروم ہوتی جو اس کی خوبی نہیں نقص متصور ہوتا، کرامت و خرق عادت ایک حقیقت ہے، اور کسی حقیقت سے روگردانی بعید از عقل ہے۔

۱۴۔ حوالہ جات | حضرت باباصاحبؒ کے بیان کا یہ بھی وصف ہے کہ آپ دوران تقریر میں مآخذات کا بھی ذکر فرمادیا کرتے تھے، اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے، راحت القلوب میں کم و بیش چرنتیس[۳۴] حوالہ جات ہیں، ان میں بعض وہ کتابیں ہیں جو اس عہد میں متداول تھیں، اور آج بھی مستند و معتبر ہیں، مثلاً :

(۱) قوت القلوب (ابو طالب مکیؒ) (۲) کفایہ (امام شعبیؒ) (۳) کشاف (زمخشری معتزلی کی تفسیر) (۴) مفصل (زمخشری کی کتاب النحو) (۵) تفسیر زاہدی (مولانا برہان الدین زاہد صاحب ہدایہ)

بعض ایسی کتب و رسائل ہیں جو اکابر صوفیہ سے متعلق ہیں، مثلاً :

(۱) اوراد شیخ عثمان ہرونیؒ (۲) اوراد شیخ معین الدین سجزیؒ (۳) اسنادِ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۴) شرح خواجہ معین الدین سجزیؒ (۵) اوراد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (۶) شیخ الاسلام

اقتباس شیخ الاسلام قطب الدین بختیار وغیرہ۔

بعض اور کتابیں بھی ہیں جن کا ذکر قدما کی تصانیف میں ملتا ہے، بہرحال حوالہ جات سے بیان کی اہمیت واضح ہوتی ہے، جس سے راحت القلوب کا مستند ومعتبر ہونا پوری طرح ثابت ہے۔

۱۵۔ ادعیۂ ماثورہ | ادعیۂ ماثورہ سے رغبت اور ان کی طلب انسانی فطرت کا خاصہ ہے، تدابیر میں کامیابی کے لیے بھی انسانی فطرت ادھر ہی جھکتی ہے، قرآن پاک ادعیہ کا خزینہ ہے، کتب احادیث میں ادعیہ کے مستقل ابواب ہیں، بعض بزرگوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ادعیہ سے بے اعتنائی خلاف فطرت ہے۔

اسلام کی تعلیم ہے کہ قدم قدم پر خدا کی یاد تازہ رہے، مسلمان لمحہ بھر بھی یاد الٰہی سے غافل نہ ہو، اس لیے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، غرض کہ ہر ہر نقل وحرکت کے لیے ادعیہ کا ذخیرہ موجود ہے، اسے وظائف النبی صلعم سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، انسان جب مشکلات کی دلدل میں پھنستا ہے، تدابیر بھی جواب دے بیٹھتی ہیں تو اس بے چارگی کے عالم میں ادعیہ ہی کے وسیلہ سے سہارا ملتا ہے، بلکہ کار برآری کی راہیں کھل جاتی ہیں، مستشرقین یورپ جنھوں نے اسلامیات کا اور مسلمانوں کے عروج وزوال کا گہرا مطالعہ کیا ہے، انھیں بے تکلف یہ کہنا پڑا ہے کہ جب کبھی مسلمانوں پر برا وقت پڑا ہے تو تصوف نے انھیں سہارا دیا ہے، اور پستی سے بلندی پر لا بٹھایا ہے، ادعیہ بھی تصوف ہی کا ایک شعبۂ عمل ہے، اس سے ادعیہ کی اہمیت ظاہر ہے۔

فوائد الفواد میں منتشر طور پر ادعیہ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر یکجا کر لیا جائے تو اچھی خاصی کتاب الاذکار تیار ہوجائے، راحت القلوب میں اتنا تو نہیں لیکن جتنا کچھ ہے گراں قدر ہے، اور خوبی کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر یکجا ہے، تلاش کرنے کی زحمت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

راحت القلوب کا وہ حصہ جو ادعیۂ ماثورہ پر مشتمل ہے منہ سے بول رہا ہے کہ حضا شروع کی وہ

کیا کیفیت تھی جس کے تدارک کے لیے ان ادعیہ کی ضرورت تھی۔ ادعیہ کے رواج سے فکر کا ملکہ فروغ ہوتا ہے، معاشرے میں سدھار آتا ہے، صحت مند سوسائٹی وجود میں آتی ہے، جو انسانیت کے عروج کے لیے بہت ضروری ہے۔ ادعیہ کو اپنانے کے لیے اخلاصِ عمل درکار ہے اور کچھ بھی نہیں' بقول شخصے کہ یہ سستے قسم کا لٹریچر سہی لیکن نہایت درجہ مفید اور کارآمد ہے۔

اسلوبِ بیان | راحت القلوب کی زبان اتنی سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہے کہ بے تکلف اسے سہل ممتنع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، سلوک کے پیچیدہ اور اہم مسائل کو سلجھا کر اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ مفہوم و مطلب دل میں اترتا چلا جاتا ہے، ہر خطے اور ہر طبقے کا فارسی داں آسانی سے سمجھ لیتا ہے زبان کی یہ خوبی نادر و نایاب ہوتی ہے، مگر راحت القلوب اس وصف سے مالا مال ہے' اس کے اسلوب میں ایسی پذیرائی اور دلآویزی ہے کہ دامنِ دل کو پکڑے ہی رہتی ہے۔

اس میں کارآمد ہدایتیں اور نصیحتیں کچھ اس خوبی سے جلوہ پیرا ہیں کہ دل قبول کیے بغیر رہتا ہی نہیں ہے، بلکہ پڑھنے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں ان ہدایتوں پر عامل ہو گیا ہوں اور مجھے ہدایت نصیب ہو گئی ہے، جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا ہے، عمل پیرا ہونا بھی کچھ مشکل نہیں' ایسا لگتا ہے کہ نیک بندوں میں سے ہو گیا ہوں۔

ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ طبیعت پر کیف طاری ہو جاتا ہے، آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں' اور دل رونے لگتا ہے، عجب کیف و سرور کا عالم ہوتا ہے جو احاطۂ تحریر میں سما نہیں سکتا' اور دھو لیتا ہے، تو اپنے کو ہلکا پھلکا اور صاف ستھرا پاتا ہے اور اپنے کو عجب نورانی فضا میں محسوس کرتا ہے۔

ترغیب و تحریص اور تخویف کچھ ایسے موثر انداز میں ہے کہ دل کو موہے بغیر رہتی نہیں ہے' کشش و جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، عقیدت حال مستی حقیقت جاگتی رہتی ہے، اہلِ دل اس کے کیف سے آج بھی مستفید ہو سکتے ہیں، یہ اسی

حقیقت کا پرتو ہے کہ جس کی طرف حضرت محبوب الٰہیؒ نے اشارہ فرمایا تھا:

”بارہا در ذوقِ بیانِ ایشاں مرحوم چناں فرو می شد کہ تمنا بردہ شدے کہ اگر ہمیں زماں مروم بہیر و نیکی باشد“ (فوائد الفواد ص ۵۵)

اسے حضرت محبوب الٰہیؒ کے اخلاص عمل سے تعبیر کیجیے یا حضرت بابا صاحبؒ کی تاثیر کلام سے، بات ایک ہی ہے، کاش کہ راحت القلوب کا کوئی کامل نسخہ دستیاب ہوتا، تو حقیقت حال زیادہ آشکارا ہوتی۔

نفس مضمون | راحت القلوب کیا ہے؟ اسلامی تعلیمات اور روحانی قدروں کا نچوڑ ہے، اس کا لفظ لفظ ہدایت کے نور سے تجلی ہے، چشمِ بصیرت ہے تو اس میں بہت کچھ ہے ؎

دل کی نگاہ فکر کی بینائی چاہیے — جلوے ہیں عام ظرف تماشائی چاہیے

اس میں بکثرت جواہر پارے ہیں، جن پر عمل پیرا ہونے سے زندگی بن جاتی ہے اور عاقبت بخیر ہوتی ہے۔ ایسی تعلیمات کے کچھ نمونے یہ ہیں:

(۱) حضرت بابا صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے اپنے استاذ محترم کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

(۱) ”انسان جب تک محبت کی صیقل سے آئینۂ دل کو صاف نہ کرے گا، اس وقت تک اللہ کے ذکر سے انسیت نہ ہوگی، البتہ جب درمیان میں کوئی شے حائل نہ رہے گی تو وصالِ حق کی لذت سے بھی لطف اندوز ہوگا، ورنہ خداری کی نعمت نصیب نہ ہوگی۔“

(۲) ”درویشوں کے متعلق بہرحال حسن ظن رکھنا چاہیے، تاکہ اس حسن ظن کی برکت سے حق کی حمایت حاصل رہے۔“

(۳) ”درویشی پردہ پوشی ہے، خرقہ اسی کے لیے ہے جو ہر کسی کی پردہ پوشی کرے [illegible] سے محترز رہتا ہے، جب یہ وصف پیدا ہوتا ہے تو اس وصف سے متصف درویشوں میں شامل

ہوجاتا ہے، اور اس کا مدعا پورا ہونے لگتا ہے"۔

(۴) "جو کچھ خدائے پاک کی رضا کے مطابق صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو، اسراف نہیں" البتہ جو کچھ اس کے خلاف صرف ہوگا وہ اسراف ہے، اس سے محترز رہنا چاہیے، لا اسراف فی الخیر"۔

(۵) "جوہر سعادت تو سبھی میں ہے، فضل الٰہی بھی ہر ایک کے شامل حال ہے، تاہم جدوجہد لازم ہے اس لیے کہ جو بھی مرتبے کو پہونچا ہے، کوشش و مجاہدے کے وسیلے سے پہونچا ہے"۔

(۶) "انسان اور اللہ پاک کے درمیان دنیا سے بڑھ کر کوئی پردہ نہیں ہے، یہی حجاب اکبر ہے"۔

(۷) "دنیاوی کاموں میں مشغول رہنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، وہ شریانیں خشک ہو جاتی ہیں جن پر احساسات لطیفہ کا دارومدار ہے، ذاکر و شاغل رہنا چاہیے، تاکہ دل ذکر و شغل کے نور سے منور اور زندہ رہے"۔

(۸) "جو درویش دنیاوی مشاغل میں منہمک رہتا ہے اور عزوجاہ کا طالب ہے، وہ درویش نہیں مردود طریقت ہے"۔

(۹) "جو خرقہ پہنے اور درویشی کا روپ رچائے، پھر امیروں اور دنیاداروں سے میل ملاپ رکھے، مرغن کھانے کھائے وہ درویش نہیں، راہ گم کردہ ہے"۔

(۱۰) "ذکر میں اتنا منہمک رہنا چاہیے کہ رونگٹا رونگٹا ذاکر بن جائے ..... جو شخص جو کچھ کرتا مرے گا، وہی کرتا بروز قیامت اٹھے گا، زندہ ہوگا"۔

(۱۱) "خدا کی اور اللہ کی یاد میں لگا رہنا، راہ سلوک میں دل کا زندہ رہنا ہے، جو اصل حیات ہے، یہ نہیں تو کچھ نہیں، یہ خوبی نصیب ہوتی ہے اکل حلال سے، اور دنیاداروں سے کنارہ کشی اختیار کرنے سے"

(۱۲) "صحابہ کرام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم دین حاصل کرتے تھے اس سے ان کی

فیضیاب فرماتے تھے۔"

(۱۳) "شیخ طریقت کو اتنی قدرت و کمال حاصل ہو کہ جب کوئی بیعت و ارادت کی غرض سے آئے تو اپنی ذاتی صلاحیت اور نور معرفت کی تاثیر سے طالب کے کدورت آلودہ دل کو آئینہ بنا دے۔ اگر یہ وصف نہیں ہے تو پیر و مرید دونوں گم کردہ راہ ہیں۔"

(۱۴) "اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملے تو اسے اہل سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے اور بقدر امکان عمل بھی، شیخ کامل نہ ملنے کی تلافی ہو جائے گی۔"

(۱۵) "شیخ کو چاہیے کہ مرید کو ہدایت کرے کہ وہ سرمایہ داروں اور امیروں سے ربط ضبط نہ بڑھائے، بلکہ الگ تھلگ رہے، دنیاوی دولت کا طالب نہ ہو، زیادہ نہ بولے، اور بلا ضرورت قدم باہر نہ نکالے۔"

(۱۶) "نماز مومن کی معراج ہے، الصلوٰۃ معراج المؤمنین۔"

(۱۷) "نیک بندوں اور نکوکاروں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے، حدیث شریف میں ہے: صُحْبَةُ الصَّالِحِيْنَ نُوْرٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (نیکوں کی صحبت نور ہے اور رحمت ہے تمام عالم کے لیے)

(۱۸) "جو خدائے پاک کے کام میں لگا رہتا ہے، احکام خداوندی کی تعمیل میں منہمک رہتا ہے، رب العزت اس کے کاموں میں آسانی فرماتے ہیں اور وہ بے تردد سرانجام ہو جاتے ہیں۔"

(۱۹) "کسی کے پلے میں بندھ جاؤ، کسی کے مرید ہو جاؤ، یہ نہیں تو مخلوق کی خدمت کے ہو رہو، کسی مقام عزت پر فائز ہو جاؤ گے۔"

(۲۰) "ورد و وظائف کے لیے جو وقت مقرر کر لیا ہے، اس کا پابند رہنا چاہیے، اگر بشریت کے تقاضے کی وجہ سے وقت پر سرانجام نہ ہو سکے تو پھر کسی اور وقت اسے انجام دے لو۔ دن کو تضییع بجائے تہجد ات کو پورا کر لو، ترک نہ کرو۔"

(۲۱) "ہر شے کی حد و انتہا ہوتی ہے اور غایت بھی، عبادت کی غایت عقل ہے اور فراست، علم کے بغیر عبادت دعوٰی بیہودہ ہے، اور علم عقل کے بغیر دردِ سر ہے۔"

(۲۲) "علم کیا ہے، ابرِ رحمت ہے، رحمت ہی رحمت اس سے برستی ہے۔"

(۲۳) "حدیث شریف میں ہے: ایک فقیہ عالم ایسے ہزاروں عابدوں سے افضل ہے جو دنوں میں روزہ رکھتے ہیں اور رات کو کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔"

(۲۴) "جب کوئی حصولِ علم میں غفلت روا نہیں رکھتا اور علم حاصل کر لیتا ہے تو اس کو حق جل شانہٗ حق کو باطل سے، نیکی کو بدی سے اور حرام کو حلال سے امتیاز کرنے کی توفیق عنایت فرما دیتے ہیں۔"

(۲۵) "زبان سے اللہ پاک کا ذکر کرتے رہنا ایمان کی نشانی ہے، نفاق سے رستگاری ہے، بلیات سے پناہ و حفاظت ہے، اور اس کی بدولت دوزخ سے خلاصی نصیب ہوتی ہے۔"

(۲۶) "کوئی ذکر قرآن پاک کی تلاوت کے برابر نہیں ہے، یہ سب سے افضل و بہتر ہے، اس کا اجر و ثمرہ تمام عبادتوں سے اعلیٰ و افضل ہے۔"

(۲۷) "دعا سے بڑھ کر اللہ پاک کے نزدیک اور کوئی شے نہیں ہے، اللہ پاک کو سب سے پیارا وہ ہے جو دعا میں مشغول رہتا ہے لیس شیئٌ اکبر عند اللہ من الدعاء" (الحدیث)

یہ ہیں معدودے چند جواہر پارے جن کی تعلیم حضرت بابا صاحبؒ نے فرمائی ہے۔ اور جو راحت القلوب کے اوراق کی زینت ہیں۔

ہم ہوش مستقیم | کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ کتب ملفوظات کے مطالب [illegible] ہوا [illegible] مجالس [illegible] شریک ہوتے ہیں [illegible] شیخ کی [illegible] روایتیں بھی بیان کر دی [illegible]

کچھ ایسے نکات بھی ہوتے ہیں کہ سطحی نگاہیں ان کی کنہ کو نہیں پہونچتیں، راحت القلوب میں بھی بعض ایسی روایتیں ہیں جن کی تفہیم عام اذہان کی گرفت میں نہیں آتی، یہاں ان ہی کی قدرے موشگافی مقصود ہے تاکہ عوام تردد بے جا میں مبتلا ہو کر گمراہ نہ ہو جائیں، اللہ پاک حق کی حمایت کی توفیق عنایت فرمائیں،

وما توفیقی الّا باللہ العلیّ العظیم۔

روایت (۱) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں بارگاہ رب العزت سے خرقہ عنایت ہوا تھا، آپ معراج سے تشریف لائے تو صحابۂ کبار رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا مجھے بارگاہ ایزدی سے خرقہ ملا ہے اور حکم ربی یہ ہے کہ میں یہ خرقہ تم میں سے کسی ایک کو تفویض کر دوں، اب ایک بات میں تم سے دریافت کرتا ہوں، تم میں سے جو بھی صحیح جواب دے گا یہ خرقہ میں اسے دے دوں گا، پھر حضرت ابو صدیقؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کرو گے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سچائی اختیار کروں گا، خدائے پاک کی عبادت کروں گا اور جو دنیا مال ومنال ہے، وہ سب راہِ خدا میں صرف کر دوں گا، پھر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کرو گے، حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ میں عدل سے کام لوں گا اور بندگانِ خدا سے انصاف برتوں گا اور مظلوموں کی حمایت کروں گا، پھر امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کرو گے؟ تو حضرت عثمان غنیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں باہمی میل ملاپ سے کام کروں گا، حق کی پیروی کروں گا، شرم اختیار کروں گا اور سخاوت کروں گا، پھر آپ نے امیر المومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کرو گے؟ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! پردہ پوشی کروں گا اور بندگانِ خدا کے عیبوں کو چھپاؤں گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ خرقہ میں تمھیں دیتا ہوں، مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہی حکم تھا کہ تمھارے اجابت کے صحیح جواب

کو یہ خرقہ دے دیا۔ (راحت القلوب ص ۳-۴)

حضرت بابا صاحبؒ یہ بیان کرکے زار وقطار رونے لگے اور بیہوش ہوگئے، جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ درویشی پردہ پوشی است۔ یعنی پردہ پوشی ہی کا نام درویشی ہے، پردہ پوشی کی عادت اخلاقیات کا اہم رکن ہے، اس کے فقدان سے انسان مہلک مصائب میں مبتلا ہوجاتا ہے، جس قدر بھی اس پر عمل پیرا ہوگا اتنا ہی وہ امن و عافیت سے رہے گا، اسے درویشی کا اصل اصول سمجھنا چاہیے، اس کے فضائل و فوائد احاطۂ تحریر و تقریر میں سما نہیں سکتے ہیں، صوفیۂ کرام کے خرقہ کو اسی خرقۂ معراجیہ سے نسبت ہے۔

اس روایت میں دو نکتے ہیں، جن سے کچھ لوگ خلجان میں مبتلا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ خرقۂ معراجیہ کو اپنی نافہمی سے مادی خرقہ تصور کرتے ہیں اور یہ غلط تصور ہے، خرقۂ معراجیہ مادی خرقہ نہیں لطیفۂ غیبی ہے، وائرلیس کے شعاعی حروف اور اس کی عکس گاہ کے تصور سے یہ معمہ حل ہوجاتا ہے، خلق قرآن کا قائل گروہ بھی اس نکتہ کو سمجھ نہ سکا تھا، خرقۂ معراجیہ کے باب میں عالم و عارف خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) کا ارشاد ہے:

"خرقۂ معراجیہ ایک باطنی چیز ہے اور راز خفی ہے، اور اشیائے محسوس میں سے نہیں ہے۔"

(مقابیس المجالس ص ۳۵۶، ترجمہ)

دوسرا خلجان وہ ہے جس کی طرف خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے ایما فرمایا ہے:

"حدیثِ خرقہ ـــ اس حدیث اور قصے کو کتب حدیث میں جو صحیح و معتبر ہیں میں نے کہیں نہیں دیکھا۔" (جوامع الکلم ملفوظ ۱۰ شعبان [illegible])

نہ دیکھنا تو عدم وجود کی وجہ قرار نہیں پاتی، اگر فی الواقع ان کتب حدیث میں نہ بھی ہو جو صحیح اور مشہور و معتبر ہیں تو بھی وجہ انکار لازم نہیں آتی، کیونکہ احصا کا تصور ناروا ہے، پھر اس کے بیان [illegible]

وہ بزرگ ہیں جو متقیوں سے بڑھ کے متقی اور صاحبِ علم و عرفان اور بصیرت باطنی سے مالا مال تھے جن کے قول پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے، اور جو اصولِ حدیث سے بھی پوری آگاہی رکھتے تھے اور اصولِ حدیث کا درس بھی دیتے تھے۔[1]

یہ روایت مدت مدید سے مروج ہے، اسرار الاولیاء میں بھی ہے اور سیر الاولیاء اور فوائد الفواد[2] میں بھی ہے کہ جنھیں ادب صوفیہ میں بے مثل اور نہایت درجہ مستند مانا جاتا ہے، اہم ترین یہ ہے کہ موضوعات میں سے نہیں ہے، بہرحال خرقۂ معراجیہ لطیفۂ غیبی اور امور باطنیہ سے متعلق ہے، اور خرقۂ فقر اسی کی نسبت سے مالا مال اور گوناگوں اوصاف کا جامع ہے، ان نکات کے ذہن نشین ہونے کے بعد اس روایت کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری حائل نہیں رہتی۔

روایت (۲) | حضرت محبوب الٰہیؒ نے لکھا ہے کہ محمد شاہ نامی ایک شخص آئے جو حضرت باباصاحبؒ کے دوستوں میں سے تھے، وہ بہت ہی پریشان حال تھے کیونکہ ان کا بھائی قریب المرگ اور حالت نزع میں تھا، وہ آتے ہی زمین بوس ہوئے، حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا بیٹھو! وہ بیٹھ گئے، حضرت باباصاحبؒ روشن ضمیر تھے، سمجھ گئے کہ یہ پریشان حال کیوں ہیں، تاہم دریافت فرمایا کہ پریشان کیوں ہو، انھوں نے عرض کیا کہ آپ کو روشن ہے کہ بھائی کی حالت سے پریشانی ہے، حضرت باباصاحبؒ نے بلا تامل فرمایا: تمھارا بھائی تو اچھا ہوگیا ہے، جاؤ دیکھ لو، وہ حکم پاتے ہی گھر پہونچے، دیکھتے کیا ہیں کہ بھائی بالکل تندرست ہوگیا ہے اور بیٹھا کھانا کھا رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ بیمار ہوا ہی نہ تھا:

(راحت القلوب ص ۴)

اس بیان میں حضرت باباصاحبؒ کی فرمودہ یہ تین[3] چیزیں ہیں: نفس، بچہ، استغفری [illegible] برادر تو نیکو شدہ است۔ باقی پورا بیان حضرت محبوب الٰہیؒ کا نوشتہ ہے، یہی ذکر فوائد الفواد ص ۲۲۳ میں ہے

[1] سیر الاولیاء ص ۱۱۷۔ [2] سیر الاولیاء ص ۳۵۲۔

جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول اور خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کا نوشتہ ہے۔ اور اگرچہ اسلوب بیان میں فرق ہونا فطری شے ہے، تاہم دیکھنا یہ ہے کہ جامعیت و بلاغت کے اعتبار سے ترجیح کسے ہے ؟ چنانچہ جب حضرت باباصاحبؒ نے یہ دریافت فرمایا کہ چرا متغیری؟ پریشان کیوں ہو؟ تو انھوں نے عرض کیا: از حال برادر خود کہ روشن است، لیکن خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے اس خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"فرمود چہ حال است؟ گفت برادرے دارم رنجور بود ہم چنانکہ رمقے بیش نماندہ است ایں ساعت کہ من بخدمت آمدم چہ عجب کہ تمام شدہ باشد بسبب آں درہم و زیر و زبر ہستم(۳۴۴)"

محل غور ہے کہ حسن ادب اور جامعیت و بلاغت اس اختصار میں ہے کہ ازحال برادرِ خود کہ روشن است یا اس تفصیل میں ہے جو خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کے قلم کا شاہکار ہے، اس کے علاوہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان میں اور بھی خوبیاں ہیں، جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں، البتہ ایک نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت باباصاحبؒ کی زبانی نقل فرمایا ہے کہ بعد برادرِ تو نیکو شدہ است، امیر حسن علا سجزیؒ نے لکھا ہے: برو برادرِ تو صحت خواہد یافت، غور طلب یہ ہے کہ تسکینِ و طمانیت کے سر و سامان کا زیادہ جامع جملہ کون سا ہے، اور کون سا اقتضائے حال کے زیادہ مطابق ہے، بلا تکلف تسلیم کرنا ہوگا کہ راحت القلوب کے بیان کو ہر اعتبار سے فوائد الفواد کے بیان پر ترجیح ہے۔

روایت (۳) حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ میں بغداد کی طرف مسافر تھا۔ میں شیخ اجل سجزی (رحمۃ اللہ علیہ) سے ملا، وہ بزرگ اور بارعب پیر تھے، میں ان کے جماعت خانہ میں داخل ہوا، میں نے سلام کیا، انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا، میری طرف دیکھا اور فرمایا: آؤ شکر عالم آؤ، خوب آئے ...

۱۔ [illegible] ص ۲۲۰ [illegible]
[illegible] کا تعلق سعادت ولایت سے ہے۔

میں پہنچ گیا، اس تعمیل حکم سے وہ خوش ہوئے اور مجھ پر بہت کرم فرمایا، میں کئی دن ان کی خدمت میں رہا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی ان کی خانقاہ سے محروم گیا ہو، اگر کچھ نہ ہوتا تو وہ آنے والے کو چھوارے کی گٹھلی ہی دے دیتے اور یہ دعا دیتے کہ خدا نے پاک تمہارے رزق میں برکت عنایت فرمائیں، میں نے وہاں کے رہنے والوں سے سنا ہے کہ آپ نے جس کسی کو یہ دعا دی وہ زندگی بھر کسی کا محتاج نہ ہوا۔

(راحت القلوب ص ۵)

شیخ اجل رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی کتب ملفوظات خواجگانِ چشت میں اکثر ملتا ہے، لیکن متداول تذکرے ان بزرگ کے احوال میں خاموش ہیں کتابت کا یہ بھی کرشمہ ہے کہ شیخ اجلؒ کو کہیں سنجری لکھا ہے، کہیں سرزی لکھا ہے اور کہیں شیرازی لکھ دیا ہے، فوائد الفواد ص ۸ میں شیرازی ہے اور ص ۲۳ میں سرزی ہے، سیر الاولیا ص ۳۲۵ – ۳۳۸ میں سرزی ہے اور ص ۴۷۱ میں شیرازی ہے، اسرار الاولیا ص ۳۴ میں سوزی ہے اور ص ۳۳ – ۶۵ میں سرزی ہے، راحت القلوب ص ۵ – ۷ میں سنجری ہے، بہرحال تا وقتیکہ کسی تذکرے سے تصدیق نہ ہو جائے اور یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ وہ باشندے کہاں کے تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع شیخ اجلؒ سنجری تھے یا شیرازی تھے یا سرزی تھے، کیونکہ کتب ملفوظات میں ان کو مختلف نسبتوں سے مرقوم ملتا ہے، البتہ راحت القلوب میں ایک ہی نسبت سے یاد کیا گیا ہے پھر بھی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، لہٰذا یہ کہنا بالغ العلمی کے منافی ہے کہ سنجری[1] غلط ہے۔

---

[1] زمانۂ قدیم میں ایران کے جنوبی و کوہستانی علاقہ کو سنگستان اور ملک نیمروز کہتے تھے، اور وہاں کے باشندوں کو سنگری کہتے تھے، سنجری (بہ س ت ج ا ر ی) سنگری ہی کا معرب ہے، شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے:

"خواجہ معین الدین از سیستان است و اہل آں دیار را سنگری می خوانند، و او را سنجری می نویسند کہ معرب سنگری است۔" (اکبرنامہ ج ۳ ص ۱۵۳)

غالباً اہل ایران کے ذوق سلیم نے سنگستان کو گوارا نہیں کیا، اس لئے اسے سیستان سے بدل دیا ہو گا۔

(باقی ص ۴۴۴ پر)

اور سجزی (س ج زی) اسے صحیح ہے، صحیح دونوں ہی ہیں، لیکن سہل الادا ہونے کی بنا پر سنجری کو سجزی پر فوقیت ہے، اس لیے سنجری (س ن ج ری) لکھا، پڑھا اور بولا جاتا ہے لہٰذا جو کچھ حضرت بابا صاحبؒ نے

(بقیہ ص ۴۴۴) ملک الشعراء فردوسی طوسی نے لکھا ہے:

منم کردہ ام رستم داستاں　　　وگرنہ یلے بود در سیستان

رستم کے باپ زال نے اسی کوہستانی علاقہ میں پرورش پائی تھی، جسے سگستان سے سیستان کہا جانے لگا تھا۔

عربوں کا لہجہ گ ادا کرنے سے قاصر تھا، ان کے حروف ابجد میں گ نہیں ہے، لہٰذا عرب جغرافیہ نویسوں نے سگستان کو سجستان لکھا ہے، جسے اکثر ہندوستانی اہل قلم نے اپنایا ہے، اسی سے اسم منسوب سجزی (س ج زی) ہوا مگر اسے رواج عام نصیب نہیں ہوا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس کے تلفظ میں عیب تنافر ہے، ج اور ز قریب المخرج ہونے کی وجہ سے بآسانی زبان سے ادا نہیں ہوتے، اہل علم تو بہ تکلف ادا کر لیتے ہیں، مگر عوام اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، غالباً اسی لیے تذکرہ نویسوں نے سنجری ہی لکھا ہے، سجزی (س ج زی) نہیں لکھا، البتہ خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ نے ضرورت شعری سے ایک شعر میں سجزی نظم کیا اور لکھا ہے ؎

صفے کہ جمع کردم محیط است پیش یاراں　　　حسن علاء سجزی یکے از امید واراں

اس کے علاوہ میرے علم میں کوئی دوسری مثال نہیں ہے، مگر شعرائے فارس نے اکثر سجز اور سنجری ہی نظم کیا ہے، مولانا شہری منزلیؒ وفات کا لین میں خوش گو شاعر گذرے ہیں، جن کا کلام آج تک محافل سماع میں سماعت ہوتا ہے ان کا مشہور قطعہ ہے ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　　در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زاں روز کے یافتم خبر از ملک نیم شب　　　من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

مشہور عرب جغرافیہ نویس بلاذری نے اپنے بیان کے ساتھ سجستان کا جو نقشہ شامل کیا ہے اس میں ایک مقام کا نام [illegible] [illegible] تذکرہ نویسوں نے سنجر لکھا، سنجری (س ن ج ری) [illegible]

بیان فرمایا اور یہ کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے نقل فرمایا، روحت وحدت صحیح ہے، اور اس روایت کو تسلیم کرنے میں کوئی معقول وجہ مانع نہیں ہے۔

روایت (۳) | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں کئی دن شیخ سیف الدین باخرزیؒ کی خدمت میں رہا ان سے رخصت ہونے کے بعد رات کو ایک مسجد میں قیام کیا۔ میرے علم میں آیا کہ یہاں ایک صومعہ (عبادت خانہ) ہے اور اس میں ایک بزرگ رہتے ہیں، میں اس صومعہ میں داخل ہوا تو میں نے وہاں ایک بزرگ کو دیکھا جو بہت ہی باعظمت و ہیبت تھے، مجھے اس وقت تک ایسے باعظمت و ہیبت بزرگ سے شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا تھا، وہ عالم تفکر میں کھڑے تھے، اور آنکھیں ہوا کے رخ کھلی ہوئی تھیں، تین چار دن رات کے بعد وہ عالم صحو میں آئے، ہوشیار ہوئے، میں نے سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا، میرے سبب سے تمھیں تکلیف ہوئی، اچھا بیٹھو! میں بیٹھ گیا، انھوں نے فرمایا کہ میں شمس العارفین کے نبیروں (پوتوں یا نواسوں) میں سے ہوں اور تیس ۳۰ برس سے اس صومعہ میں معتکف ہوں، مگر اے فرید! اس تیس ۳۰ سالہ مدت میں حیرت و دہشت کے سوا مجھے کچھ نصیب نہیں ہوا ......

یہ حکایت طویل ہے اور حیرت انگیز ہے، لیکن بہت ہی سبق آموز ہے، شمس العارفین نام ولقب کے کئی بزرگ گذرے ہیں، خدائے عزوجل را چند شمس العارفین اند (فوائد الفواد ص ۱۴) محمد عطا شمس العارفین ترک بیابانی کا مزار پرانوار (ترکمان دروازہ) دہلی میں ہے، شاہ جمال شمس العارفین کا مزار پرانوار علی گڑھ میں ہے، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے پیر طریقت کا نام شیخ عبدالواحد غزنویؒ تھا، جو شمس العارفین لقب سے یاد کیے جاتے تھے (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۸۰) غزنی میں ایک بزرگ مولانا حسام الدین تیہ (ت ی ہ) تھے جو حضرت شمس العارفین کے فرزند اکبر وہ غلام تھے، تیہ ان کے نام کا لاحقہ ہے، ان کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ کی مبارک زبان سے کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا:

بر سر ستابادہ در غزنین اوراء مولانا حسام الدین تیہ گفتندے، تیہ شمس العارفین بودہ او مرید خواجہ

اجل سرزی بود"۔ (فوائد الفواد ص ۱۴۳ نول کشور ایڈیشن)

نبہ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام کا نام ہے[1]، گو اس کے معنی ہیں مشہور، مگر اردو داں طبقہ اس لفظ سے فی الجملہ واقف نہیں ہے، چنانچہ ایک دانشور نے اسے نبیہ سمجھا، مگر یہ نہیں سمجھا کہ اگر یہ نبیہ ہے تو مولانا حسام الدین کا لاحقہ کیوں ہے؟ بہرحال یہ مولانا حسام الدین نبہؒ بھی خواجہ اجل سرزی کے مرید تھے، مگر یہ ہرگز شمس العارفین کے پوتے یا نواسے نہیں تھے، بلکہ حضرت شمس العارفین کے آزاد کردہ غلام تھے، حضرت باباصاحبؒ کی ملاقات نبیرگانِ شمس العارفین میں سے جن بزرگ سے ہوئی تھی وہ ہرگز مولانا حسام الدین نبہ نہ تھے، کوئی اور بزرگ تھے جو بخارا کی حدود میں کسی صومعہ میں معتکف تھے۔

روایت (۴) | حضرت باباصاحبؒ نے بسبیل تذکرہ فرمایا کہ شیرخاں اُچ اور ملتان کا حاکم تھا، وہ مجھ سے متعلق کچھ ایسا عقیدہ نہ رکھتا تھا جو لائق ذکر ہو، بارہا یہ شعر اس کے متعلق پڑھا یا کہا گیا ؎

افسوس کہ از حالِ منت نیست خبر   آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری

(افسوس تجھے میرا حال معلوم نہیں، البتہ جب تجھے میرے حال سے آگاہی ہوگی تو تجھے ملال ہوگا)

کچھ دنوں بعد ہی کفار نے اس شہر پر حملہ کیا، اور لوٹ مار کرکے سب کچھ لے گئے (راحت القلوب[2])

شیرخاں والی اُچ و ملتان تاتاری یورش کے دوران ۱۲۶۲ء میں مارا گیا، اور تاتاری سب کچھ لوٹ کر لے گئے تھے، یہ ذکر اسرار الاولیاء ص ۹۹ اور فوائد الفواد ص ۲۲۰ - ۲۲۱ میں بھی ہے، بیانات میں دیکھا فرق ہے جو مختلف مجالس میں بیان کرنے یا مختلف اشخاص کے بیان کرنے میں ہوا کرتا ہے، یہ واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی حیات کا ہے، ایسا ہی ایک واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد بھی پیش آیا تھا جس کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے کیا ہے، اور جس میں حضرت باباصاحبؒ کے لاڈلے بیٹے شیخ نظام الدینؒ شہید ہوئے تھے، امیر خورد کرمانیؒ کا بیان یہ ہے:

---

[1] غیاث اللغات۔

"چوں بعد نقل شیخ شیوخ العالم کفار در دیار اجودھن رسید خواجہ نظام الدین از جہت مردی وغایت دلاوری لاحرب بکفار پیوست، بعد قتال بسیار شہادت یافت" (سیر الاولیاء ص ۱۹۰ ج ۱)

یہ واقعہ دراصل اس شعر سے متعلق ہے جو مولانا بدرالدین اسحاق نے اسرارالاولیاء (ص ۶۹) میں حضرت باباصاحبؒ کی زبانی نقل فرمایا ہے، اور وہ یہ ہے ؎

درویش بہ شہر نہ بودے اگر مقام | گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال

فوائدالفواد کے بیان سے یہ مترشح ہے کہ شیر خاں کے ذکر کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس واقعہ کا ذکر بھی فرمایا تھا جو حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد پیش آیا تھا اور جس میں آپ کے صاحبزادے شیخ نظام الدینؒ شہید ہوئے تھے، اس ذکر سے مدعا کیا تھا، یہی کہ کسی کامل درویش کے اٹھ جانے سے مخلوق کو آفات وبلیات سے دوچار ہونا پڑ جاتا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، اور اگرچہ خواجہ حسن علاء سنجریؒ نے بعد ازاں کی پیوندکاری سے حادثۂ اجودھن کو واقعۂ شیر خاں سے علیحدہ کر دیا ہے، مگر ان کی ایجاز بیانی کی بدولت اس طرح ترتیب پایا اور ضم ہوا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ حادثۂ اجودھن ہی وہ حادثہ ہے جس میں شیر خاں مارا گیا تھا مگر ایسا نہیں ہے، اس ابہام کے رفع ہونے سے واقعہ کی اصل کیفیت واضح ہو جاتی ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ابہام ہے تو فوائدالفواد کے بیان میں ہے، راحت القلوب کا بیان اقتضائے حال کے مطابق اور واضح ہے، جس سے راحت القلوب کا اعتماد بحال رہتا ہے، اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود راحت القلوب کے بیانات معتبر ہیں اور راحت القلوب ہی فوائدالفواد کا ماخذ ہے۔

حواشی (۱۵) حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بدخشاں کی طرف مسافر تھا، اس شہر میں بہت کم اولیاء اللہ تھے، چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کے نبیسہ (پوتے یا نواسے) شیخ عبدالواحد بھی شہر کے باہر ایک غار میں رہتے تھے، جب میں نے یہ سنا تو میں اس غار کے پاس پہونچا اور دیکھا کہ وہ بزرگ نہایت زار و نزار

اور لاغر و کمزور ہیں، ایک پیر اُن کا غار کے اندر ہے اور دوسرا باہر کٹا پڑا ہے، ایک ہی پیر پر وہ عالمِ تحیر میں کھڑے ہیں، میں ان کے پاس گیا، سلام کیا، انھوں نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا: ایسے ہی ایستادہ رہنا چاہیے (آپ کھڑے تھے، آپ فرماتے ہیں کہ) میں بھی تین رات دن کھڑا ہی رہا، مگر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئے۔ تین دن کے بعد عالمِ صحو میں آئے، ہوشیار ہوئے اور فرمایا کہ اے فرید! میرے پاس نہ آؤ، اگر آؤ گے تو جل کے خاک ہو جاؤ گے اور دور بھی نہ رہو ورنہ مہجور ہو جاؤ گے (دور ہی رہو گے، وصل الٰہی نصیب نہ ہوگا) لیکن میری کہانی سنو، ستّر سال سے میں اس غار میں کھڑا ہوں، میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ کہیں جا رہی ہے، میرا دل مائل ہوا، میں نے باہر نکلنا چاہا، ہاتفِ غیب نے کہا کہ وعدہ تو یہ تھا کہ میرے سوا کسی طرف مائل نہ ہو گے، چھری میرے پاس تھی، میں نے اس پیر کو کاٹ کر باہر پھینک دیا، کیونکہ وہ خواہشِ نفسانی سے باہر نکلا تھا، اب کوئی تیس برس سے جو ستّر سالہ عمر ہی میں شامل ہے، عالمِ تحیر میں ہوں، اور ڈرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا .... (راحت القلوب ص ۱۰۶)

حکایت طویل ہے، مدعا تنہا ہی بیان سے واضح ہے کہ یہ واقعہ محیر العقول ہے، گر عہدِ وسطیٰ کے سفر میں اکثر سیاحوں کو ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہا ہے، تردد بیجا سے کچھ حاصل نہیں، ایسے واقعات بھی اس عہد کے تارک الدنیا بزرگوں سے مختص ہیں کہ بعض نے جذبۂ ندامت سے مغلوب ہو کر اپنے کو جسمانی تکالیف میں مبتلا کر لیا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے بھی ایسے واقعات بیان فرمائے ہیں، حالانکہ انھیں نہ اس نوعیت کے سفر سے واسطہ پڑا اور نہ انھوں نے بیرونی ممالک کے سفر کیے، مگر پھر بھی ایسے واقعات نقل فرمائے ہیں، مولانا حمید قلندرؒ نے لکھا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا:

(۱) ایک بزرگ نے جذبۂ ندامت سے مغلوب ہو کر دونوں پیر کاٹ ڈالے تھے (خیر المجالس ص ۔۔۔)

(۲) ایک بزرگ نے لذتِ ذائقہ کی سزا دہی میں زبان چبالی تھی۔ (۔۔ ص ۔۔۔)

(۳) ایک بزرگ نے بازار میں ایک عورت کو دیکھا اور دیکھنے کے جرم میں ایک آنکھ نکال پھینکی تھی۔ (۔۔ ص ۔۔۔)

یہ ملفوظات راحت القلوب ہی سے مخصوص نہیں، ان کتب ملفوظات میں بھی ہیں جو نہایت مستند سمجھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک خیر المجالس بھی ہے، نیز یہ تصور کہ ہمارے مشائخ متقدمین نے جوگیوں اور سنیاسیوں کے مٹھوں میں حاضری دی ہے، اور ان کی تعلیمات سے مستفید ہوئے ہیں، اور یہ واقعات اسی استفادہ کا ثمرہ ہیں، اور سراسر غلط ہے (ومشائخنا بریئون عن ھذہ التھمۃ) بلکہ یہ تصور ہی احساس کمتری اور سیکولرزم کی نام نہاد فوقیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے جو قطعاً خلاف واقعہ ہے، دراصل ان اعمال کا منبع طبیعت کی لینت، گدازی اور خشیتِ ربی ہے، یہ روایت بھی خرق عادت ہونے کے باوجود وہی مقام رکھتی ہے جو خیر المجالس کی روایات کا مقام ہے، اگر خیر المجالس نہایت درجہ مستند ہے تو راحت القلوب اس سے کہیں زیادہ مستند ہے، جو اس سے ایک صدی پہلے کی یادگار ہے (باقی)

بزم صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا تیسرا اور ضخیم اڈیشن جس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً حضرت ہجویری، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بختیار کاکی، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت سید محمد گیسو دراز رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے حالات، تعلیمات وارشادات کی تفصیل ان کے ملفوظات اور ان کی کتابوں کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت شیخ احمد عبد الحق نوشہ رودولویؒ کے حالات کے علاوہ ملفوظات خواجگان چشت اور ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ پر ایک مستقل اضافہ ہے، جس سے اس کا افادہ اور زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

قیمت ۰۰-۲۵

"منیجر"

حضرت مسیحؑ کے بعد
نصرانیت کا نیا قالب

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

نصاریٰ کی گمراہی کے اسباب

نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے، اس کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت کے برعکس اور ان کی سخت ممانعت کے باوجود آخر ان کے پیرو توحید اور دین حق سے برگشتہ ہو کر کفر و شرک کی خباثت میں کیوں پڑ گئے؟ اس کی متعدد وجہیں ہیں؛

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت مسیحؑ کے زمانہ کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے، ان سے پیشتر کا زمانہ بنی اسرائیل کی طوائف الملوکی اور سخت ابتری و انتشار کا زمانہ تھا، حضرت سلیمانؑ کے بعد ہی سے ان کی سلطنت زوال پذیر ہوگئی تھی اور وہ شدید اختلات اور باہمی خانہ جنگی میں مبتلا تھے، مدت سے وہ مختلف بادشاہوں کے زیر نگیں رہ کر غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ۱۶۵ ق م میں سوریا کے بادشاہ انیتوکس اپی فلنس نے بخت نصر ہی کی طرح ان کا قتل عام کیا، اور تورات کے سب نسخے جلا دیے، اعلان کا فرمان تھا کہ جس کے پاس عہد عتیق کا کوئی نسخہ ملے گا اور جو شریعت کی رسمیں بجا لائے گا، وہ مار ڈالا جائے گا، مکابیوں کی کتاب میں ہے؛

"اور شریعت کے جتنے طومار پائے جاتے تھے، وہ پھاڑ کر آگ میں جلا دیے جاتے تھے" اور

جس کے پاس اس عہد کا طومار پایا گیا یا جو شریعت پر عمل کرتا تھا، وہ شاہی فرمان کے مطابق قتل کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح اسرائیل کے ان لوگوں کے ساتھ جو شہروں میں پکڑے جاتے تھے، ماہ بماہ سختی سے سلوک ہوتا رہا، مہینے کی پچیسویں تاریخ میں اس بھینٹ گاہ پر جو مذبح پر بنائی ہوئی تھی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی" (مکابیین ۱ : ۵۶ - ۶۱)

یہوداہ مکابی نے اسوری حکمرانوں کا خاتمہ کر کے فلسطین کے ایک بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا، اس کی بدولت یہودی حکومت قائم ہوئی اور بیت المقدس کو آزادی نصیب ہوئی، لیکن یہودیوں کی ریشہ دوانی سے جلد ہی ۶۳ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور رومی حکمراں ٹیٹس نے یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے لاکھوں یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے دور میں بنی اسرائیل کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی، اور ان میں سیاسی استحکام بھی بالکل مفقود ہو چکا تھا، یہودیوں کی بڑی تعداد بابل میں اسیری اور جلاوطنی کے بعد فلسطین واپس آ گئی تھی، مگر اب بھی ان کی اکثریت بابل ہی میں تھی اور یروشلم رومی حکومت کا ایک صوبہ ہو گیا تھا اور اس کی جانب سے ایک رومی فرماں روا یہاں کا حاکم مقرر کیا جاتا تھا حضرت مسیحؑ کی ولادت کے وقت اگسٹس سیزر روم کا فرماں روا تھا اور اس کی جانب سے ہیروڈیس یہودیہ کا حکمراں تھا، اگسٹس کے بعد طائرس فرماں روائے روم ہوا اور ہیروڈیس اعظم کے انتقال کے بعد اس کی حکومت اس کے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی، اس کا ایک لڑکا زبردستی اس علاقہ کا بھی بادشاہ بن بیٹھا، اس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰؑ کا سر قلم کرا کے ایک تھال میں اسے پیش کیا تھا۔[1]

سیاسی خلفشار اور عدم استحکام کے اس دور میں شرک و بت پرستی کا بھی بڑا زور تھا، روم و یونان کفر و شرک کا خاص مرکز تھے، یہاں کے لوگ ہیکلوں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے، ان ہی حالات میں

[1] متی (۱۴ : ۳ - ۱۲)

حضرت مسیحؑ نے توحید اور خدا پرستی کی دعوت دی، وہ اصلاً بنی اسرائیل کی اصلاح اور شریعت موسویؑ کی تجدید و تکمیل کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔[1] قرآن مجید میں ہے:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۔ اور (اللہ مسیحؑ کو) بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔

(آل عمران: ۴۹)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے خاص تھی، انجیل میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لیے آئے تھے۔

"ان بارہ کو یسوعؑ نے بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ پہلے اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔"[2]

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"مسیحؑ نے اسرائیل کے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کیے ۔۔۔۔ اولین شاگردوں کو تعلیم مسیحؑ کی عالمگیری کا احساس نہ ہوا۔"[3]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے روم و یونان کے بت پرستوں سے تعرض کرنے کے بجائے اپنی تعلیم و ہدایت کا دائرہ بنی اسرائیل ہی تک محدود رکھا۔

باوجودیکہ بنی اسرائیل اپنے پُر آشوب حالات کی وجہ سے خدا کی طرف سے ایک نجات دہندہ کے منتظر تھے جو انھیں غلامی کی زندگی سے چھٹکارا دلا کر پھر خدا کی بادشاہت میں داخل کر دے، مگر انھوں نے حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت پر کوئی دھیان نہ دیا، بلکہ اپنی مستقل عادت کے مطابق ان کی مخالفت کو اپنا شعار بنا لیا۔

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ جب جب ان کے پاس کوئی رسول ایسی

---

[1] الملل والنحل شہرستانی ۲۲/۲ بر حاشیہ [illegible] ۔ [2] متی ۱۰: ۵، ۶ ۔ [3] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا [illegible]

اَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ. (مائدہ: ۷۰)	بات لے کر جو ان کی خواہش کے خلاف ہوئی تو ایک گروہ کی تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے رومی حکومت کو بھی حضرت مسیحؑ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا، ابتدا میں رومیوں نے اس کو یہود اور حضرت مسیحؑ کا گھریلو اختلاف سمجھ کر نظر انداز کیا اور اس میں کوئی دخل دینا پسند نہیں کیا، مگر یہود کی مسلسل ریشہ دوانیوں کی وجہ سے رومی حکمراں حضرت مسیحؑ کے مخالف ہو گئے، چنانچہ ہیرودیس اعظم کا بیٹا ان کے قتل کے درپے ہوا، یہ طائرس کا دور تھا، اس کے عہد میں یہودیوں کے اصرار پر پلاطوس نے ۲۹ء میں حضرت مسیحؑ کو پھانسی دینے کا حکم دیا تھا۔

تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف ان کی مہم کو کس قدر سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا اور کیوں وہ اپنی اعجاز پروری اور مسیحا نفسی کے باوجود بنی اسرائیل کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تصحیح کا کام خاطر خواہ طور پر انجام نہیں دے سکے۔

حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے مخلص اور جاں نثار حواریوں نے نصرانیت کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا، وہ توحید، رشد و خیر اور امن و سلامتی کا پیغام پہونچانے کے لیے نہایت مستعد رہے، لیکن سخت جد و جہد اور غیر معمولی سعی و جانفشانی کے باوجود لوگوں کو اپنی دعوت قبول کرنے پر آمادہ نہیں کر سکے، کیونکہ ایسے ماحول اور حالات میں عام طبیعتوں کا رجحان شرک و بت پرستی کی جانب زیادہ ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدا ہی میں اس نصرانیت کو فروغ نصیب نہ ہو سکا جس کی بنیاد توحید اور خدا پرستی پر تھی، اور جو دنیا سے کفر و شرک کو مٹانا اور یہودیوں کے گمراہ کن عقائد و اعمال کی اصلاح و تصحیح کرنا چاہتی تھی، بلکہ وہ خود بھی کفر و شرک کی زد سے محفوظ نہ رہ سکی اور آہستہ آہستہ اس کی

آلودگیوں میں پڑتی گئی، اور جو لوگ نصرانیت قبول بھی کر لیتے تھے، ان میں بھی شرک و بت پرستی کے اثرات موجود رہتے تھے، کیونکہ یہ اثرات اس قدر جڑ پکڑے ہوئے تھے کہ نصرانیت کا اثر بہت جلد محو اور زائل ہو جاتا تھا اور اصل مشرکانہ خیالات و اثرات بدستور باقی اور برقرار رہتے تھے۔

(۲) نصرانیت کی روح کو مسخ کرنے اور اس میں مشرکانہ عقائد و تصورات شامل کرنے کی ابتداء ایک مشہور یہودی عالم ساؤل نے کی، اس کو حضرت مسیحؑ کا زمانہ ضرور ملا، مگر اس نے ان سے کبھی ملاقات نہیں کی، بلکہ شروع میں وہ نصرانیت اور حضرت مسیحؑ کا شدید مخالف تھا، نیز وہ آپ کے متبعین پر ظلم ڈھانے میں بھی پیش پیش رہتا تھا، مگر آپ کے بعد اچانک اس پر آپ کی تجلی نمودار ہوئی اور اس نے نصرانیت قبول کر لی، خود اس کا بیان ہے کہ

"ہاں میں نے بھی سمجھا کہ یسوع ناصری کے نام کی ہر طرح مخالفت کرنا مجھ پر واجب ہے، میں نے یروشلم میں ایسا ہی کیا اور سردار کاہنوں سے اختیار پا کر بہت سے مقدسوں کو قید میں بند کیا، اور جب وہ قتل کیے جاتے تھے تو میں بھی یہی رائے دیتا تھا، اور ہر عبادت خانہ میں انھیں سزا دلا کے زبردستی ان سے کفر کہلواتا تھا، بلکہ ان کی مخالفت میں ایسا دیوانہ بنا کہ غیر شہروں میں بھی جا کر انھیں ستاتا تھا، اسی حال میں سردار کاہنوں سے اختیار اور پروانے لے کر دمشق کو جاتا تھا، ایک روز دوپہر کو میں نے راہ میں دیکھا کہ آسمان سے ایک نور سورج سے زیادہ روشن میرے اور میرے ساتھیوں کے گرد چمکا ہے، جب ہم سب زمین پر گر پڑے تو میں نے عبرانی زبان میں یہ آواز سنی کہ اے ساؤل! اے ساؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ پینے کی آر پر لات مارنا تیرے لیے مشکل ہے، میں نے کہا اے خداوند! تو کون ہے؟ خداوند نے فرمایا میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے، لیکن اٹھ اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو، کیونکہ میں اس لیے تجھ پر ظاہر ہوا کہ تجھے ان چیزوں کا خادم اور گواہ ٹھہراؤں جنہیں تو نے دیکھا، اور ان کا بھی جن میں تجھ پر ظاہر ہوا کروں گا، اور میں تجھے اس قوم اور غیر قوموں سے بچاؤں گا جن کے پاس اب تجھے بھیجتا ہوں کہ تو ان کی آنکھیں

کھول دے تاکہ اندھیرے سے روشنی کی طرف اور شیطان کے اختیار سے خدا کی طرف رجوع لائیں اور مجھ پر ایمان لانے کے باعث گناہوں کی معافی اور مقدسوں میں شریک ہو کر میراث پائیں۔" (اعمال ۲۶: ۱۸-۱۹)

اس واقعہ کے بعد وہ خداوند یسوع پر ایمان لایا اور عبادت خانوں میں منادی کرنے لگا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے:

"اس نے یروشلم پہونچ کر شاگردوں میں مل جانے کی کوشش کی، پر سب اس سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شاگرد ہے، مگر برنباس نے اسے اپنے ساتھ رسولوں کے پاس لے جاکر ان سے بیان کیا کہ اس نے راہ میں کس طرح خداوند کو دیکھا اور اس نے اس سے باتیں کیں اور اس نے دمشق میں کیسی دلیری کے ساتھ یسوع کے نام سے منادی کی، پس وہ یروشلم میں ان کے ساتھ آتا جاتا رہا، اور دلیری کے ساتھ خداوند کے نام کی منادی کرتا تھا، اور یونانی یہودیوں کے ساتھ بحث گفتگو بھی کرتا تھا، مگر وہ اسے مار ڈالنے کے درپے تھے جب بھائیوں کو یہ معلوم ہوا تو اسے قیصریہ میں لے گئے، اور ترسوس کی طرف روانہ کر دیا۔" (اعمال ۹: ۲۶ تا ۳۰)

برنباس کی تصدیق کے بعد اکثر حواریوں نے بھی ساؤل کی تصدیق کی اور اس نے اپنا نام بدل کر پولس (پال Paul) رکھا، اور حواریوں کے ساتھ مل کر نصرانیت کی تبلیغ کرنے لگا، اس کی لیاقت وصلاحیت اور مسلسل جد وجہد کے نتیجہ میں نصرانیت کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا، اور غیر یہودی بھی اسے قبول کرنے لگے، پال اپنی ان خدمات اور سرگرمیوں کی بنا پر حضرت مسیح کے متبعین میں بہت معتبر ہو گیا، اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے بتدریج نصرانیت میں نئی نئی باتیں داخل کرنی شروع کیں چنانچہ حضرت مسیح کی ابنیت، الوہیت، کفارہ اور حلول وغیرہ کے مشرکانہ عقائد اسی کا ایجاد ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"اور بالآخر پال نے جو ایک نیم یونانی یہودی تھا اس مذہب عیسوی پر غلبہ پاکر اس کے

> [illegible] ہمیشہ کے لیے [illegible] حضرت [illegible] کا حسرت :
> [illegible] اور [illegible] جس کا [illegible] حضرت عیسیٰ [illegible] تھے وہ ان کا
> روحانی شاگرد [illegible] (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۲۱۸)

پال نے فلسفیانہ ترکیبیں اور اصطلاحات وضع کیں اور نصرانیت میں یونانی فکر و فلسفہ کی آمیزش کرکے اسے ایک نئی صورت میں تبدیل کر دیا، اس طرح اصل مسیحی تعلیمات مسخ ہوگئیں اور یونانی فلسفہ اور دوسرے مذاہب کے مختلف عناصر کا ایسا ملغوبہ تیار ہوا جس کو حضرت مسیح کی اصل دعوت سے کوئی مناسبت نہ تھی؛ بلکہ یہ یونانیوں، مصریوں اور آشوریوں کے عقائد و افکار سے زیادہ قریب تر تھا۔

پال خود یونانی یہودی تھا، اور وہ فلسفۂ روم و یونان پر دسترس رکھتا تھا، اس زمانہ میں رومیوں کی حکومت تھی جسے یونانی حکومت و تہذیب کا جانشین خیال کیا جاتا تھا اور یونانی تہذیب میں مظاہر پرستی کا بڑا غلبہ تھا۔ پال کی تعلیمات میں بھی اس کا بہت عمل دخل تھا، اس نے یروشلم میں دوسرے حواریوں سے مل کر یہ طے کر لیا کہ شریعت موسوی کے احکام پر عمل کرانے کے لیے غیر یہودیوں (جنٹائلز) پر نہ تو ختنہ کی [illegible] اور نہ انھیں زبردستی ان کا مکلف بنایا جائے، چنانچہ اس نے انھیں ختنہ نہ کرانے اور سور کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی۔ تاریخ شام کا مصنف بھی لکھتا ہے :

> [illegible] ثابت ہوا کہ نصرانیت [illegible] بہت کم [illegible]
> [illegible] رنگ چڑھ گیا اور [illegible] کے لیے قابل قبول ہو گیا۔
> (تاریخ شام [illegible] [illegible] اسلامی [illegible])

جب تک پال نے اپنے نظریات واضح طور پر پیش نہیں کیے تھے، اس وقت تک حضرت مسیح کے حواری اس کے [illegible] ساتھ تھے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ نصرانیت کی اصل تعلیمات سے منحرف ہو [illegible] تو وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے، انھوں نے پال سے بحث مباحثے اور مناظرے کیے، [illegible]

ان کی بدعات اور اضافے یہودیوں کے مذاق کے تھے۔ اس لیے بالآخر خود یہودیوں نے اصل نصرانیت کو چھوڑ کر پال کا خود ساختہ جدید عیسائی مذہب قبول کر لیا، علاوہ ازیں اس نے چونکہ نصرانی تعلیمات میں یونانی و رومی افکار کی آمیزش کر دی تھی اور لوگوں کے لیے ہر طرح کی رعایتیں اور سہولتیں بھی پیدا کر دی تھیں، اس لیے اس کا خود ساختہ مذہب تیزی سے مقبول ہوا، اور وہ غیر یہودیوں کے لیے بھی بہت پرکشش ہو گیا، اس لیے وہ بھی نہایت رغبت سے اس میں داخل ہونے لگے۔

پال بڑا زیرک اور فہیم تھا، اس نے اپنی دانشمندی سے عیسائی مذہب کی ایسی تعبیر کی جو یونانی و رومی مذہب کے بہت زیادہ موافق تھی، اس نے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو مسخ کر کے ان میں بت پرستی کی آمیزش اسی لیے کی تھی کہ اس وقت کا پورا ماحول بت پرستانہ تھا، لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے، ڈریپر لکھتا ہے:

"مشرق میں اوتاروں سے اور مغرب میں انسانوں نے دیوتاؤں کا روپ دھار کر اولمپس کی بیانی آبادی کو بہت جلد جلد بڑھانا شروع کر دیا تھا، ایشیا کا اگر یہ عقیدہ تھا کہ دیوتا آسمان سے اتر کر انسانی قالب میں بروزی رنگ میں ظاہر ہو سکتے ہیں تو یورپ میں انسان زمین سے صعود کر کے آسمان پر چلا جاتا تھا اور دیوتاؤں کے زمرہ میں شریک ہو جاتا تھا" (معرکہ مذہب و سائنس ص ۴۹)

ایسے ماحول میں اصل مسیحی تعلیمات کو پھیلنے میں دیر اور تاخیر ہوتی، اس نے اپنے مذہب کی جلد اشاعت کے لیے اس کی روح ختم ہو جانے کی بھی پروا نہ کی، اس ضمن میں اس نے اسے ایک نیا قالب دیا اور اس پر یونانی رنگ چڑھا کر اس میں کفر و شرک کے اثرات داخل کر دیے، اس کے نتیجہ میں اس کا مذہب تیزی سے پھیلا، برٹن لکھتا ہے:

"مسیحیت اس وجہ سے بھی کامیاب ہوئی کہ اس میں بت پرستی کی بہت سی چیزیں شامل تھیں، یعنی وہ کافی حد تک ایسی چیزیں نہ تھیں۔"

ا س بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائیت کو حضرت مسیحؑ کی جانب منسوب کرنا درست نہیں۔

یہاں عیسائیت اور نصرانیت کے متعلق مختصر وضاحت کر دینا مناسب ہوگا، نصاریٰ نصران کی جمع ہے، شروع میں حضرت مسیحؑ کے ماننے والے نصاریٰ ہی کہلاتے تھے، اور متقدمین اس نام کو پسند کرتے تھے لیکن متاخرین نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا، وہ دو فرقوں میں بٹ گئے، ایک نے خلیفۂ برحق شمعون (پطرس) کی پیروی کی، یہی فرقہ نصاریٰ کہلایا، دوسرے فرقے نے پولس کی پیروی کی، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لوگ نصاریٰ کو تحقیر کا لفظ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں یہ ایک معمولی اور حقیر گاؤں ناصرہ کی طرف نسبت ہے، جو علاقہ گلیل میں بیت المقدس سے ستر میل شمال اور بحر روم سے بیس میل مشرق میں واقع ہے، اس کی موجودہ آبادی آٹھ نو ہزار ہے، بعض محققین کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا آبائی وطن یہی ہے، اور آپ اسی کی نسبت سے یسوع ناصری کہلاتے ہیں "نتن ایل نے اس سے کہا کیا ناصرہ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے۔" (یوحنا ۱: ۴۵ ـ ۴۶)

آخر ناصرہ کی طرف منسوب ہونے میں حقارت کا کون سا پہلو ہے، جبکہ ان لوگوں کا یہی دعویٰ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش ہے، اور یہ کہ وہ ناصری کے لقب سے پکارے جائیں گے، انجیل میں ہے:

"اور ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا جا بسا، تاکہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔" (متی ۲: ۲۳)

قرآن کے بعض طالبین کہتے ہیں کہ اسے نصاریٰ کی وجہ تسمیہ کا پتہ نہیں، اس وجہ سے کہیں اس نے اسے نصرت سے منسوب کیا ہے اور کہیں ناصرہ کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے:

كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ	جیسے عیسیٰ ابن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ
مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ	کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے) میں میرے
الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ	مددگار ہوں گے؟ حواریوں نے کہا: ہم
(الصف: ۱۴)	خدا کے مددگار ہیں۔

بقیہ حاشیہ ص ۴۵۸ پر

اس کا اصل بانی پال ہے، اسی نے نصرانیت کو مشرکانہ اعمال، رسوم اور عقائد کا مجموعہ بنایا، نصاریٰ کی حیثیت شروع میں یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی، حضرت مسیحؑ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ اپنے پیروؤں کو ان ہی شرائع و قوانین کی پیروی کا حکم دیتے تھے جو تورات میں موجود تھے، البتہ انھوں نے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۷) یہ اعتراض قرآن کے مفہوم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اس کا مقصد نصاریٰ کی مذمت یا تحسین بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ نصاریٰ کے دو گروہوں میں سے پہلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، قرآن نے ان ہی لوگوں کی تعریف میں کہا ہے:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ۔	اور تم اہل ایمان کی دوستی سے ان لوگوں کو قریب تر پاؤگے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔
(المائدہ: ۸۲)	

پس قرآن کا ممدوح گروہ وہ ہے جو نصاریٰ کہلایا، وہ نصرانی اور عیسائی یا نصرانی اور مسیحی میں فرق کرتا ہے، مسیحی اناجیل اربعہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مسیحؑ کو خدا کا نبی نہیں بلکہ اس کا بیٹا مانتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ان کے قالب میں حلول کر آیا تھا، وہ آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں حضرت مسیح ابن اللہ کو یقین کرتے ہیں، اور خدا کو تین اقنوم میں تقسیم کرکے ایک ناقابل فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود ایک خدا ہے اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں، مگر نصاریٰ ابتداءً حضرت مسیحؑ کے سچے پیرو تھے اور ان کو نبی مانتے تھے، یہ توحید کے قائل اور اناجیل کے بجائے صرف انجیل متی پر ایمان رکھتے تھے، جب مشرکانہ عقائد کے اثرات سے اصل عیسائیت و مسیحیت جلد جلد پھیلنے لگی تو نصرانیت ناپید ہوتی گئی اور عیسائیت کا بول بالا ہو گیا، پس تمام قرآن کی تعلیمات چھان ڈالیے، قرآن کہیں بھی اس کی مدح و تحسین نہیں کی ہے، بلکہ ہر جگہ مذمت کی ہے۔ (مفردات القرآن مولانا عبدالعزیز، ص ۹۹ و ۱۰۰) ڈریپر بھی لکھتا ہے: "سیاسی معنوں میں عیسائیت نے [illegible] دنیا کے لیے چھوڑا" (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۴۶ و تفسیر ماجدی)

یہود کی تحریف کو درست کیا، اور ان کی بدعات کی اصلاح کی، ان کے خلفاء کا طرز عمل بھی یہی رہا، ڈریپر کا بیان ہے:

"سالہا سال تک مذہب عیسوی صرف تین اصولوں کی تلقین کرتا رہا یعنی حق اللہ، حق الذات اور حق العباد، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ خدائے بزرگ و برتر کی تعظیم و تکریم کرے، ذاتی طور پر نیک اور پاکباز ہو اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بھلائی کرے۔"

(معرکۂ مذہب و سائنس ص ۵۲)

مگر پال نے نصرانیت کا ڈھانچہ ہی بدل دیا اور نصاریٰ کو ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممیز کیا، اور غیر بنی اسرائیل کے لیے توریت کی پابندی منسوخ کر دی، حضرت مسیحؑ کے سچے پیروؤں نے اس پر اس سے بڑی دوڑ دھوپ کی، مگر پال کی عوامی مقبولیت کے سامنے وہ بے بس رہے، پال کے اس خود ساختہ عیسائی مذہب کو نہ اصل انجیل سے کوئی واسطہ ہے اور نہ توراۃ سے، بلکہ اس کو ماننے والے خدا کے بجائے اپنے علماء و اکابر کی بدعتوں کے پیرو ہیں، حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مسیحؑ کی بعثت بھی اسی دینِ الٰہی کی دعوت دینے کے لیے ہوئی تھی جس کی دعوت دینے کیلیے ان سے پہلے کے انبیاءؑ مبعوث کیے گئے تھے، یعنی انھوں نے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و بندگی کی تلقین کی اور ماسوا کی عبادت سے منع کیا، رومی اور یونانی مشرک اور بت پرست تھے، وہ آسمانی ہیکلوں اور زمین کے بتوں کی پوجا کرتے تھے، حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ان کے بعض تلامذہ ان لوگوں کو خدائے واحد کے دین کی دعوت دینے کے لیے پہنچے اور بعض سفراء آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد وہاں گئے، ان کی دعوت و تبلیغ سے کچھ لوگوں نے اللہ کے دین کو قبول کر لیا اور وہ ایک مدت تک اسی پر قائم رہے لیکن پھر شیطان نے بعض لوگوں کو ورغلایا جس کے نتیجہ میں وہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے، اور ان کے دین کو تبدیل کر کے ایک نیا دین

ایجاد کیا، جو حضرت مسیحؑ کے دین اور مشرکین کے دین کا مجموعہ مرکب تھا، پس یہ مشرکین اور بت پرستوں کا دین تھا اور رومیوں، یونانیوں نیز فلاسفہ کا دین تھا۔" (الجواب الصحیح ج ۱ ص ۱۱۹ و ۱۲۰)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

"نصاریٰ نے ایک نیا عقیدہ اور نام ایجاد کیا، جس کا انبیائی تعلیمات میں وجود نہیں، نہ حضرت مسیحؑ اور نہ کسی دوسرے نبی کے کلام میں کہیں اللہ کے اقانیم کا ذکر ملتا ہے، نہ تین کا، نہ زیادہ کا، نہ کہیں صفات ثلاثہ کا ثبوت ہے، نہ کہیں کسی صفت الٰہی کو ابن اللہ یا رب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ اللہ کی حیات کو روح کہا گیا ہے، اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک فرزند ہے جو ازلی ہے اور ازل سے وجود میں آیا ہے، وہ اپنے باپ کے جوہر سے ہے، اور وہ بھی اسی طرح خالق ہے جیسے کہ اللہ خالق ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے اقوال جو کلمات کفریہ پر مشتمل ہیں کسی نبی سے بھی منقول نہیں۔ (الجواب الصحیح ج ۲ ص ۱۴۴)

نصاریٰ نے دو دینوں کی آمیزش سے ایک دین ایجاد کیا، ایک توحید کی دعوت دینے والے خدا کے پیغمبروں کا دین تھا، اور دوسرا مشرکین کا دین، اس لیے ان کے دین کا ایک حصہ تو انبیاءؑ کی تعلیمات کا ہے، اور دوسرا ان نئے اقوال و افعال کا ہے جو انھوں نے مشرکین کے دین سے لے کر اس میں شامل کیا ہے، اقانیم کے الفاظ ایجاد کیے، جن کا انبیاء علیہم السلام کے کلام میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔"[1]

قسطنطین کے زمانہ سے سلاطین روم نصرانیت کے حامی ہو گئے، اس کے بعد پوپ کے جو احکام روا کیے جاتے ان کے متعلق بادشاہ کا یہ فرمان جاری ہوتا کہ ان کی خدائے قادر مطلق کے احکام کی حیثیت سے پیروی کی جائے، شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"نصاریٰ کے عقائد، احکام اور ان کی شریعت ان کے اکابر، علماء اور رہبان ایجاد و وضع کرتے رہے چنانچہ قسطنطین بادشاہ کے زمانہ میں تین سو اٹھارہ (۳۱۸) آدمیوں نے وہ عیسائی عقیدہ تیار کیا جس پر متفق

---

[1] الجواب الصحیح ج ۳ ص ۱۹۹۔

عیسائی قوم نے اتفاق کیا ہے کہ یہ خبر [illegible] کے خلاف تھی جو [illegible] حضرت [illegible]
کسی اسلامی کتب میں شامل نہیں تھا بلکہ تمام اسلامی کتابوں کی خلاف [illegible] مسیح کے مخالف ہیں" (گلاب المسیح، [illegible])
اس امر کا اعتراف خود مسیحی علماء کو بھی تھا، ایک فرانسیسی مصور موسیو آتین ڈینیہ لکھتے ہیں :

"وہ انجیل جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو ان کی اور ان کی قوم کی زبان میں بھیجا تھا اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ گم شدہ چیز ہے اور اب اس کا کوئی اثر و نشان بھی باقی نہیں رہ گیا" (مسیحیت اور تعلیم یسوع چاپ اردو ترجمہ ص ۱۰)

ڈاکٹر نظمی لوقا فرماتے ہیں :

"مسیحیت سے میری مراد وہ ہے جو حضرت مسیحؑ کی تعلیمات اور ان کی تصریحات پر مبنی ہے نہ کہ وہ جو ان کے کلام اور سیرت میں بعد کے اضافے اور تاویلیں ہیں" (ایضاً، ص ۲۹)

ایک جرمن عالم فرونڈ بائیر جو ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۰ء تک ٹوبنگن میں الٰہیات کے پروفیسر رہے وہ تحریر کرتے ہیں :

"عہد جدید کی کتابیں زیادہ تر سینٹ پال کے خیالات کا آئینہ ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ نیقیہ کے مشہور اجلاس کے بعد جب مسئلہ تثلیث مسلمہ اصول دین قرار پایا تو حضرت عیسیٰ کی پاکیزہ تعلیمات بت پرستوں کے عقائد کے قالب میں ڈھال دی گئیں، گویا روما کے بھیڑیے نے ناصرہ کے برہ کی کھال اوڑھ لی، یعنی بت پرستی عیسائیت کی شکل میں نظر آتی ہے" (بحوالہ تاریخ صحف سماوی ص ۶۶)

اور جب اصلی انجیل اور حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیمات ہی باقی نہیں رہیں تو ظاہر ہے مسیحیت اپنے اصلی قالب میں کیسے باقی رہتی، چنانچہ ڈریپر کا بیان ہے :

"حقیقت یہ ہے کہ سیویرس کے زمانہ کی عیسائیت اور قسطنطین کے زمانہ کی عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے، (ص ۶۱) ..... اس خیال سے کہ بت پرستوں کے دلوں میں شکستہ خاطر [illegible] [illegible] خاص اور نو شہادتیں بنانا ضروری ہے، قسطنطین نے اپنے عہد [illegible] کے [illegible] و [illegible] [illegible] کیا بلکہ [illegible] کی [illegible]

[illegible] حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار سب سے زیادہ مصر پہنچنے والے اس کے خاندان کے اندر
تھا۔ (ص ۹۳) ...... جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان مذہبی عقائد کی تفصیل شارحین نے بیان کی ہے
متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پیچیدہ اختلاط سے ملے جلے مذہب کی شکل اختیار کرنے لگے، ان عقائد میں تدریجاً
چند خدا، صنم پرستی کا عنصر شامل ہو گیا، اولیس تو وہی پہلا سا موجود ہو گیا، مگر دیوتاؤں کے نام بدل دیئے گئے
مصلحت سے کیونکہ مصریوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی، وہاں کے باشندوں نے علی رغم مذہب شاہی اپنے قدیم عقائد
اختیار کر لیے، عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، نہ صرف آئیسس کی پرستش
بہ تبدیلی نام ازسرنو ہونے لگی، بلکہ اس کا بت بھی جو کسی زمانہ میں ایک ہلال قوس پر رکھا ہوا نظر آتا تھا،
ازسرنو نمودار ہو گیا۔ (ص ۹۵ - ۹۶) ..... فاضل مصنف نے قیصر اگسٹس سے بہ لہجۂ ملامت آمیز الفاظ
میں خطاب کیا، تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق رہا، اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ
اور ان کی جماعت علیحدہ، ورنہ افعال دونوں کے یکساں سے ہیں۔ (ص ۹۶ - ۹۷) ..... پادری موصوف کا
خیال ہے، "کیا آج کل اولیاء و ملائکہ کی پرستش ہر اعتبار سے زمانۂ سابق کی پرستش شیاطین سے مشابہ نہیں ہے؟
صرف نام کا فرق ہے، باقی سب کچھ یکساں ہے، بت پرست اپنے بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے، عیسائیوں نے
اپنے بزرگانِ دین کو خدا بنا رکھا ہے۔ (ص ۹۹)

(۳) حضرت مسیحؑ کے بعد تین صدیوں تک ان کے متبعین کو سخت حالات اور مشکل دور سے گذرنا پڑا، اس زمانہ میں نصرانی مذہب بہت مغلوب رہا اور حضرت مسیحؑ کی جانب نسبت جرم ہونے کے مترادف سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس کو نصاریٰ کا دورِ ابتلاء کہتے ہیں، اس دور میں ان پر رومیوں کا سیاسی تسلط اور مذہبی حیثیت سے یہودی ان پر حاوی تھے، علاوہ ازیں خود عیسائیوں کے باہمی شدید اختلافات کی وجہ سے ان کے اندر متعدد فرقے پیدا ہو گئے تھے، تیسری صدی میں حضرت مسیحؑ کی ذات کے متعلق مختلف عقیدے پائے جاتے تھے، چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء میں عیسائیوں کی [illegible] ان کی

خاتمہ ہوا کیونکہ [illegible] میں قسطنطین روم کا بادشاہ بنا، اس نے عیسائیت قبول کر کے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی دلچسپی لی، کئی بڑے بڑے شہروں میں کلیسا تعمیر کرائے اور عیسائی علماء کو مذہبی تحقیقات کے لیے وقف کر دیا، ان علماء کی مختلف کونسلوں نے باقاعدہ عیسائی عقائد کو مدون و منضبط کر دیا۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ برپا رہتی تھی، رومیوں نے اپنے کو ایرانیوں سے ممتاز اور فائق ہونے کے لیے مسیحی مذہب قبول کر لیا، جس کے خلاف وہ برسوں سے صف آرا تھے، اس بنا پر وہ غور و فکر کے بجائے محض سیاسی مصالح کی بنا پر حلقہ بگوش عیسائیت ہوئے تھے، اس صدی میں رومی حکومت دو[2] حصوں میں بٹ گئی تھی، مشرقی رومی حکومت، اور مغربی رومی حکومت، اول الذکر کو بازنطینی حکومت بھی کہا جاتا ہے، اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، قسطنطین نے یہ شہر تعمیر کرایا تھا، اور وہی بازنطینی حکومت کا پہلا بادشاہ تھا، وہ بت پرست تھا اور سیاسی اسباب کی بنا پر عیسائیوں کی حمایت کرتا تھا، اس نے ۳۲۵ء میں ایلیا کو عیسائیت کا مرکز قرار دیا۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ نکلا کہ رومیوں کے اندر سے مشرکانہ عادتیں اور رسمیں ختم نہیں ہوئیں، اس بنا پر مسیحیت فلسفہ اور مشرکانہ تصورات کا مجموعہ بن گئی، بلکہ فلسفہ کو شریک غالب کی حیثیت حاصل ہو گئی، اس طرح اقانیم ثلاثہ کا عقیدہ عمل میں آیا۔

قسطنطین کے زمانہ کے لوگوں نے بھی عیسائیت کو سچا اور صحیح دین سمجھ کر نہیں قبول کیا تھا بلکہ ان کا اولین مقصد ذاتی اور سیاسی فائدے حاصل کرنا تھا۔ ڈریپر نے معرکۂ مذہب و سائنس میں مذکورہ بحث مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

حق اور کامیاب جماعت کے ساتھ اب جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور رتبے

بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جنہیں مذہب کا شعور یا اس کی پرواہ تک نہ تھی مسیحیت کے سب سے
زیادہ پرجوش حامی ہو گئے، چونکہ وہ بنیادی طور پر بت پرست تھے بلکہ مشرک و بت پرست تھے، لہٰذا ان کے
شامل ہونے سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی، قسطنطین نے کہ
وہ بھی ان ہی کا ہم مشرب تھا، کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا
سد باب ہو، قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گذری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں
جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کا جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے" (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۵۰)
آگے لکھتے ہیں:

"اس اختلاط (بت پرستی اور مسیحیت) سے جو عظیم الشان نتیجہ مرتب ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی جماعت
دولتمند ہو گئی اور اس کے سیاسی اقتدار کا پلہ بھاری ہو گیا، سرکاری مالگذاری کی رقم خطیر کا ایک بہت بڑا
حصہ کلیسا کے خزانوں میں داخل ہونے لگا، اس دولت پر دست مسابقت دراز کرنے والوں کی
تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین عیسوی کی حمایت کا جامۂ ریائی پہن کر
حقیقت میں اس کے دنیوی فوائد سے مستفید ہونے کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا" (ص ۹۲)

مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"۳۹۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہو گئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم
نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت
اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت
کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ، بیٹے اور روح القدس کی تثلیث الوہیت میں ہر نیا ملک جو
فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا، تخت سلطنت کے غیر مذہبی
عنصروں نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذاہب شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع

اس کے پیچیدہ عقائد کی وہ لڑائیاں لڑی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خود مسیحیوں کا خاتمہ کیا، اتحاد و اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔" (سیرت النبی ج ۴ ص ۲۱۹)

جب مختلف اشخاص اپنے اپنے ذوق و اغراض کے ساتھ نصرانیت میں داخل ہوئے تو ان کی کشمکش سے اس کے اصل اصول و بنیادی عقائد معدوم ہو گئے اور بت پرستی کے اثرات اس میں شامل ہو گئے، اس امتزاج سے ایک نیا دین وجود میں آیا جو نصرانیت اور یونانی و رومی فلسفہ کا ملغوبہ تھا، مصر کے قبطی النسل عالم و محقق مجدی مرجان لکھتے ہیں:

"اسلام ہی نہیں آسمانی پیغام کے حامل تمام مذاہب سے نصرانیت کا بنیادی اختلاف اللہ کی اس گڑھی ہوئی اور بگڑی ہوئی صورت کی وجہ سے ہے جس کو بت پرستی نے نصرانیت کو ختم کرنے کے لیے اس میں داخل کر دیا ہے۔"

ڈریپر کا بیان ہے:

"دولت روما کی حکمت عملی نے عہد قدیم کی عیسائیت میں بت پرستی کا عنصر ملا کر سلطنت کے باشندوں کو کفار مسیحی نما بنا دیا تھا، بت پرست اور عیسائی بلحاظ عقائد ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں فریق ایک دوسرے میں مذہبی طور پر ضم ہو گئے تھے، عیسائیت نے بت پرستی میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں اور بت پرستی نے عیسائیت کو بہت کچھ متغیر کر دیا تھا، یہ دونوں مذہب دولت روما کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔" (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۴۴)

عیسائی تاریخ کے ابتدائی عہد میں جب ان پر مظالم کا سلسلہ موقوف ہوا اور قسطنطین کو نصرانیت [illegible] تھیوڈوسیس نے اس مذہب کو مستحکم کرنے اور عیسائیوں کے اختلافات ختم کرنے کی غرض سے [illegible]

[illegible] کی کوشش۔

کے لگوں کر دیا گیا، [illegible] کی نیقیہ کونسل میں تثلیث کے عقیدے کو عیسائیت کے بنیادی عقیدے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا، اور پال نے حضرت مسیحؑ کی ابنیت و الوہیت کا جو عقیدہ گھڑا تھا، اسے بھی باقاعدہ تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ گو اس کی مخالفت بھی کی گئی، مگر وہ بے اثر رہی جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

(۳) نصاریٰ کے تساہل اور بے جا رواداری نے بھی نصرانیت میں بت پرستی کو در آنے کا موقع دیا، جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ گو نصاریٰ کی حیثیت یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی، مگر حضرت مسیحؑ اور ان کے متبعین پر انھوں نے بڑے مظالم ڈھائے، ان مظالم سے تنگ آکر نصاریٰ نے فلسطین کے بجائے یورپ کا رخ کیا، اور یہودی ماحول چھوڑ کر رومی و یونانی بت پرستوں میں نصرانیت کی تبلیغ کرنے لگے، مگر ان کو یہ خوف واندیشہ برابر لاحق رہا کہ کہیں رومی و یونانی قبائل کی طرف سے بھی ان کو ان ہی مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے جن کو وہ یہودیوں کے ہاتھوں جھیلتے رہے ہیں، اس لیے نصرانیت کے داعیوں اور مبلغوں نے اس میں بت پرستی کے اثرات داخل ہوتے دیکھ کر بھی خاموشی اختیار کی اور بت پرستوں کے رسوم و عادات اور طور طریقوں کو گوارا کرنے پر آمادہ ہو گئے، ممکن ہے ان کی نیتیں نیک رہی ہوں اور وہ سمجھتے رہے ہوں کہ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ بت پرستوں کو نصرانی مذہب کے قریب کر سکتے ہیں، حافظ ابن قیمؒ نے بھی اس کی جانب اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"جب نصاریٰ نے دیکھا کہ فلسفہ نے ان کے صحیح دین کو کھو دیا، اور دوسرے مذاہب نیز اہل فلسفہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو نصرانی اصول و احکام میں ایسی لچک پیدا کرنا شروع کر دیا کہ ہر مذہب و مسلک کے لوگوں کے لیے اس کے دین میں گنجائش نکل سکے، چنانچہ یہ دیکھ کر کہ فلاسفہ عقل، عاقل اور معقول کے اتحاد کے قائل ہیں، انھوں نے بھی باپ بیٹے اور روح القدس کا نقشہ اپنے یہاں تیار کر لیا۔" (اغاثۃ اللہفان ص ۳۷۲)

ان کو خوش فہمی تھی کہ امتدادِ زمانہ سے کفر و شرک کی آلائشیں خود بخود دور ہو جائیں گی اور غلط رسوم و عادات اور نامناسب طور طریقوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور نصرانیت مشرکانہ اعمال و عقائد سے پاک [illegible]

یعنی اپنی اصل اور صحیح حالت پر لوٹ آئے گی، لیکن عملاً اس کے برعکس ہوا۔

اس مداہنت اور رواداری کا یہ اثر ضرور ہوا کہ بت پرست قبائل کا میلان نصرانیت کی جانب ہوگیا، لیکن انھوں نے اپنے رسم ورواج، بت پرستی کے طور طریقے اور مشرکانہ عقائد وتصورات بھی اس کی طرف منتقل کر دیے، جن کی طرف سے نصرانیت کے داعیوں نے پہلے مرحلہ میں چشم پوشی برتی اور اغماض سے کام لیا، تاکہ بت پرست نصرانیت سے بیزار نہ ہوجائیں، آئندہ ان کی اصلاح ہوجائے گی، اور وہ عقیدۂ صحیحہ اور توحید خالص پر راسخ واستوار ہوجائیں گے، لیکن ان کی توقعات کے برعکس بت پرستوں کے طور طریقے اور مذہبی شعائر ورسوم خود عیسائیت پر اس طرح غالب آگئے کہ اس پیغام کی روح بالکل محو اور مسخ ہوگئی جس کو لے کر سیدنا مسیحؑ دنیا میں تشریف لائے تھے، چنانچہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ احکام الٰہی میں تغیر وتبدل ہونے لگا، اور ان کی جگہ انسانوں کے احکام وقوانین نصرانیت کا جزء بنتے گئے، حقائق مغلوب ہوگئے اور اوہام وخرافات کے راستے کھل گئے، غرض وہ مداہنت پسندانہ رویہ جو بت پرستوں کے مقابلہ میں نصرانی مبلغوں نے اختیار کیا تھا، وہی وثنیت اور شرک کے اس پر غالب آنے کا سبب بن گیا، اور اسی نے اسے بت پرستی کی راہ پر گامزن کر دیا، پروفیسر نواب علی لکھتے ہیں:

"ابتداء میں حواریوں کا دائرہ تبلیغ صرف یہود اور ان کے شہروں تک محدود رہا، لیکن جس وقت پال جو پہلے دین عیسوی کا سخت دشمن تھا، اور حواریوں اور ان کے متبعین کو سخت اذیتیں دیا کرتا تھا تائب ہو کر حلقہ میں داخل ہو گیا اور برنباس کے ہمراہ انطاکیہ وغیرہ میں جہاں اقوام غیر یہود جن کو جینٹائل کہتے ہیں آباد تھیں، منادی شروع کی تو یہ سوال اٹھا کہ جو غیر یہود ایمان لائیں ان پر احکام توریت کی پابندی لازم ہے یا نہیں، یہ قضیہ حلہ بیت المقدس میں اپاسل مسیحؑ کے روبرو پیش ہوا فیصلہ توریت کے بموجب کچھ کیا، اس کا ذکر کتاب اعمال میں ہے ..... حواریوں کے اس اجتماع کے بعد حکم چلا نے یہود کی سخت گیری اور ظاہر پسندی کو توڑ کر شریعت موسوی کا آسان مسلک

اقوام غیر یہود کے سامنے پیش کر کے ان کو اپنے دین میں داخل کر لیا، لیکن سنہ ۷۰ء میں جب تمام حواری دنیا سے رخصت ہوگئے، اور یروشلم کو رومیوں نے فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا اور یہود کی قومیت کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا تو غیر یہود اقوام نے حواریوں کی رخصت شریعت کو اباحت اور پھر بدعت میں ڈھال دیا، بہت سے جعلی خطوط حواریوں کی طرف منسوب کر دیے گئے، شریعت موسوی سے علانیہ بیزاری ظاہر ہونے لگی، نئے نئے عقائد کی بنیاد رکھی گئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں فرقہ آرائیوں کا بازار گرم ہوگیا۔

نیقیہ کونسل نے بالاتفاق اریوس کے اس عقیدہ کو کہ باپ کے مقابلہ میں بیٹا ازلی نہیں ہو سکتا، کفر قرار دیا، کونسل کے فتویٰ کو قسطنطین نے بزور حکومت نافذ کر دیا، اب مسئلہ تثلیث دین عیسوی کا مسلّم مسئلہ ہوگیا، اور غیر یہود یعنی رومیوں، یونانیوں اور مصریوں کے توہمات اور رسومات دین عیسوی کے شریک غالب ہوگئے، یہاں تک کہ سو برس کے بعد حضرت مریمؑ کی پرستش بھی بحیثیت خدا کی ماں کے جزو دین ہوگئی، اگرچہ قسطنطنیہ کے بطریق نسطور نے ۴۲۷ء میں اس نئی بدعت کی سخت مخالفت کی، لیکن اب جاہلی عنصر اس قدر غالب تھا کہ نسطور اور اس کے متبعین بھی دین سے خارج کر دیے گئے۔" (تاریخ صحف سماوی ص ۵۳ تا ۵۵)

ڈریپر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن یہ قدرت اسے (عیسائیت کو) پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کر سکے، دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہوگئے، اور ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا، جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں .... عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر غالب ہوگیا"

(معرکۂ مذہب و سائنس، اردو ترجمہ ص ۴۲ و ۴۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اور نو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس عمل سے چنداں اختلاف نہ تھا، اس لیے شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی، اور آخر کار بت پرستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا (ص ۹۳) مرور قرون نے عیسائیت اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا۔" (ایضاً)

ایک مسیحی پادری الیاس اپنی کتاب 'یسوع مسیح' میں لکھتا ہے:

"کلیسا نے بت پرستانہ افکار مسیحی افکار میں داخل کر دیے، اس کے فرستادوں نے تورات کے قانون اور انجیل کے مواعظ یونان کو دے کر ان سے تعبیر کی وقت حاصل کی، اس کے نتیجہ میں ایک نیا سرمایہ وجود میں آیا جس کو انھوں نے روم کی طرف منتقل کیا، نیز کلیسا نے ان قبائل کی رسموں اور مختلف گروہوں کے طور طریقوں کو قابل احترام قرار دے کر ان کی حفاظت کا ذمہ لیا، اس طرح توحید کے اعتراف سے اپنے کو آزاد اور دستبردار کر لیا۔"[1]

اس سے قبل بتایا گیا تھا کہ نصرانیت کی روح ختم ہونے کا سبب (۱) ذہنی جمود (۲) اور زندگی سے بے تعلقی تھی۔ ذیل میں اس کے ثبوت میں چند بیانات نقل کیے جاتے ہیں:

قاہرہ یونیورسٹی کے دار العلوم کالج میں اسلامی تاریخ و تہذیب کے ایک پروفیسر ڈاکٹر احمد شلبی اپنی کتاب "مقارنۃ الادیان عن المسیحیۃ" (مسیحیت سے دوسرے مذاہب کا تقابل) میں لکھتے ہیں:

"نصرانیت پر بڑے سخت دور آئے اور وہ شدید مظالم کا شکار ہوئی، ان مظالم کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ اسے اپنا بہت کچھ گنوا دینا پڑا، یہاں تک کہ اس کی اصلیت اور روح ختم ہو گئی اس کو اپنے بہت سے افراد سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، اس سلسلہ میں سب سے اہم شخصیت خود حضرت مسیح کی

---

[1] مجلۃ الوعی الاسلامی، کویت۔

اسی طرح نصرانیت نے اپنے بنیادی ماخذ و مراجع بھی کھو دیے، چنانچہ آج حضرت مسیحؑ کی اصل انجیل کا پتہ ہی نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ اب اس مذہب کا کوئی صحیح و مستند ماخذ نہیں کیونکہ اصل انجیل تو غائب اور معدوم ہو چکی ہے۔[1]

عبدالرحمٰن بیگ باجہ جی زادہ لکھتے ہیں :

"نصاریٰ پر مجبوری اور اضطرار کا جو دور گذرا وہی صحیح انجیل کی گمشدگی کا باعث بنا، اور اسی بنا پر وہ متعدد اناجیلوں کے چکر اور نئے نئے باطل و واہی خیالات کے جال میں پھنس گئے، اس کو خود اس کثرت سے عیسائی علماء و مورخین نے بیان کیا ہے کہ اس کی تردید ناممکن ہے، انھوں نے اپنی متعدد کتابوں میں نصرانیت کے حالات، اس کے اندر رونما ہونے والے فسادات اور عقائد میں فتور وغیرہ کی پوری صراحت و وضاحت کر دی ہے، در اصل یہی مجبوریاں نصرانیت کے سارے فساد کی جڑ ہیں۔" (الفارق بین المخلوق والخالق)

(۵) نصاریٰ کی گمراہی اور کفر و شرک کی خباثت میں پڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کی کتاب کے الفاظ اور انبیاء علیہم السلام کی اصطلاحات و تعبیرات کا صحیح منشا و مدعا نہ سمجھا، علاوہ ازیں انھوں نے بہت سے لفظوں کا مفہوم بدل دیا، انبیاء کی زبان اور طریقۂ بیان نہ سمجھنے کی بنا پر انھوں نے اَب، ابن اور روح القدس کے معنیٰ سمجھنے میں غلطی کی، اور یہی غلطی ان کے عقائد کے فساد کا سرچشمہ بنی اور وہ حلول و تثلیث کے گورکھ دھندے میں پڑ گئے، امام ابن تیمیہؒ نے جابجا اس نکتہ کی وضاحت کی ہے، ان کے بیان کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کیے جائیں گے :

"نصاریٰ انبیاء علیہم السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ انھوں نے اب اور ابن کے الفاظ استعمال کیے، حالانکہ ان کی خود اب سے مراد رب اور ابن سے مقرب اور محبوب تھی، کسی نے بھی ان سے یہ نقل نہیں کیا ہے کہ

[1] الوعی الاسلامی الکویت۔

انھوں نے صفاتِ الٰہی میں سے کسی صفت کو لفظ ابن سے تعبیر کیا ہو اور نہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے متعلق یہ کہا ہو کہ اس کا اس سے تولد ہوا ہے یا وہ اس کی مولود ہے، پس اگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں یہ آتا ہے کہ باپ بیٹے اور روح القدس کو بپتسمہ دو تو لفظ ابن کی یہ تفسیر کرنا کہ وہ اللہ کی ایک قدیم اور ازلی صفت ہے..... حضرت مسیحؑ پر محض افترا ہے، اس لیے کہ ان کی زبان میں ابن سے مراد اللہ کی قدیم ازلی صفت نہیں تھی..... ابن اور روح القدس کے الفاظ حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسروں کے حق میں خود نصاریٰ کے یہاں آئے ہیں، ان کا بیان ہے کہ حواریوں نے کہا، حضرت مسیحؑ نے ان سے فرمایا کہ اللہ میرا اور تمھارا باپ ہے، اور میرا اور تمھارا معبود ہے، تورات میں ہے کہ رب نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: "فرعون کی طرف جا، اور اس سے کہہ کہ رب کہتا ہے، اسرائیل میرا پلوٹھی کا لڑکا ہے، اس کو چھوڑ دے تاکہ وہ میری عبادت کرے، اگر تو نے میرے پلوٹھی کے بیٹے کو چھوڑنا منظور نہ کیا تو میں تیرے پلوٹھی کے بیٹے کو قتل کر دوں گا" جب فرعون نے بنی اسرائیل کو نہ چھوڑا تو جیسے خدا نے کہا تھا خدا نے فرعون اور فرعون کی قوم کے پلوٹھی کے بیٹوں کو قتل کر دیا..... مزامیر داؤد میں ہے: "تو میرا بیٹا ہے، تو مجھ سے سوال کر میں دوں گا" اور انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول نقل ہوا ہے: "میں اپنے اور تمھارے باپ اور اپنے اور تمھارے معبود کے پاس جاتا ہوں" اور فرمایا: جب تم دعا کرو تو کہو کہ اے ہمارے باپ جو آسمان میں ہے، قدوس تیرا نام ہے، ہمیں فلاں فلاں نعمتیں عطا کر..... نصاریٰ کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ انبیاءؑ کے صریح اور واضح کلام کو چھوڑ کر وہ ایسی تاویلات کے درپے ہو گئے جن پر ان کا کلام سرے سے دلالت ہی نہیں کرتا تھا چنانچہ ابن کا لفظ جہاں کلام میں جہاں آتا ہے وہاں اس سے اللہ کی کوئی صفت مراد نہیں ہوتی بلکہ اس کا دوست اور محبوب مراد ہوتا ہے" (کتاب ...، ۳، ص ۱۵۵)

یک ... تورات و انجیل میں حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسرے اشخاص کے لیے بھی

---

۱ کتاب ... ۳، ص ۱۰۱ و ۱۰۲، ۲ ایضاً ص ۱۰۵ و ۱۰۴۔

استعمال ہوا ہے، اس لیے اس کی نوعیت مجاز، کنایہ اور محاورہ وغیرہ کی ہے، ملاحظہ ہو:

"تورات، زبور، انجیل اور انبیاءؑ کی پیشین گوئیوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے حضرت مسیحؑ کے متعلق خصوصیت سے یہ ثابت ہو کہ ان کو الوہیت کا اتحاد و حلول حاصل تھا، جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے، ان کی خصوصیت بس اتنی ہی ہے جتنی اس آیت میں مذکور ہے:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ[لہ] أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ (نساء: ۱۷۱)	مسیح عیسیٰ بن مریمؑ تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں

نصاریٰ انبیاء کے جن الفاظ و اقوال سے حضرت مسیحؑ کی الوہیت پر استدلال کرتے ہیں یہ تمام الفاظ و کلمات حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسروں کے متعلق بھی آئے ہیں، اس لیے ان کو الوہیت کے ساتھ مخصوص کرنا بے اصل بات ہے، مثلاً ابن، مسیح، روح القدس کا آپ میں حلول کرنا یا آپ کو الٰہ کے لفظ سے یاد کرنا، یا آپ کے اندر رب کا ظہور یا حلول کرنا یا ساکن ہونا، یا اس کی جگہ پر ساکن ہونا وغیرہ یہ سب الفاظ دوسروں کے لیے بھی موجود ہیں، اور اس سے وہ الٰہ ثابت نہیں ہوتے۔"

(باقی)

لہ اس آیت میں عیسائیوں کے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت و ابنیت کی تردید اور حضرت مسیحؑ کی اصل حیثیت واضح کی گئی ہے کہ وہ مریم کے بیٹے ہیں، بھلا ایک جنا ہوا شخص خدا اور خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، ان کی خصوصیت صرف اس قدر ہے کہ وہ اللہ کے ایک رسول ہیں جن کی ولادت ایک کلمۂ کُن سے ہوئی، اس کلمہ کو اللہ نے حضرت مریمؑ کی طرف القا کیا تھا، اور ان کو روح بھی خدا نے اپنی جانب سے بخشی تھی، ان کی ولادت سے دھوکہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ٹھیک اسی طرح کلمۂ کُن سے ہوئی ہے جیسے حضرت آدمؑ کی تخلیق کی گئی، اور دونوں کے اندر یکساں طور پر روح پھونکی گئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ وجود و زندگی سب کی خدا ہی کے حکم سے اور اس کی عطا کردہ روح سے ہے۔

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کی فتنہ انگیزیاں

" اندور کے جناب عبدالحمید صاحب نے دارالعلوم ندوہ کے سمینار میں یہ مقالہ پڑھا، اس کی تلخیص ذیل میں درج ہے "

ایک عرصے سے مستشرقین، اسلام اور اس کے متعلقات پر لکھتے رہے ہیں، انھوں نے اسلامی لٹریچر میں بڑا اضافہ بھی کیا ہے، ان کی تحریریں عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں لیکن اُن کی [illegible] کاوشوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اسلام کی نشر و اشاعت کم اور [illegible] پر اعتراض زیادہ ہے،

حال میں ایک اردو روزنامے سے اطلاع ملی کہ گزشتہ دہائی میں صرف امریکہ میں اسلام سے [illegible] تقریباً تیس ہزار کتابیں شائع ہوئیں، ان کے علاوہ رسائل و جرائد میں مضامین اور [illegible] بچے شائع ہوئے، اور ریڈیو اور ٹی وی پر مضامین پیش کئے گئے،

اسلام پر اس خاص توجہ کا یقیناً کوئی جذبہ و محرک ہے جو اب [illegible] پوشیدہ نہیں [illegible] [illegible] ہے جس میں یہ بات [illegible] قرآن [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اسلام [illegible] [illegible]

کیا جاسکتا ہے جیسے مستشرق ڈبلیو منٹگمری واٹ اپنی کتاب محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین میں لکھتا ہے،

"اس کا قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ نماز کے پانچ اوقات کا تعین (حضرت) محمدؐ کے زمانۂ حیات میں ہوا، بلکہ بعد کی چیز ہے، (ص ۱۰۰) .... (حضرت) محمدؐ (حضرت) زیدؓ سے ملاقات کی نیت سے [illegible] ان کے گھر گئے، زید موجود نہیں تھے، لیکن آپ کی نظر ان کی بیوی زینب پر پڑی، جو ناکافی لباس میں تھیں، نظر پڑتے ہی آپ ان پر فریفتہ ہوگئے ...... (حضرت) خدیجہؓ کے سوا آپ کی تمام ازواج نوجوان تھیں، اور اکثر تو نوعمر تھیں ...... اس کے کبھی شواہد نہیں ملتے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی اس عیش کوشی اور شہوت رانی کو ناپسند کرتے ہیں، (ص ۱۵۵، ۱۵۶) .... دوسری جگہوں کی طرح عرب میں بھی یہ تصور تھا کہ اگر مرد و عورت کہیں تنہا رہ گئے تو اس کا نتیجہ جنسی تعلق ہی ہوگا ...... آخر کار (حضرت) محمدؐ نے اس معاملہ کا فیصلہ (حضرت) عائشہؓ کے حق میں کیا، ان کے خلاف کوئی مضبوط شہادت نہ تھی، اس درمیان میں زیادہ وقت گذر گیا جس سے یقین ہوا کہ وہ جانبدار نہیں ہیں،"

(ص ۱۶۴-۱۶۵)

سفیروں اور قاصدوں کے بارہ میں اس قدر کسی غلطی کا تصور نہ تھا، منٹگمری واٹ [illegible] کتاب بھی اسی طرح جا بجا رسول اللہؐ کی ذات مبارک [illegible] [illegible]

انھوں نے ایک ہی قسم کا رویہ اختیار کیا۔ قافلوں کو روکنا، ان کو لوٹ لینا دشمن کو قتل یا پھر قید کر لینا، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لینا۔ لیکن ان حملوں کے بعد وہاں کی مجلسوں میں حضرت محمد (صلعم) کی گفتگو مختلف توضیحات اور دوسرے ہی رنگ میں نظر آتا (ص ۱۰۲) ...... وحی رسالت کے زمانہ میں موسیٰ نوح، یوحنا اور عیسیٰ کے عظیم سلسلہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا پیام وہی ہے جو ان پیغمبروں کا تھا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قصوں کو انھوں نے یہودی ماخذ سے لیا ہے، جیسا کہ پہلے دعویٰ کیا گیا ہے، یا پھر ان کا ماخذ شامی عیسائی ہیں جیسا کہ اب کہا جاتا ہے (ص ۱۰۲) ...... یہ (حضرت عمرؓ) تھے جو مدینہ کی ہجرت میں آپ کے رفیق تھے (ص ۱۰۳) ...... مکہ میں (حضرت) محمد کی حیثیت ایک پیغمبر کی تھی، مدینہ میں وہ ایک منصوبہ ساز سیاست داں ہو گئے، جہاں وہ مسلمانوں کی مدافعت کرنے اور ان کو ایک نئی کمیونٹی بنانے میں مشغول رہے (ص ۱۰۴) ...... مدینہ میں کافی مشکلات پیدا ہو گئیں جن سے اس کی صورت حال نازک ہو گئی، یہ ایک چھوٹا سا نخلستان تھا، مسلمانوں کی روز افزوں آبادی کے پیش نظر غذا کی فراہمی ایک مسئلہ تھی، اس لئے مکہ جانے والے قافلوں پر حملے کئے گئے، اور ریگستانوں میں ان کو لوٹا گیا (ص ۱۰۵) ...... بعد کے ناقدین کا یہ الزام ہے کہ انھوں نے اپنی تحریک کے لئے وحی و الہام کو اپنی سہولتوں کی خاطر گھڑ کر پیش کیا، فقط یہ کہ فرشتہ نے آپ کو حکم دیا کہ شہر حرم (ماہ حرام یعنی صلح کے مہینوں) میں جنگ [illegible] ان میں جنگ کرنا اس سے بھی بڑھ کر

ابتدائی علامت ہے۔ (ص ۲۸۔ ص ۲۱۲) ..... کہ کے پیغمبر اپنے متبعین کو تو [illegible] کی سختی سے تاکید کرتے تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ خود عیاش شخص تھے۔ (ص ۱۰)

ایک دوسری کتاب "دی سوشل اسٹرکچر آف اسلام" مولفہ ریوبن لیوی، کیمبرج سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں،

"اب تک یہ سوال حل طلب ہے کہ آپ اپنے پیغام کو اپنی سرزمین تک محدود رکھنا چاہتے تھے یا اس سے باہر بھی اس کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے، (ص ۲۰۱) ..... وہ اپنی وحی والہام میں کثرت سے انجیل کی ان ناقص اور گنجلک روایتوں کو بیان کرتے جو انھوں نے یہودیوں یا عیسائیوں سے سنی تھیں اور وہ اس سے اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ (ص ۳) ..... جیسے ہی ان کے پاس اسلحہ فراہم ہو گئے، تو وہ جذبۂ انتقام میں مکہ کے کفار کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھے اور اپنے پیروؤں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ خدا کی راہ میں جنگ ہے، مکہ کی روایتی اور مقدس جگہ پر قبضہ کرنا، ان کے لئے ایک ذاتی وقار کی بھی بات تھی، (ص ۲۰) ..... جہاں تک اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومتوں کی وسعت کا تعلق ہے، شروع میں یہ نظر انداز کرنے کے لائق تھا کیونکہ عرب، ترکوں کی طرح لوٹ مار کر کے مطمئن ہو جاتے، اُن کو اپنی فکر مستقل طور پر رہی (ص ۵۴) ..... جب (حضرت) محمد[2] نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو وہ قبیلۂ قریش کے باضابطہ فرد تھے، لیکن وہ ادنیٰ درجہ کی نسل سے تھے، ان کا پیشہ اونٹ چرانا تھا اس لئے ان کو کامیابی حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹیں رہیں۔ (ص ۷۶) ..... اس کے بعد آپ سے رشتہ داری، شرافت و نجابت کے لحاظ سے [illegible] فیصلہ کن تھی کہ آپ سے [illegible] کی قربت بھی [illegible]

میں شامل ہونے کا فدیہ بن گئی، اور اعلیٰ امتیاز کی نشانی سمجھی جانے لگی، (ص ۱۴۸)

...... محمد کو زید کی بیوی میں دلکشی نظر آئی، انھوں نے زید کو ترغیب دی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدیں تاکہ وہ اس سے نکاح کرسکیں (ص ۱۵۵)

اسی مصنف نے قرآن کی آیات (مدینہ) (۱۱ : ۱۱۴) (۲ : ۲۳۹) نقل کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ نماز کے صرف تین مقررہ اوقات ہیں (ص ۱۵۹) اور یہ کہ

"اگرچہ قرآن نے متعدد جگہوں پر زکوٰۃ دینے کی ترغیب دی ہے لیکن یہ رقم کتنی ہو، کیا ہو، اور کس کو دی جائے، اس کی صراحت کہیں نہیں ملتی، (ص ۱۵۹)

ان نام نہاد مستشرقین کی تقریباً اکثر کتابوں میں اس قسم کی تحریفات، الزامات اور دروغ گوئیوں کے نمونے ملتے ہیں، مستشرقین کی ان الزام تراشیوں کے رد میں میرے علم میں کوئی قابلِ ذکر انفرادی یا اجتماعی کوشش نہیں کی گئی، معلوم نہیں کیوں اس کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی، میری یہ رائے ہے کہ اسی مقصد کے لئے کم از کم چند علماء اور محققین پر مشتمل ایک ادارہ قائم ہو، اور اس ادارہ سے ایک سہ ماہی مجلہ شائع کیا جائے، تاکہ مستشرقین کی یاوہ گوئیوں کا ازالہ ہوتا رہے،

مقالاتِ سلیمان جلد دوم

اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی و تحقیقی مضامین کے علاوہ، مستشرقین یورپ سیرت و تاریخ اسلام کے اعتراضات کے جواب میں بھی مضامین ہیں، مثلاً واقدی، اور سیرت میں مستشرقین کی ایک نئی غلطی، پیرو واقدی اور کتب خانہ اسکندریہ وغیرہ،

قیمت :- ۱۶٫۰۰

"تبصرہ"

مطبوعات جدیدہ

امداد المشتاق: مرتبہ مولانا اشرف علی تھانویؒ مع مقدمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، بڑی تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۱، قیمت مجلد ۲۵ روپیے، غیر مجلد ۲۰ روپیے، مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے پیر و مرشد اور مشہور امام طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حالات و ملفوظات کا ایک مجموعہ امداد المشتاق الی اشرف الاخلاق کے نام سے منشی مشتاق احمد پٹواری پیرانوی کی فرمایش پر لکھا تھا جو مرقومات امدادیہ کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۳۲۵ھ میں تھانہ بھون سے چھپا تھا، مگر اب یہ دونوں مجموعے نایاب تھے، اس لیے مکتبہ برہان نے انھیں دوبارہ شایع کیا ہے، چند ماہ قبل ان صفحات میں مرقومات امدادیہ کا ذکر ہوا تھا، اب امداد المشتاق کی فوٹو کاپی طبع شایع کی گئی ہے، گو اس کی ترتیب و تالیف قدیم انداز کے مطابق ہے، مگر اپنے اہم مندرجات کی بنا پر طالبین سلوک کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے، اس میں حاجی صاحبؒ کے حالات و باطنی کمالات کے علاوہ سلوک و تصوف کے گوناگوں دلچسپ نکتے اور مفید باتیں بھی درج ہیں، نیز یہ مجموعہ حضرت تھانویؒ کے قلم سے ہونے کی بنا پر مستند بھی ہے، مرقومات امدادیہ کی طرح اس مجموعہ پر بھی جناب نثار احمد فاروقی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، اس میں امداد المشتاق کی تالیف و ترتیب اور مآخذ کے علاوہ بعض مروجہ مسائل میلاد، نیاز، عرس، سماع اور تعظیم قبور وغیرہ کے بارے میں حضرت حاجی صاحبؒ کے توسع کا ذکر کیا ہے جس کے نامور خلفاء مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا تھانویؒ بھی قائل نہ تھے، [illegible] [illegible] نے

[illegible] تھانوی کے تعلق سے بعض کے متعلق ان کے اختلافات کی صراحت کر دی ہے، مقدمہ کے دوسرے حصوں میں حاجی صاحبؒ کے خاندان و طریقت کے شجرے، سلسلۂ طریقت کے بعض اہم بزرگوں اور نامور خلفاء کے حالات بھی درج ہیں، اور ان کے غیر مطبوعہ خطوط مع عکس، مختلف رہائش گاہوں اور مسجدوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ آخر میں مولوی نورالحسن راشد کے قلم سے ایک ضمیمہ ہے، اس میں حضرت حاجی صاحبؒ کے چار اساتذہ مولانا سید محمد قلندر محدثؒ، مولانا عبدالرزاق جھنجھانویؒ، مولانا ابوالحسن کاندھلوی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کا تذکرہ ہے، لائق مقدمہ نگار تصوف اور صوفیہ کے بڑے قدر دان اور تحریر و تصنیف کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں، اس کتاب پر ان کا مقدمہ نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہے، انھوں نے مقدمہ میں مذکور بعض ناموں کے حالات بھی حواشی میں لکھے ہیں، مگر بعض شخصوں کا تذکرہ رہ گیا ہے، ص ۹۰ تا ۹۳ پر حاجی صاحبؒ کے خادم خاص میاں عبدالرحیم کی ایک نادر تحریر درج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحبؒ کی وفات ۱۲ رجمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کو دن گذار کر ۲ بجے شب میں ہوئی گویا ۱۳ رجمادی الثانی جمعرات کو، مگر مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے مکتوب (ص ۹۴ تا ۹۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ انتقال ۱۳ رجمادی الثانی کو صبح کی اذان کے وقت ہوا، اس فرق پر فاروقی صاحب کی نظر نہیں گئی، اور انھوں نے اس کے متعلق کوئی صراحت بھی نہیں کی۔

تاریخ اطبائے بہار (جلد اول)، مرتبہ حکیم محمد اسرار الحق صاحب، متوسط تقطیع،
کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ روپے
پتہ: (۱) [illegible] پٹنہ (۲) حکیم محمد اسرار الحق [illegible] قطب الدین

[illegible] علم بدن کی جانب بھی ہمیشہ توجہ کیا [illegible] حکومت میں [illegible] کے بعد بھی ہندوستان [illegible] کی وجہ سے [illegible] ناپید ہوتے جا رہے ہیں [illegible]

روشنی ڈالنے میں اسلامی طب کی تاریخ میں [illegible] کا ذکر ہے [illegible] ہیں انھوں نے یہ کتاب لکھ کر ہندوستان کے طبیبوں کا نام محفوظ ہو جانے کا سامان کیا ہے اس میں گذشتہ صدی کے تقریباً ۱۳۰ طبیبوں کا تذکرہ ہے ان میں چند کے سوا سب ... یکے ہیں بعض اطبا کے حالات و کمالات کے علاوہ انکے مجربات نسخے بھی ہیں طبیبوں کی فہرست میں بعض ایسے ارباب کمال بھی شامل ہیں جو دوسری حیثیتوں سے زیادہ مشہور [illegible] شاہ ابوالحسن فرد قادری مجیبی، مولانا سید برکات احمد مونگیری ثم ٹونکی، مولانا ابوالبرکات عبد الرؤف دانا پوری صاحب مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی صاحب آثار السنن وغیرہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کا خاندان کئی پشتوں سے طب [illegible] اس کتاب میں انکے جد محترم حکیم سید محمد عرف میر محمدی، اور والد بزرگوار حکیم سید ابوالحسن مرحوم اور بڑے بھائی حکیم سید ابو [illegible] مرحوم کا اسی حیثیت سے تذکرہ ہے البتہ خود انہیں اور چند دوسرے اطبا کا ذکر رہ گیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ ہے اس کی مختصر تاریخی اہمیت اور اس سرزمین کے اطبا کی دلچسپی کا اجمالی بیان ہے اطبا کے سنین ولادت و وفات اور تحصیل علوم و فنون کے ذکر سے خالی نہیں ہے لیکن چند کے سوا تمام تذکرے بہت مختصر اور ناقص ہیں بعض سرسری نوعیت کے ہیں یہ مصنف کو مزید اطبا اور طبیبوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا چاہیے تھا کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں۔

القراءۃ العربیۃ الجزء الاول والثانی	مرتبہ مولانا عبد المجید اصلاحی تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، طباعت ٹائپ صفحات ۹۲، قیمت فی جزء پانچ روپے پتہ: مکتبہ [illegible] سرائے میر اعظم گڈھ

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے عربی کے مبتدیوں کو نحو و صرف کے قواعد سکھانے کے لیے اردو میں آسان اور سادہ طریقہ پر چند مختصر رسالے اسباق النحو حصہ اول و دوم لکھے تھے جو تجربہ کے بعد مفید ثابت ہوئے اسی طرح مولانا نے عربی کی زبان اور ادب سکھانے کے لیے [illegible] میں لکھی جو نامکمل رہ گئی اب مولانا عبد المجید اصلاحی نے اسباق النحو کے طرز پر صرف و نحو کے مسائل کی مشق کے لیے یہ کتاب [illegible] شائع کی ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس لیے یہ کتاب بہت مفید اور کارآمد ہے عربی کے مبتدی طلبہ کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔